Kulliyat-e-Ali Sardar Jafri-Vol. I (Poetry)

Edited by
Ali Ahmad Fatmi

© قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : جولائی، ستمبر 2004، شک 1926
پہلا اڈیشن : 1100
قیمت : -/164
سلسلہ مطبوعات : 1174

ISB No. : 81-7587-070-2

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ویسٹ بلاک-I، آر-کے-پورم
نئی دہلی-110066
طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی-110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اس کی کارگذاریوں کا دائرہ کئی علوم کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان کتابوں کی مکرّر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے۔ اس سے کماحقہ، واقفیت نئی نسلوں کے لیے بے حد ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت قدیم اور جدید عہد کی اردو کی تصنیفات شائع کرنے کی اس لیے بھی خواہاں ہے تاکہ اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے اور زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الوسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیات علی سردار جعفری اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کررہی ہے۔

اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

ترتیب

1	پرواز	31
2	نئی دنیا کو سلام	134
3	خون کی لکیر	279
4	امن کا ستارہ	439

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
1	مقدمہ از پروفیسر علی احمد فاطمی	13
	1۔ پرواز	**31-142**
1	مقدمہ از مجنوں گورکھپوری	35
2	لے اڑا ہوں چند نغمے زندگی کے ساز سے	45
3	جوانی	48
4	سماج	51
5	بغاوت	53
6	انگڑائی	55
7	مزدور لڑکیاں	56
8	سرمایہ دار لڑکیاں	58
9	اختلاف رائے	60
10	جمہوری اسپین کی طرف سے لڑنے والے ادیبوں کی موت پر	61
11	اشتراکی	61
12	لکھنؤ کی شام	62
13	انگارہ	63
14	حسن کی رنگیں ادائیں کارگر ہوتی گئیں	63
15	نیا زمانہ	64
16	معلوم نہیں عقل کی پرواز کی زد میں	65
17	تاریخ	66
18	آثار سحر	67

19	متاعِ ہنر	68
20	گہری بہت شکن ہے جبینِ حیات کی	69
21	ارتقاء اور انقلاب	70
22	انتظار نہ کر	71
23	جنگ اور انقلاب	72
24	سالِ نو	75
25	سامراجی لڑائی	77
26	عہدِ حاضر	78
27	جواہر لال نہرو کے نام	79
28	عورت کا احترام	80
29	کب تک	82
30	تخریب کے دیوتا	83
31	ٹوٹا ہوا ستارہ	84
32	فراموش کردند عشق	85
33	ایک خط کا جواب	86
34	لکھنؤ کے دوستوں کے نام	87
35	جیل میں ایک دوست کی موت کی خبر سن کر	88
36	ایک قیدی کی موت	90
37	زندگی	92
38	عذر و اعتراف	93
39	تغیر	94
40	ترقی پسند مصنفین	95
41	زمانہ ماقبل تاریخ کے انسان کا ذہنی تجزیہ	97
42	اکیلا ستارہ	100

43	خیر مقدم	101
44	سرِ راہ	102
45	فاشسٹ دشمن سپاہیوں کا گیت	103
46	تاجکستان کا ایک گیت	105
47	ایک نابینا ترکمان شاعر کی نظم	106
48	بنگال	107
49	لینن	110
50	غالب	111
51	اقبال	113
52	خوشی	116
53	حسنِ ناتمام	118
54	جھلک	119
55	عورت	120
56	محبت کا فسوں	121
57	ویران مناظر	122
58	تذبذب	124
59	غم کا ستارہ	126
60	تو اور میں	127
61	حسن سوگوار	129
62	انقلاب روس	131
63	تعمیر نو	133
64	آخری خط	135

2۔	نئی دنیا کو سلام	143-258
1	پیش لفظ	145
2	دیباچہ (جدید شاعری اور نئی دنیا کو سلام از جعفر علی خاں اثر)	146
3	نئی دنیا کو سلام	162
4	پیش لفظ جمہور	275
5	مثنوی جمہور	277
3۔	خون کی لکیر	287-442
1	تمہید	291
2	ایک جھلک	293
3	غم کا ستارہ	294
4	غزل	295
5	حسنِ سوگوار	296
6	تذبذب	298
7	حسنِ ناتمام	300
8	لکھنؤ کی ایک شام	302
9	خیر مقدم	303
10	اکیلا ستارہ	304
11	سرمایہ دار لڑکیاں	305
12	مزدور لڑکیاں	307
13	انتظار نہ کر	309
14	عہد حاضر	311
15	ایک سوال	312

16	نیا زمانہ	313
17	غزل	314
18	اختلاف رائے	315
19	ٹوٹا ہوا ستارہ	316
20	وہم و خیال	317
21	غالب	321
22	موت اور زندگی	323
23	نئی شاعری	326
24	بغاوت	328
25	جوانی	330
26	سماج	333
27	سالِ نو	335
28	آتشیں ستارہ	337
29	جنگ اور انقلاب	339
30	سامراجی لڑائی	341
31	ایک خط	342
32	موت	343
33	رہائی	346
34	انقلابِ روس	348
35	تاجکستان کا ایک گیت	350
36	تعمیرِ نو	351
37	لینن	353
38	آخری خط	354
39	جبر	361
40	عظمتِ انساں	363

41	شاعر	367
42	گوالیار	369
43	ملّاحوں کی بغاوت	371
44	گرد کارواں	374
45	خود پرستی	376
46	چلمنیں اٹھتی ہیں	377
47	قطعات	378
48	غزل	391
49	خواب	392
50	فریب	402
51	آنسوؤں کے چراغ	406
52	کشاکش	411
53	غزل	414
54	تلنگانہ	416
55	غزل	420
56	غزل	421
57	سیلابِ چین	423
58	جیل	433
59	جشنِ بغاوت	434
60	رومان سے انقلاب تک	436
4۔	**امن کا ستارہ**	**443-496**
1	پیش لفظ	447
2	سویت یونین اور جنگ باز	449
3	استالن کتھا	452
4	امن کا ستارہ	475

مقدمہ

بیسویں صدی کی عظیم الشان ادبی شخصیت علی سردار جعفری کے بارے میں یونہی کچھ لکھنا نہ کہ باقاعدہ ان کے کلیات کا مقدمہ لکھنا مجھ جیسے حقیر طالب علم کے لیے ہی نہیں بڑے بڑوں کے لیے بھی امتحان سے گزرنا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خالص روایتی شاعر نہ تھے بلکہ اپنے باغیانہ ودانشورانہ فکر وعمل کی وجہ سے ایک بڑے ادیب و ناقد، مفکر و دانشور بھی تھے۔افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، صحافی، ہدایت کار کے علاوہ اور بھی بہت کچھ۔ترقی پسند تحریک کے بانیان اور رہنمایان میں سے ایک تھے۔ادب۔تاریخ۔تہذیب۔ثقافت سیاست وغیرہ کے گہرے رمزشناس، فارسی وعالمی ادبیات کے عمدہ نباض۔رومی، حافظ، گوئٹے، مارکس، پابلونرودا، ناظم حکمت، نانک، کبیر، میرا، میر، غالب، اقبال سے لے کر فیض وفراق تک ان کے دائرۂ فکر میں سمٹے ہوئے۔ان کی تحریر وتقریر میں سمائے ہوئے۔جرأت گفتار ایسی کہ بڑے سے بڑے صاحبانِ علم وفضل کے چراغ گل ہو جائیں۔دلیل ایسی کہ پیشہ ور وکیل دستاویز پھاڑ دیں۔کبیر، نانک کا تصوف، سعدی حافظ کا تغزل، غالب کا تفکر، اقبال کا تخیل اور مظلوم انسانوں کے تشنجد نے سردار جعفری کو علم وعمل اضطراب واحتجاج کی صرف ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ ایک عہد، ایک تاریخ اور ایک علامت بنا دیا تھا۔ایسی ہمہ جہت وباکمال شخصیت، تاریخ ساز وعہد آفریں شاعر وادیب کا کلیات ترتیب دینا نیز اس کی شاعرانہ پرتوں اور دانشورانہ دبازتوں کا تلاش کرنا۔تبصرہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔بڑے بڑوں کے قلم میں کپکپی اور ذہن میں تھرتھری سی ہونے لگتی ہے۔ان کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی۔سردار جعفری کے انقلابی وآفاقی ذہن نے ابتدا سے ہی شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے شعری عوامل اور فکری محرکات ونظریات میں عالمی شاعری اور عالم کے حوادث کو ذہن میں رکھا۔نظریۂ شعر وادب ترتیب دیا، کچھ ایسے مفکرانہ اور بلند آہنگ شعری پیکر تراشے جس سے عام اردو والے زیادہ مانوس نہ تھے۔وہ اردو شعر وادب کو قدیم رومانی روایات وتناظرات میں دیکھنے اور بجھنے کے عادی تھے اس لیے رد وقبول، قرأت ومفاہمت کے درمیان کھانچے تو آنے ہی تھے۔کچھ یہ بھی ہوا کہ سردار جعفری کی دلنواز شخصیت وشاعری کا طلسم کچھ اس طرح سے گرویدہ کر لیتا تھا کہ ان کو پڑھنا، سمجھنا، سوچنا اور پھر اعتراض کرنا ہر قاری اپنا اختیار بھی سمجھنے لگتا۔کیونکہ ہزار تضادات وتصادمات کے باوجود شعور یا لاشعور کے حوالے سے اندر ہی اندر سردار سے ایک گہرا رشتہ بھی رکھتا تھا۔یہ ایک ایسا رشتہ ہوتا جہاں دس طرح کی کتابیں بیکار سی لگنے

لگتیں۔ سارے فکری رشتے بکھر سے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ موافقت یا مخالفت دونوں ہی صورتوں میں سردار اپنے عہد میں جس قدر مشہور و مقبول ہوئے اتنے ہی متنازعہ فیہہ۔ ویسے تو یہ عمل تقریباً ہر بڑے شاعر و دانشور کے ساتھ ہوا کرتا ہے لیکن سردار چونکہ ایک مخصوص نظریہ کے حامل تھے اور باقاعدہ ایک تحریک سے وابستہ تھے جس کی وجہ سے سردار کا نزاعی ہونا فطری تھا اور نہ ہوتا تو حیرت ہوتی۔ خود ترقی پسند ناقدوں و دانشوروں کے درمیان بھی ایسا ہوا۔ احتشام حسین جیسا بڑا ترقی پسند نقاد سردار کے تخلیقی سفر کو رومان سے انقلاب کی طرف لے جاتا ہے۔ لکھتا ہے۔

> ''جعفری کی ابتدائی شاعری میں انقلابی قسم کی رومانیت ہے لیکن یہ مریض بے مقصد اور بے اثر رومانیت سے کس قدر مختلف ہے۔ ان کا شعور رومان سے انقلاب تک کی منزل طے کرنے میں کسی وقت بھی روحِ عصر سے الگ نہیں ہوا اور بے مقصد رومان پرستی کا شکار نہیں ہوا۔''
>
> (سردار جعفری رومان سے انقلاب تک)

لیکن اسی عہد کے ایک بڑے ناقد مجنوں گورکھپوری سردار جعفری کی شاعری کی ابتدا انقلاب سے قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ انقلاب سے رومان کی طرف آئے تھے۔ بظاہران متضاد رویوں کی تفہیم کے لیے ہمیں تھوڑی دیر کے لیے سردار کے بچپن کے حالات اور 'پرواز' کے خیالات تک پہنچنا ضروری ہے۔

29 نومبر 1913 قصبہ بلرام پور یو. پی. کے زمیندار گھرانے میں پیدا علی سردار جعفری کو آنکھ کھولتے ہی وہ سب کچھ دکھائی دیا جو عموماً اس عہد میں ایسے گھرانوں میں ہوا کرتا تھا۔ تمام کرّ وفر، شان وشوکت، جاہ و جلال تقریباً ایک سے لیکن شیعہ گھرانے کی وجہ سے علم و تہذیب کے حوالے سے تھوڑے تھوڑے الگ سے بھی۔ بقول سردار جعفری۔

> ''خاندان میں بڑا اطمینان تھا۔ بلرام پور سے باہر کی دنیا ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہیں بچے پیدا ہوتے تھے جوان ہوتے تھے۔ بلرام پور کے بعد علی گڈھ کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر شادی ہو جاتی تھی اور ریاست میں ملازمت مل جاتی تھی۔ دن ہنسی خوشی گزر جاتا تھا اور رات کو سب بھائی بہن بستروں پر لیٹ جاتے تھے کوئی ایک بہن شرلک ہومز کی کہانیاں۔ راشدالخیری کے ناول یا عظیم بیگ چغتائی کی کوئی کتاب پڑھ کر سناتی۔ اس سے

تھک جانے کے بعد جناتوں کے قصے شروع ہوتے جو انتہائی دلچسپ ہونے کے بعد بھی دل میں دہشت پیدا کر دیتے تھے۔"

(لکھنؤ کی پانچ راتیں)

گھر میں محرم ومجلس کا ماحول۔ انیس کے مرثیوں کے چرچے بقول جعفری کلمہ اور تکبیر کے بعد میرے کانوں نے پہلی آواز انیس کی سنی اور کم عمری میں ہی مرثیے کہے۔ پندرہ سال کی عمر میں پہلا مرثیہ کہا۔

آتا ہے کون شمعِ امامت لیے ہوئے
اپنی جلو میں فوجِ صداقت لیے ہوئے

ظاہر ہے کہ امامت اور صداقت کے معنی سمجھے بغیر یہ شعر نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہیں سے حضرت امام حسین کے دلیرانہ وحق پرستانہ کردار نے جگہ بنائی اور یہ احساس جاگا کہ حق اور صداقت کے لیے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ نیز یہ کہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جن کا تعلق زمین سے ہے۔ انیس کے بعد اقبال کا مطالعہ۔ زندگی کا راز کیا ہے سلطنت کیا چیز ہے؟ جیسے سوالوں سے روشناسی اور حرف انقلاب سے آشنائی اور وہ ہاتھ کی محنت اور قلم کی عظمت سے واقف ہوئے۔ بچپن میں لکھی ہوئی تختی کا راز کھلنے لگا۔

قلم گوید کہ من شاہِ جہانم   قلم کش را بدولت می رسانم

بچپن کی انہیں کیفیات کا نقشہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے یوں کھینچا ہے۔

"وہ ماحول جس میں حق پرستی کی تعلیم دی گئی تھی۔ جس میں سرفروشی کی اہمیت سمجھائی گئی۔ جہاں علم کو ہر دولت پر فوقیت دی گئی جہاں مظلوموں کی حمایت نے بغاوت کا احساس اور انقلاب کا نعرہ عطا کیا۔ سردار جعفری کی جڑیں اسی سرسبز و نم مٹی میں پیوست ہیں اور سر آسمان کی طرف مگر ان کے پاؤں اپنی زمین سے کبھی الگ نہیں ہوئے۔"

(سردار جعفری کا شعری سفر)

اسی ذہنی کیفیت میں محض سترہ اٹھارہ سال (1930) کی عمر میں وہ بلرام پور کے محدود و مخصوص ماحول سے نکل کر لکھنؤ پہنچے۔ ملازمت کا امتحان دیا پاس بھی ہوئے لیکن بعض وجوہات کی بنا پر جوائن نہ کر سکے۔ پھر 1933 میں علی گڈھ پہنچے۔ ان برسوں میں جتنا جو کچھ بھی ملک میں ہو رہا تھا اتنا ہی

علی گڈھ میں بھی ہو رہا تھا۔ علی گڈھ علم و دانش کا مرکز تو تھا ہی سیاست اور بغاوت کا بھی مرکز بنا ہوا تھا۔ حسرت موہانی کی بغاوت سے لے کر رومانیت اور اشتراکیت سبھی کچھ چھایا ہوا تھا۔ نوجوان ذہن کو نسبتاً کھلی ہوئی جگہ ہی نہیں کھلے ہوئے ذہن بھی ملے۔ آزاد و بے باک، ذی علم اور ذی شعور۔ علم کے دریچے اور لائبریری کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ سردار کے حصولِ علم سے بے چین ذہن کو ایک راہ ملی تو انھوں نے پہلے گاندھی و نہرو کی آپ بیتیاں پڑھیں اس کے بعد گوئٹے کا 'ورتھر' اور لینن کی سوانح عمری اور پھر لفظ بوژوا کے معنی کی تلاش۔ اور پھر یہ تلاش، تلاشِ حیات۔ نظریۂ حیات سے لے کر مقصدِ حیات تک پھیل گئی۔ بقول جعفری 'جو دروازے گاندھی کی کتاب پڑھ کر نہرو کی تقریریں کر ذرا ذرا کھلے تھے اور پھر بند ہو گئے تھے اس بار پورے کھل گئے۔' یورپ کا فاشزم اور ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا احساس عرفان میں بدلنے لگا۔ مجاز، رشید جہاں، سجاد ظہیر، سبط حسن، وغیرہ سے دوستی فکر و نظر میں ڈھلنے لگی اور جب ایک مشاعرہ میں جس میں سردار بھی شریک تھے۔ مجاز نے اپنی نظم 'انقلاب' سنائی اسی مشاعرہ میں سردار جعفری نے نظم 'سماج' پڑھی۔

تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو
زمانہ کس قدر بیتاب ہے کروٹ بدلنے کو

بس اب سردار جعفری کو صحیح راہ مل چکی تھی۔ وہ ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہو چکے تھے اور باقاعدہ ایک تحریک میں شامل ہو چکے تھے۔ صوفیانہ و شہیدانہ تہذیب مارکسیت اور اشتراکیت کی تعلیم و تصور میں ڈھلنے لگی اور 1941 تک پہنچتے پہنچتے بقول پروفیسر عابدی 'سردار جعفری کی انقلاب آفریں شخصیت کا آبگینۂ فکر تندیٔ صہبا سے پگھلنے سا لگا وہ اپنے بیان کے لیے کچھ اور وسعت چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ 1943 میں ان کا پہلا شعری مجموعہ پرواز منظرِ عام پر آیا۔'

سچ یہ ہے کہ سردار کا پہلا شعری مجموعہ 'پرواز' 1944 میں شائع ہوا جو اس عہد کی ایک انقلاب آفریں شخصیت پی.سی. جوشی کے نام معنون ہے اور پہلے صفحہ پر یہ شعر درج ہے۔

کھل گیا در پڑ گیا دیوارِ زنداں میں شگاف
اب قفس میں جنبشِ صد بال و پر ہونے کو ہے

پورا مجموعہ اس شعر کی تفصیل و تفسیر ہے۔

اس مجموعہ میں شامل نظموں کے عنوان ملاحظہ کیجئے۔ سماج، بغاوت، انگڑائی، مزدور لڑکیاں، اشتراکی، نیاز مانہ، تاریخ، آثارِ سحر، ارتقاء وانقلاب، جنگ اور انقلاب وغیرہ ایسا نہیں ہے کہ اس میں رومانی رنگ کی نظمیں نہیں ہیں۔ 'جوانی' ان کی ابتدائی نظموں میں سے ایک ہے لیکن اس میں بھی رنگِ شباب کم رنگِ جہاد زیادہ ہے مثلاً۔

زمانے کا ستم ہر دم رہا ہے رازداں میرا
بھرا ہے ایسے ہی کانٹوں سے سارا گلستاں میرا
زمانے بھر میں تنہا رازداں ہوں لذتِ غم کا
سراپا درد ہو کر بھی ہوں درماں سارے عالم کا
حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مذہب میرا مسلک نوجوانی ہے

سماج، بغاوت، مزدور لڑکیاں، عورت ان کی ابتدائی نظموں میں شمار کی جاتی ہیں جس میں سردار کا شعری مسلک صاف جھلکتا نظر آتا ہے اور یہ بھی کہ جوانی کی اس اسٹیج پر سردار جعفری ملک و معاشرہ، عام انسانوں کے دکھ درد سے کس قدر گہری واقفیت اور وابستگی رکھتے تھے۔ عورتوں کے حوالے سے ان کا دردمندانہ اظہار ایک نسائی آواز بن کر ابھرتا ہے۔ عورتوں کے ذریعہ دنیا کے نظام کو بدلنے کا تصور پہلی بار سردار کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ ان کی شاعری اور فکر و نظر کی انفرادیت ہے۔

اس مجموعہ میں 46ء سے قبل کی شاعری ہے۔ ظاہر ہے یہ دور صرف سردار جعفری کی جوانی کا ہے بلکہ تحریک آزادی کی پختگی اور خاتمہ کا ہے لہٰذا ایسے دور میں فطری طور پر ان کی شاعری میں آزادی، انقلاب اور غلامی سے نجات کا ولولہ اور دور دورہ ہے لیکن یہ محض نعرہ بازی اور کھوکھلی خطابت نہیں بلکہ اس میں بدلے ہوئے دور، مزاج اور فکر کی بھی نمائندگی ہوتی ہے۔ نئے سماج کی تلاش، نئے خواب دیکھنے کی خواہش پھر اس کی تعبیر کی تلاش وغیرہ۔ ایسا صرف قومی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی ہو رہا تھا۔ اس لیے اس میں عالمیت کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ اور یہ رنگ صرف وقتی آزادی کا نہیں بلکہ نئے سماج کے نئے تصورات کا رنگ ہے جو بہر حال قدیم رنگ سے مختلف ہے۔ قبول کرنا ہماری ضرورت تھی اور مجبوری بھی۔ مجنوں گورکھپوری نے اچھی بات کہی ہے۔

> "تلوں کی شاعری انسان کی نفسیات اور درندگی کو جس قدر مہذب کر سکتی تھی کر چکی۔ اب خالص جذبات و تخیل اور رومانیت اور ماورائیت کا فن

انسان کے انسانی وقار اور ہماری متبرک زمین کی ارضی پاکیزگی اور طہارت قائم رکھنے یا اس کو بڑھانے میں زیادہ ہمارے کام نہیں آسکتی۔"

(مقدمہ۔ پرواز)

اچھی بات یہ ہے کہ بزرگ نقاد نے جو باتیں دیر میں سوچیں نوجوان شاعر نے کم عمری میں سوچ لیں۔ حالانکہ ان باتوں کو ایک شاعر کی حیثیت سے سردار سے قبل جوش، مجاز، مخدوم، فیض وغیرہ سوچ چکے تھے اور پرواز سے قبل آہنگ، نقش فریادی جیسے مجموعے دھوم مچا چکے تھے اور یہ بھی سچ ہے کہ ان کے مقابلہ میں پرواز کو وہ شہرت بھی نہ مل سکی تھی۔ اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ مجموعے اپنی تمام تر ترقی پسندی اور روشن خیالی کے باوجود روایتی رومانی اسلوب کی مجبوری میں گرفتار تھے اس لیے ہر حلقہ میں پسند کئے گئے۔ دوسرے یہ کہ پرواز کی شاعری ان دونوں مجموعوں سے ہی نہیں بلکہ پوری اردو شاعری سے مختلف، آزاد اور مائل بہ پرواز تھی۔ جسے اردو کا روایتی رومان پسند حسن پرست قاری آزادی سے قبول نہیں کرسکتا تھا۔ مجنوں نے اچھا نکتہ اٹھایا ہے کہ ادب کے مختلف اصناف میں شاعری بڑی کٹر صنف ہے اور وہ بہت مشکل سے روایتی اصول اور اسالیب کو چھوڑ کر انقلاب اور ترقی کے نئے تصورات قبول کرتی ہے۔

یہی وہ دور ہے جب سردار ہمہ وقت مطالعہ میں مصروف تھے اور یہ مطالعہ صرف اردو شاعری تک محدود نہ تھا بلکہ اس کی زد میں حیات و کائنات تھے۔ ذہن میں گونجتا ہوا تاریخ کا شعور، تہذیب کی پہچان، مسائل کا مارکسی عرفان، جدلیاتی طوفان اور آزادی و غلامی کا تصور زمان و مکان۔ آہنگ اور نقش فریادی کے مقابلے پرواز کی عدم مقبولیت نے بھی انھیں بے چین کردیا کہ وہ ایک ایسا قدم اور قلم اٹھائیں جو اس عہد کے قارئین و ناقدین کے قلب و جگر، ذہن و دل کو گرما کر ہی نہیں ہلا کر رکھ دے۔ دوسرا مجموعہ 'نئی دنیا کو سلام' ان کا ایسا ہی ایک انقلابی قدم تھا جو 1948 میں شائع ہوا۔

فکری و ہیئتی اعتبار سے سردار کی طویل نظم نئی دنیا کو سلام ایک زبردست تجربہ اور حادثہ کے طور پر سامنے آئی۔ وہ تاریخ سماج اور سیاست جو ٹکڑوں ٹکڑوں میں مختلف نظموں میں بکھرے ہوئے تھے ایک تاریخی، سماجی اور احتجاجی تسلسل اور تواتر کے ساتھ تفکیر و تخلیق کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں جس میں ماضی، حال اور مستقبل سبھی کچھ سمٹ آتے ہیں ابھی تک پرواز میں جو پیکار حیات تھی وہ آثار حیات بلکہ اسرار حیات میں بدلنے لگتی ہے۔ اس نظم کی سب سے بڑی خوبی زندگی و آزادی وغیرہ سے متعلق سردار کا کھلا ڈلا نظریہ۔ زندگی کی مختلف جہتیں انسان کی عظمت، فطرت کی کارگذاریاں غرضکہ زندگی کے مختلف رنگ، پڑاؤ، بہاؤ اور نشاطیہ رجائی مزاج کو سردار نے کچھ اتنے دلکش و موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ

جمالیات کا نہایت لطیف تابناک حرارت انگیز تصور قلب وجگر میں مچلنے لگتا ہے۔ ایسے حصے کی شاعری کو انھوں نے اقبال کے اس شعر سے منسوب کر دیا ہے۔

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے　　　اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

اب اس شعر کی تفسیر ان اشعار میں دیکھیے۔

یوں ہی اڑ رہا ہے نشاں زندگی کا　　　ٹھٹکتا نہیں کارواں زندگی کا

تسلسل حقیقت تسلسل فسانہ　　　تسلسل ہی ہے زندگی کا ترانہ

حیاتِ بشر ہے بڑی شاعرانہ　　　محبت ہے جس کی بقا کا فسانہ

اس طویل نظم کا سب سے خوبصورت حصہ محبت ہے جو مریم کی شکل میں مختلف روپ دکھائی دیتی ہے۔ مریم صرف ایک بیوی، محبوبہ نہیں ہے بلکہ ماں بھی ہے اور اس سے زیادہ ایک باغی عورت بھی ہے جسے سردار اس روپ میں بھی دیکھتے ہیں۔

تبسم نہیں صرف تلوار بھی ہے　　　وہ نغمہ نہیں صرف جھنکار بھی ہے

وہ شمعِ شبستاں ہے نورِ سحر ہے　　　وہ ہر گام پر مرد کی ہمسفر ہے

سردار سے قبل عورت کی روایتی امیج جوش اور اختر شیرانی نے بدلی ضرور تھی لیکن مجاز نے جب آنچل کو پرچم بنانے کی بات کہی تو پوری ترقی پسند شاعری میں عورت کا کردار ہی بدل گیا۔ فیض کی محبوبہ ہو یا کیفی کی عورت۔ مجروح وساحر کی ہم سفر بھی نے باغیانہ ہم سفری، ہم نظری کے مناظر پیش کیے لیکن سردار کی مریم صرف جاوید کی بیوی یا ہندوستان کی عورت نہیں بلکہ پوری دنیا کی بہادر عورتوں کی علامت بن جاتی ہے۔ سردار کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ہے انسان کی کائنات اس کے دم سے　　　فروزاں ہے شمعِ حیات اس کے دم سے

اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ　　　وہ آغوشِ تہذیب کا گاہوارہ

بقول پروفیسر سید محمد عقیل ۔ "عورت کی یہ تصویر ہندوستانی بھی ہے اور مدتوں تہذیب کی ہوئی زندگی سے بھی آئی ہے۔ جس میں سامی، ایرانی، ترک تہذیبوں کی رنگ آمیزی ہے اس تصویر میں عورت پیر کی جوتی سے اوپر اٹھ کر حرم سرا کے رنگین شبستانوں سے گھومتی ہوئی اپنے محدود احترام یافتہ تجربوں سے باہر نکلتی ہے اور مارکسی تصور کے ساتھ آ کر مرد کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو جاتی ہے۔"

(نئی دنیا کو سلام　　ایک تجزیہ)

'ترقی پسند ادب' میں خود سردار لکھتے ہیں ۔

"اور اب یہ نئی عورت ہمارے ادب میں قدم رکھ رہی ہے۔.......
جب تک عورت کو معاشی آزادی نہیں ملے گی اور وہ وسیع سماجی آزادی میں اپنا
حصہ حاصل نہیں کرے گی تب تک عشق اور حسن دونوں بیمار رہیں گے ۔ اب
عورت کے تصور میں گہرائی پیدا ہو رہی ہے جو بہترین قسم کی حقیقت نگاری ہے۔"

(ترقی پسند ادب صفحہ 241)

عورت کے بارے میں سردار کے اس روشن اور ارتقائی نظریہ کی وجہ سے 'پرواز' کی 'مزدور لڑکیاں'، 'نئی دنیا کو سلام' تک پہنچتے پہنچتے ایک ذہین باغی عورت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ 'مزدور لڑکیاں' میں سردار خود بولتے ہیں 'نئی دنیا کو سلام' میں عورت خود بولنے لگتی ہے۔

غرضکہ اس طویل تمثیلی نظم میں عورت، محبت، حرارت، حریت، تاریخیت، وطنیت، رومانیت اور زندگی کا استقلال و استقبال سبھی کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ نیز یہ کہ چکبست و اقبال کے دائرہ سے نکل کر وطنیہ شاعری ایک نئے تیور، رنگ و آہنگ کے ساتھ نئے جمالیاتی شعور میں رچی بسی نظر آنے لگتی ہے۔ آزاد نظم کے سانچے میں ڈھلی یہ طویل نظم پیکر تراشی اور تجسیم کاری کے اعلیٰ و ارفع نمونے پیش کرتی ہے۔ اس مجموعے میں جمہور نام کی مثنوی بھی ہے جو 46ء میں ہندوستان کے سیاسی حالات پر طنزیہ انداز میں کہی گئی ہے۔ جو ایک طرح سے پہلی سیاسی مثنوی کہی جا سکتی ہے۔ ان دونوں انوکھی نظموں کو ملا کر پیش کئے گئے مجموعہ میں بزرگ ادیب و ناقد جعفر علی خاں اثر کا مقدمہ بھی ہے۔ جو اکثر ترقی پسند فکر کے خلاف ہی رہے ہیں لیکن بڑی فراخ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ یہ لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

"سردار کی طویل تمثیل اور مثنوی جمہور جو اسی کا حصہ ہے پڑھ کر باغ
باغ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میرا یہ خیال راسخ ہو گیا کہ شاعری جدید طرز کی ہو یا قدیم
طرز کی اول فن ہے اور ثانیاً کچھ اور ہے۔ موضوع کی افادی یا جمالیاتی پہلو سے قطع
نظر اگر انداز بیان میں تازگی اور شگفتگی، ندرت اور فن کارانہ انفرادیت یعنی خود شاعر
کے انفعالی اثرات کا پرتو نہ ہو تو شاعری گھٹیا قسم کی نقالی بن کر رہ جاتی ہے۔ لائق
مصنف نے یہ گر سمجھ لیا ہے اور اپنی نظم میں واقعات کے بجائے واقعات سے پیدا
ہونے والے جذبات، تاثرات اور احساسات پیش کئے ہیں۔"

(مقدمہ)

'نئی دنیا کو سلام' کی بے پناہ مقبولیت نے 'پرواز' کے شاعر کو بلندی عطا کی۔ محض دو سال کی مدت میں ان کا تیسرا مجموعہ 'خون کی لکیر' (1949) منظر عام پر آ گیا۔ ہر چند کہ اس مجموعہ میں کچھ نظمیں پرواز کی ہیں تاہم اس کی نئی نظمیں الگ مزاج کی ہیں جو چونکاتی ہیں۔ آزادی کے فوراً بعد کی شاعری میں ایک نئے سردار کی جھلک نظر آتی ہے۔ مجموعہ کی ابتدائی نظمیں مثلاً سوگوار، حسنِ ناتمام، تذبذب، اکیلا ستارہ، وغیرہ میں ایک عجیب سی اداسی، سوگواری اور ناتمامی کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ نظمیں بظاہر رومانی رنگ کی ہیں اور ان کی اداسی بھی ان کے رومان کا حصہ ہے ان کی زیریں لہروں میں آزادی کا نامکمل پن اور سماج کا ادھورا پن تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کچھ نظموں میں ایک نیا آہنگ ملتا ہے مثلاً عظمتِ انساں، شاعر وغیرہ ان میں نئی زندگی کی بشارت ملتی ہے۔ تاریخ انسانی اور عظمت انسانی کے سراغ بھی ملتے ہیں جس کو شاعر نے بڑے دلنواز انداز میں پیش کیا ہے۔ ان نظموں میں اوپری جوش کم، باطنی گہرائی و گیرائی زیادہ ملتی ہے۔ اس کا کینوس بھی زیادہ پھیلا ہوا ہے اور ایک سوال بھی ؎

چین کا خونی افق بھی بن گیا ہے لالہ زار
کیوں نہیں ہے ہند کے اجڑے گلستاں میں بہار
سازشیں کرتے ہیں گل چیں سر سے سر جوڑے ہوئے
باغباں بیٹھے ہیں ایک مدت سے منہ موڑے ہوئے

اس طرح نظم 'شاعر' کا یہ فکری آہنگ بھی دیکھئے ؎

میں ہوں صدیوں کا تفکر میں ہوں قرنوں کا خیال
میں ہوں ہم آغوش ازل سے میں ابد سے درکنار
میرے نغمے قید ماہ و سال سے آزاد ہیں
میرے ہاتھوں میں لافانی تمنا کا ستار

اس پوری نظم میں صرف شاعر کا رول یا ذمہ داری ہی نہیں جھلکتی بلکہ سردار کا شعری نقطۂ نظر اور شاعر کی وسعت اور کیفیت بھی جھلک اٹھتی ہے۔ نظم 'خواب' میں صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اب سردار آ کا ذہن اور وژن اپنے ملک کی آزادی و غلامی اور لمحاتی قومی جذباتیت کے دائرے سے نکل کر کائنات کی سرحدوں کو چھونے لگتا ہے۔ وسعتِ مطالعہ اور بلندیٔ فکر انھیں دنیا کی تاریخ و تہذیب کی طرف لے جاتی ہے۔ بہت جلد ان کی نظموں میں وسط ایشیا، سمرقند، بخارا، یونان، مصر وغیرہ غرض کہ مشرق و مغرب مدغم ہو کر عالم انسانیت ایک وحدت اختیار کر کے سردار کا مخصوص فکری و اسلوبیاتی آہنگ بن جاتا ہے۔ نظم یوں

شروع ہوتی ہے۔

میں کہ صدیوں کی سرگوشیاں سن چکا ہوں
کتنے سربستہ رازوں کو سینے اندر چھپائے ہوئے ہوں

اس کے بعد وہ دیو پری سے شروع ہو کر بابل و نینوا، ساحلِ نیل، یونان، سمرقند، بسٹیل اور ماسکو کی تاریخ و تہذیب پر اشارے کرتے ہوئے واپس ہندوستان آتے ہیں۔ اس سے ان کی سوچ اور اپروچ کا مطالعہ کائنات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور پرواز والا شاعر ایک مفکر، دانشور میں تبدیل ہوتا نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح ان کی نظم 'فریب' بھی ایک عمدہ نظم ہے۔ جو فیض کی 'صبح آزادی' کی یاد دلاتی ہے۔ فیض کی نظم بیحد مختصر اور موثر ہے لیکن سردار کے یہاں پھیلاؤ ہے اگر چہ یہ پھیلاؤ ان کی تاریخی بصیرت، انسانی و سماجی شعور کا پتہ دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی اچھے ٹکڑے پھیلاؤ میں بکھر سے جاتے ہیں۔ اس طرح 'کشاکش' 'آنسوؤں کے چراغ' 'تلنگانہ' وغیرہ میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے لیکن یہ بھی کہ ان کی تمام نظموں میں سردار کی ادراک و آگہی وسعتِ قلبی اور فکر کی گہرائی کے ایسے نادر نمونے اور جلوے نظر آتے ہیں جو سردار کو نہ صرف بیحد مختلف بلکہ آگے بہت آگے لے جاتے ہیں۔

اس مجموعہ میں غزلیں بھی ہیں لیکن ان میں گہرا سیاسی و سماجی شعور بسا ہوا ہے جو خالص ترقی پسند ذہن و فکر کی دین ہے۔

سکوں میسر جو ہو تو کیوں کر ہجوم رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگر چہ قاتل نظامِ دار ورسن وہی ہے
ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نغمۂ قیصری چھپا ہے
نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے نوائے سازِ کہن وہی ہے

حقیر ہو کر نہ رہ سکے گی تری بلندی سے میری پستی
میں اپنے سجدے سے کیوں بساؤں تری رعونت کا آشیانہ
خلیق بھی ہے شفیق بھی ہے کسی کو کوئی گلہ نہ ہوتا
بس اک شکایت یہ ہے کہ پیرِ مغاں کی فطرت ہے تاجرانہ

یہ وہ دور تھا جب سردار جعفری علم و عمل، فکر و نظر، حرکت و حرارت کے اعتبار سے بلندی پر تھے۔ ملک کے حالات اور شاعر کے افکار و خیالات دونوں مدغم ہو کر نئے نئے تخلیقی پیکر میں ڈھل رہے تھے

اور مقبول خاص و عام ہو رہے تھے۔ ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی۔ مجاز، فیض، مخدوم وغیرہ کے شانہ بشانہ بلکہ بعض معاملات میں ان سے بھی آگے بڑھ کر سردار اپنی ایک الگ فکری واسلوبیاتی راہ تلاش کر رہے تھے اور اپنے مخصوص علم ودانش کی وجہ سے انھیں وہ راہ مل بھی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال یا دوسرے سال کوئی نہ کوئی مجموعہ منظر عام پر آنے لگا۔ نثر میں بھی کتابیں آنے لگیں۔ اگلے دو برسوں میں دو شعری مجموعے 'امن کا ستارہ' (1950) اور 'ایشیا جاگ اٹھا' (1951) شائع ہو کر منظرِ عام پر آئے جو نہ صرف سردار جعفری بلکہ پوری ترقی پسند شاعری کا ایک الگ فکری آہنگ اور سماجی وتہذیبی شعور کا پتہ دیتے تھے۔ یہ دونوں مجموعے مختصر سے ہیں لیکن ان میں عالم انسانیت کی دبیز اور دردمند تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ یہ نظمیں جیل میں رہ کر کہی گئی ہیں جن میں طرح طرح کے تجربے بھی کئے گئے ہیں۔ ایک طرف دیہاتی بولی کے ساتھ ہندی اردو کی ادبی زبان ملائی گئی ہے تو دوسری طرف عوامی لفظ کے استعمال کرنے کی جسارت بھی ملتی ہے۔ جس کے لیے سردار صاف کہتے ہیں۔

> ''زبان میرے نزدیک مقصد بالذات نہیں ہے وہ ایک سماجی وصیلہ ہے جس کے ذریعہ سے ایک انسان کے خیالات اور جذبات دوسرے انسان تک پہنچتے ہیں اور اس لیے وہ خیالات وجذبات اور سماجی ضروریات کی پابند ہے۔ میری شاعری خواص کے لیے نہیں ہے بلکہ عوام کے لیے ہے۔''
>
> (پیش لفظ امن کا ستارہ)

اس لیے اس نظم کی زبان بالکل عوامی ہے جابجا عوامی بول چال کے الفاظ ملتے ہیں جو ایک نئے سردار جعفری کو پیش کرتے ہیں۔ ایک بند دیکھئے۔

بھوکے رہتے دھوبی موچی بنجارے اور لکڑہارے
دھن کی ناگن روٹی پانی پر بیٹھی تھی کنڈلی مارے
رین دنا محنت کرتے تھے سانجھ سکارے روتے تھے
اندھوں آگے روتے تھے اپنی بھی آنکھیں کھوتے تھے

ان نظموں میں صرف یہی لہجہ نہیں ہے بلکہ رومان کی آمیزش ہے لیکن یہ رومان روایتی اور دھندلا نہیں ہے بلکہ بقول سردار جعفری 'یہ رومانیت تاریک اندیش نہیں بلکہ روشن نظر ہے۔' ان طویل نظموں میں حقیقت اور رومان بلکہ یوں کہا جائے کہ اشتراکیت اور رومان باہم شیر وشکر ہو کر ایک نئی رومانی حقیقت یا اشتراکی حقیقت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں جس سے ایک نئے ڈکشن کا آغاز ہوتا ہے۔ کرشن

چندر نے 'ایشیا جاگ اٹھا' کے بارے میں اچھی بات لکھی ہے۔

''نظم ایشیا جاگ اٹھا جو بیک وقت رزمیہ بھی ہے اور غنائیہ بھی جس میں ایپک کی مثالیت اور غنائی سندرتا ہے۔ اس نظم میں ایشیا کا سارا اجل روپ سمٹ کر سما گیا ہے اس نظم میں چار ہزار سالہ تہذیب کی تصویر ہے، یہاں کی غریبی چیتھڑے پہنے دکھائی دے رہی ہے، اس کے عوام کی بغاوت کا بے پناہ جذبہ قومی اور ملی احساسات کو سموتا ہوا ایک طوفانی سمندر میں تبدیل ہو گیا ہے، میرا خیال ہے کہ اس نظم سے ہماری اردو کی ترقی پسند شاعری اپنے سنِ بلوغ کو پہنچتی ہے، جوان ہوتی ہے اور خود سردار کی شاعری افادیت اور وجدان کی ان سربلندیوں کو چھو لیتی ہے جہاں سے عظمت کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔''

'ایشیا جاگ اٹھا' جس پائے کی نظم ہے اس کا سرسری مطالعہ ایک عجب رومانی اور وجدانی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پوری انسانی تاریخ وتہذیب ذہن میں گونجنے لگتی ہے اور محنت وآدمیت کا سرور آنکھوں میں رقص کرنے لگتا ہے۔ 'نئی دنیا کو سلام' کے بعد ان طویل نظموں نے ایک عرصہ کے بعد اردو میں طویل نظموں کی روایت کو نئے انداز سے زندہ کیا اور آزاد نظم کے پیرایۂ اظہار کو ایک مخصوص معنویت وکیفیت عطا کی۔ غالباً پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ آزاد نظم خارجی حالات اور ماحول کی تصویر کشی کے لیے استعمال کی گئی ہو۔ پروفیسر محمد حسن نے اچھی بات لکھی ہے۔

''سردار جعفری کی شاعری نے آزاد نظم کو داخلیت سے نکال کر عصری مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مایوسی اور محرومی کے بادل چھٹے، بنجر زمین (Waste land) کی فضا سے نکل کر آزاد نظم کو زیادہ مثبت موضوعات کا سہارا ملا۔ سردار جعفری کی نظم راشد اور میرا جی کی روایت سے مختلف ہے اور انھیں اس بات کا احساس ہے کہ اس صنف کو ان دونوں شعراء سے مختلف جذبات کا آئینہ بنایا جا سکتا ہے۔''

(جدید اردو ادب صفحہ 148)۔

دو سال کے بعد 1953 میں سردار کا چھٹا شعری مجموعہ 'پتھر کی دیوار' منظر عام پر آیا جسے کسی بھی طرح ان کے شعری تخلیقی سفر کے تسلسل وتواتر سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ البتہ دو پہلوؤں سے اس کی انفرادیت یوں جھلکتی ہے کہ اس مجموعہ کی تخلیقات جیل کی کوٹھری میں خلق ہوئیں اور یہ بھی کہ یہ ان معنوں

میں پہلا مجموعہ ہے جس کی ابتدا میں حرف اوّل کے عنوان سے پہلی بار سردار جعفری نے اپنے اوپر ہونے والے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ جس کے ذریعہ شاعری، ترقی پسند شاعری کے حوالے سے ان کے افکار و نظریات واضح طور پر سامنے آئے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے چند خیالات یہاں پیش کر دیے جائیں۔

''پتھر کی دیوار' میری جیل کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں اب میں نے بعد کی کہی ہوئی کچھ اور نظمیں بھی شامل کر لی ہیں......میری شاعری وقتی ہے۔ مجھے یہ بات تسلیم کر لینے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہے۔ ہر شاعر کی شاعری وقتی ہوتی ہے۔ اگر ہم اگلے وقتوں کا راگ الاپیں گے تو بے سُرے ہو جائیں گے آنے والے زمانے کا راگ جو بھی ہوگا وہ آنے والی نسلیں گائیں گی۔ ہم تو آج ہی کا راگ چھیڑ سکتے ہیں۔

ہر شاعر اپنے فن کے دامن میں روح عصر کو سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے کوئی کم اور کوئی زیادہ لیکن کسی نہ کسی حد تک ہر شاعر روح عصر کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے جو اپنی اس کوشش میں جتنا کامیاب ہوتا ہے وہ اتنا ہی اچھا شاعر ہوتا ہے۔ آج کی حقیقت کی کوکھ سے کل کی حقیقت پیدا ہو رہی ہے۔ کل کے عہد کی رگوں میں آج کے عہد کے خون کے کچھ نہ کچھ قطرے ضرور ہوں گے...... مجھے اس پر ناز ہے کہ میں اس صدی کا وہ شاعر ہوں جو ہزار ہا برس پرانے خوابوں کے تعبیر کی صدی ہے۔ میری نظروں کے سامنے یہ دنیا بن رہی ہے، سنور رہی ہے۔ میری نظروں کے سامنے انسان کی تخلیق ہو رہی ہے......میں اپنے نالہ و بکا آہ و فریاد سے اس غموں سے بھری ہوئی دنیا کو زیادہ غمگین نہیں بنانا چاہتا.............میں مختلف سطح کی شاعری کرتا رہا ہوں۔ میری تمام تر کوشش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے لیے اپنی شاعری کو آسان بنا سکوں.........جب کبھی بول چال کی زبان سے ہٹ کر 'شاعرانہ' زبان بنائی جاتی ہے تو وہ مصنوعی ہو جاتی ہے۔''

یہ سچ ہے کہ سردار نے مصنوعی زبان استعمال نہیں کی لیکن پورا سچ یہ بھی نہیں ہے کہ ان کی مکمل شعری زبان عوامی ہے۔ بعض نظموں میں یہ سبک اور عوامی لہجہ ضرور ہے لیکن ان کی اصل زبان تو کلاسکیت

میں ہی رچی بسی نظر آتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اپنی انقلابی واحتجاجی شاعری میں بھی کچھ نئی اصطلاحیں وتراکیبیں وضع کی ہیں جو سردار کی خلاقیت وانفرادیت کا پتہ دیتی ہیں۔ مثلاً

شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر

یا

چاولوں کی صورت پر مفلسی برتی ہے

یا

پہرے داروں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہو
رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام
گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں

'پتھر کی دیوار' کے تقریباً دس سال کے لمبے گیپ کے بعد 'ایک خواب اور' 1964 میں شائع ہوا۔ پیراہنِ شرر 1965 میں اور لہو پکارتا ہے 1968 میں ظاہر ہے کہ گزشتہ ایک دہائی کی نظمیں تین مجموعوں میں سمٹ آئی ہیں۔

یہ دور سردار کی شاعری کی سنجیدگی اور گہرائی کا دور ہے۔ اس دور کی نظموں میں رومان، حقیقت، اشتراکیت، سماجیت بھی کچھ نئے پیرایۂ اظہار، افکار وآثار میں نظر آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی نظمیں مختلف ومتفرق اشعار میں بلا کی رومانیت اور کیفیت تو ہے ہی سنجیدگی اور بالیدگی نظر آتی ہے۔ زندگی کا ٹھوس نظریہ جھلکتا ہے۔ فلسفیانہ گہرائی نظر آتی ہے۔ جوش وابال کم ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ فکر میں کمی یا جذبہ میں سبک روی آگئی ہو۔ اس دور میں بھی وہ بڑے اعتماد سے کہتے ہیں۔

میں اگر پی نہ سکا وقت کا یہ آبِ حیات
پیاس کی آگ میں ڈرتا ہوں کہ جل جاؤں گا

وقتی ہنگامی سیاست وخطابت سے الگ اس دور کی نظمیں زندگی کے جہد مسلسل اور اس کے اسرار ورموز پیکار وآزار پر فلسفیانہ روشنی ڈالتی ہے۔ ان نظموں میں صرف فلسفہ ہی نہیں ہے بلکہ سنجیدہ رومان، تحیر وتجسس آمیز حقیقتوں کے مرقع ملتے ہیں۔ ان نظموں کی سنجیدگی اور بالیدگی میں سماجی اور سیاسی عوامل کارفرما ضرور ہیں لیکن ان میں روح کا کرب اور دل کی تپش دکھائی دیتی ہے جو سردار کے حسنِ بیان اور حسنِ خیال کی آمیزش سے ایک روحانی اور وجدانی کیفیت میں ڈھل جاتی ہے۔ یہاں وقتی مسئلہ یا سیاسی

واقعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کا ایک لا متناہی سفر اور اس سفر میں پیدا ہونے والے رنج و غم، جہادِ نفس اور جہادِ ذہن کی طرف لطیف اور بلیغ اشارے ہیں جو الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر ایک نئی شعری جمالیات کا مظہر بن جاتے ہیں اور آواز دیتے ہیں کہ 'آؤ مل کر محبت کو آواز دیں نیکیوں کو پکاریں' 64ء کی جنگ کے خلاف نظمیں 'صبح فردا' کی شہرت و مقبولیت اور 'پیراہنِ شرر' کے حرف اوّل کا جملہ 'انسانی برادری کا جو خواب صوفیوں اور سنتوں نے دیکھا ہے جس کے ترانے رومی، حافظ، کبیر، گرونانک جیسی مقدس ہستیوں نے گائے تھے وہ خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہے۔'

اسی لیے سردار ایک خواب اور کی بات کرتے ہیں ترقی پسندی روشن خیالی اور سب سے بڑھ کر انسان دوستی یا انسانی سالمیت اور وحدت کی بار بار بات کرتے ہیں جس میں بادی النظر میں مارکسزم ضرور ہے لیکن بنیاد میں صوفی ازم کے جذبات و تصورات زیادہ جھلکتے ہیں۔ سردار بنیادی طور پر حق پرستی اور انسان دوستی کے شاعر ہیں جو فی زمانہ ترقی یافتہ شکل میں مارکسزم اور پروگریسوازم میں بدل جاتے ہیں لیکن ان کا ذہن و شعور، تاریخ و تہذیب کے انھیں معاملات میں رچا بسا ہے۔ نظم 'یہ لہو' کا یہ بند دیکھیے

یہ لہو کافر نہیں، مرتد نہیں، مسلم نہیں
کلمۂ حق کا اجالا یہ تجلی یہ ظہور
یہ لہو میرا لہو، تیرا لہو، سب کا لہو

یا غزل کا یہ شعر۔

وید اپنشد پرزے پرزے، گیتا قرآں ورق ورق
رام و کرشن و گوتم یزداں زخم رسیدہ سب کے سب

اور یہ اشعار۔

یہ دنیا گمراہ ہے اب تک پھر بولو اے سنت کبیر
ایک ہی سونے کے سب گہنے ایک ہی مٹی کے برتن
ایک ہی نور ہے سب شمعوں میں ایک ہی رس سب میووں میں
اپنے منہ کو میٹھا کر لو کر لو آنکھوں کو روشن

آخری مجموعہ لہو پکارتا ہے (1968) میں بھی یہ سبھی کچھ ہے اور آرزوئے تشنہ لبی، تمھارا شہر، پھول چاند یہ ہم بہت اچھی نظمیں ہیں پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ سفر ٹھہر سا گیا ہے اور اب ان میں زندگی کی استقامت، کیفیت تو ملتی ہے فکر کی بلوغیت اور جہت بھی ملتی ہے لیکن ارتقا نہیں ملتا اور شاید یہ ممکن بھی نہ تھا

کہ سردار نے چالیس سالہ تخلیقی سفر طے کر لیا تھا اور اب تخلیق، تفکیر و دانشوری بدل گئی تھی۔ اتفاق یہ تھا کہ پورا دور جنگ و جدل، قتل و خون، تغیر و تبدل کا دور تھا پورا ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا بدل رہی تھی۔ ایشیا جاگ رہا تھا ایسے میں ایک ترقی پسند شاعر نئی دنیا کو سلام تو کرے گا ہی اس کے یہاں خنجر، تلوار، مقتل جیسے الفاظ کی بھر مار تو ہوگی ہی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ آرزوئے تشنہ لبی، آرزوؤں کی جھیل، ذوقِ گنہ گاری جیسی نئی ترکیبیں و استعارے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لہو کا استعارہ تو مختلف رنگ میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح سردار کی شاعری صرف اردو شاعری میں ہی نہیں بلکہ ترقی پسند شاعری میں ایک الگ ڈکشن اور پہچان بناتی ہوئی نظر آتی ہے جس کو اردو والوں نے آسانی سے قبول نہیں کیا۔ اسی لیے سردار جعفری پر بہت سارے اعتراض ہوئے کسی نے ان کو شاعر کم دانشور زیادہ سمجھا۔ کسی نے انقلاب واحتجاج کا وقتی شاعر گردانا۔ رفعت سروش نے ایک حرف انقلاب کہا۔ وحید اختر نے خواب اور شکستِ خواب اور صدیق الرحمٰن قدوائی نے عزم و پیکار کا شاعر کہا۔ فراق صاحب تو یہاں تک کہا کرتے تھے کہ سردار جعفری کے ہر صفحہ پر فوج دوڑتی نظر آتی ہے۔ لیکن خود سردار اپنے آپ کو شاعر سے زیادہ صدیوں کی انسانی روایات، تہذیب و تاریخ کا وارث سمجھتے تھے اور کہتے تھے 'میں ہوں وارثِ تاریخِ عصرِ انسانی' اور شاعر سمجھتے بھی ہیں تو صرف اردو کا نہیں بلکہ پوری عالم انسانیت کا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شاعر کا پیغام اور لہجہ دونوں ہی اردو کے عام روایتی لب و لہجہ سے الگ تو ہوگا ہی روایتی عوامی اور انقلابی لہجہ سے بھی الگ ہوگا۔ اسی لیے اردو کا عام قاری انھیں اسی طرح سے پڑھ اور سمجھ ہی نہیں سکا جس طرح سے سمجھنا چاہئے۔ لیکن سردار نے اس کی کبھی فکر نہیں کی کہ اردو کے قارئین اور ناقدین ان کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ تمام تر مخالفت اور نزاعی صورتوں کے باوجود ہمہ وقت مسکراتے ہی رہے۔ دوسروں کے آنسوؤں پر اپنا لہو اور لہو پر اپنے آنسو بہاتے رہے۔ تبھی تو بڑے اعتماد سے نظم 'شعور' میں کہتے ہیں۔

مری رگوں میں چھلکتے ہوئے لہو کو سنو
ہزاروں لاکھوں ستاروں نے ساز چھیڑا ہے
ہر ایک بوند میں آفاق گنگنائے ہیں

انسانی رشتوں اور فکر و فن کی جہتوں کا اعتماد انھیں یہ کہنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا

جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
میں رنگِ حنا آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا

اوراس میں شک نہیں کہ سردار جعفری کا اندازِ سخن اپنے پیش روؤں سے ہی نہیں ہم عصروں سے بھی جداگانہ ہے، عارفانہ ہے، جرأت مندانہ ہے جو اپنی خلاقانہ تہوں میں اس قدر رچ بس گیا ہے کہ ان کی پرتوں کو کرید پانا، ان کی معرفت حاصل کر پانا ہراک کے بس کی بات نہیں۔ اسی لیے سردار جعفری پر زیادہ سے زیادہ اعتراضات ہوئے اور شاید اس لیے بھی کہ وہ مجاز، فیض جیسے رومانی شاعروں کے مقابلے کم پڑھے گئے اور اس سے زیادہ کم سمجھے گئے۔ نئی دنیا کو سلام، امن کا ستارہ، ایشیا جاگ اٹھا، زندگی، نیند، گفتگو، میرا سفر وغیرہ نظموں کو از سرِ نو پڑھنے، سمجھنے اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔

عجب بات ہے کہ ادبی حلقہ میں سردار نے اپنی شاعری سے زیادہ دانشوری سے عزت و شہرت پائی لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر ہی ہیں لیکن میر، غالب، سودا، درد، مومن، حسرت کے قبیل کے کم حافظ، سعدی، نانک، کبیر، انیس، اقبال، جوش کے قبیل کے زیادہ جس میں پابلو نرودا، ناظم حکمت، مارکس، لینن وغیرہ نے نئے نئے رنگ بھر دئے۔ اس لیے جن کا مطالعہ نہیں ہے جو انسان کی صدیوں کی تاریخ کے پیچ و خم اور کیف و کم پر نظر نہیں رکھتا اور جولب و رخسار سے ہاتھوں کی اہمیت نہیں سمجھتا وہ اصل سردار اور اس کی شاعری کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لیے اردو کے روایتی، عام اور محدود و مشروط قارئین کے درمیان سردار کو وہ درجہ مل ہی نہیں سکتا تھا جو بعض دیگر شاعروں کو مل سکا۔ لیکن گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ دنیا کے حادثات و تغیرات کا جو نیا ادراک و عرفان ظاہر ہوگا سخن فہمی کے ساتھ ساتھ انسان شناسی کا مزاج قائم ہوگا۔ وہ سردار کی شاعری کی پرتوں کو کھولے گا اور پھر سردار کا اندازِ سخن ہی نہیں معیارِ سخن اور مقصدِ سخن سب کچھ واضح ہونے لگے گا۔ اس لیے کہ بڑے شاعر کی بڑی شاعری ہر عہد میں اپنی پرتوں کو کھولتی ہے، عہد شناسی، تہذیب شناسی اور انسان شناسی کا حوالہ بنتی ہے۔ بلا شک و شبہ علی سردار جعفری کی شخصیت و شاعری کے معاملات اور تصورات کچھ اسی طور اور نوع کے ہیں جس کے لیے تھوڑا وقت درکار ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، حکومت ہند نے کئی جلدوں میں کلیاتِ سردار جعفری کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کی ترتیب وتدوین کی ذمہ داری مجھ حقیر کو سونپی، ہر چند کہ میں اس بڑے کام کا اہل نہیں تاہم اپنی پوری صلاحیت نیز عقیدت کو مجتمع کر کے اس کام کو انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ پہلی دو جلدوں کا تعلق ان کی شاعری سے ہے جس میں ان کے نو (9) شعری مجموعے زمانی اعتبار سے ترتیب دئے گئے ہیں۔ کچھ نظمیں دہرائی گئی تھیں میں نے ان کو اسی انداز سے پیش کر دیا ہے۔ 'امن کا ستارہ' 'پتھر کی دیوار' کے مجموعوں میں کچھ بندوں کو خود سردار جعفری نے کاٹ دیا تھا چنانچہ احتراماً انھیں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ 'لہو پکارتا ہے' (1968) کے بعد ان کا کوئی شعری مجموعہ نہیں آیا لیکن ان کا شعری سفر رکا نہیں البتہ اس کی رفتار سست ضرور تھی۔ اس لیے بعض رسائل یا انتخاب وغیرہ میں جو بھی کلام حاصل ہو سکا اسے بعد کے دور کی شاعری کے ضمن میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں بیگم سلطانہ جعفری نے بڑی مدد کی۔ انھوں نے ہی اس کام کے لیے میرے نام کی تجویز رکھی۔ یہ ان کا کرم ہے اور خورد نوازی ورنہ میں جانتا ہوں کہ مجھ جیسا کم علم سردار جعفری جیسے بڑے شاعر اور دانشور کے بارے میں کسی نوع کا کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ سلطانہ آپا اور قومی کونسل کے ارباب حل وعقد اور بالخصوص ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے کسی قابل سمجھا اور یہ بڑا کام مجھے سونپا۔

جاوید نظر نے اس کی کمپوزنگ کی اور نغمہ پروین نے اس کی پروف ریڈنگ کی۔ یہ دونوں میرے شاگرد ہیں ان کو دعائیں۔

مقدمہ کے طور پر میں اپنی یہ حقیر تحریر اس عظیم شخصیت کی یادوں کے نام معنون کرتا ہوں اور ان لمحوں کے نام بھی جو میں نے سردار جعفری کی صحبتوں اور قدموں میں گذارے۔ ان سے ہم کلامی ہم سفری وہم نظری کی سعادت حاصل کی۔ ان کی رہنمائی وسرپرستی میں ادب وزندگی کے نہ جانے کتنے روشن سبق پڑھے۔ مشکل کام کیے اور کٹھن منزلیں طے کیں۔

امید کرتا ہوں کہ سردار جعفری جلد اول ودوئم میں شامل ان کے تمام شعری مجموعوں کا اجتماعی مطالعہ سردار فہمی اور سردار شناسی کے نئے در وا کرے گا۔

علی احمد فاطمی
پروفیسر شعبۂ اردو
الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد

پرواز

1944

خلوص اور احترام کے ساتھ
اپنے رفیق اور رہبر
پورن چند جوشی کے نام

کھل گیا در، پڑ گیا دیوارِ زنداں میں شگاف
اب قفس میں جنبشِ صد بال و پر ہونے کو ہے

علی سردار جعفری

دوسو سال سے کچھ اوپر ہوئے کہ مصحفی نے انتہائی طنز اور تلخی کے لہجے میں ایک غزل پڑھی تھی جو غالباً طرحی تھی۔ مطلع یہ تھا۔

کیا چلکے اب فقط مرے نالے کی شاعری
اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری

مصحفی نے اپنے زمانے سے شکایت کی تھی اور ان کی شکایت بھی بجا تھی اس لیے کہ ان کے زمانے میں شاعری پھینکتی اور قلابازی قسم کی چیز ہو چلی تھی اور شعراء قافیہ اور ردیف کے کمال اسی طرح دکھانے لگے تھے جس طرح نٹ بانس اور رسّی پر اپنے کرتب دکھاتے ہیں۔ مصحفی کو خواب میں گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ کسی زمانے میں نہ صرف تیغ اور بھالے کی شاعری بلکہ پھاوڑے اور کدال اور ہنسئے اور ہتھوڑے کی شاعری انسانی تہذیب کا صحیح میلان اور جائز مطالبہ ہو جائے گی اور یہ شاعری ہمارے آباواجداد کے نالوں کی شاعری سے کم سنجیدہ اور کم مہذب نہ ہوگی اور حیاتِ انسانی کی تہذیب و تحسین میں اس سے زیادہ مددگار ثابت ہوگی۔

نالوں کی شاعری انسان کی نفسیات اور درندگی کو جس قدر مہذب کر سکتی تھی کر چکی۔ اب خالص جذبات و تخیل اور رومانیت اور ماورائیت کا فن انسان کے انسانی وقار اور ہماری متبرک زمین کی ارضی پاکیزگی اور طہارت کو قائم رکھنے یا اس کو بڑھانے میں زیادہ ہمارے کام نہیں آ سکتی۔

یہ ماننے میں تو شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ اس وقت میر اور غالب، امیر اور داغ تو خیر زیادہ فاصلے پر ہم سے پیچھے چھوٹ چکے ہیں۔ اصغر اور جگر کی آوازیں اس قدر قریب اور موانست کے باوجود کچھ اجنبی اور بے محل سی معلوم ہو رہی ہیں۔ برخلاف اس کے جب ہمارے کانوں میں یہ آوازیں پڑتی ہیں۔

رعد ہوں، برق ہوں، بے چین ہوں پارہ ہوں میں
خود پرستار خود آگاہ خود آرا ہوں میں
گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جور جلا دے وہ شرارہ ہوں میں

میری فریاد پر اہل دول انگشت بہ گوش
لا تیر خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

(مخدوم محی الدین)

یا

غریبوں کے گھر میں جنم ہم نے پایا
مصیبت کی گودوں کے پالے ہوئے ہیں
مگر توپ، بندوق، تلوار، نیزے
یہ سب اپنے ہاتھوں کے ڈھالے ہوئے ہیں

(علی سردار جعفری)

یا

گرج گولوں کی اکثر بے اثر ہوتی ہے کانوں پر
کبھی جب نیند آ جاتی ہے توپوں کے دہانوں پر
گزر جاتا ہوں طوفاں بن کے دریا کے کناروں سے
پہاڑوں کو ہٹا دیتا ہوں آنکھوں کے اشاروں سے

(علی سردار جعفری)

تو ہماری شاعری کے روایتی تصور کو ان سے جس قدر بھی جھٹکے لگیں اور ہم ان کو لاکھ نامانوس پائیں لیکن ہمارے اندر یہ احساس پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہماری شاعری کی دنیا نہ صرف بدل رہی ہے بلکہ اس میں نئی سمتیں اور نئی وسعتیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں اور وہ انسانی زندگی اور اس کے ارضی وجود کے مراحل اور مشکلات کی طرف روز بروز زیادہ متوجہ اور ان کی ہمت اور منزلت کی زیادہ قائل ہوتی جا رہی ہے۔ یہ یقیناً نیا اور بہت بڑا اکتساب ہے اور صحت اور ترقی کی ناقابل انکار علامت ہے۔

2

اردو شعر و ادب میں پہلا نیا موڑ تو سرسید کے زمانے میں اور انھیں کی جماعت کی سرکردگی میں پیدا ہوا۔ لیکن اس کے بعد اردو ادب میں برابر نئے موڑ اور ترقی کی نئی سمتیں نکلتی رہیں یہاں تک کہ گزشتہ جنگ عظیم کا زمانہ آ گیا جو ہمارے ادب کی تواریخ میں ایک خاص سرحدی نشان ہے۔ پچھلے پچیس تیس سال کے

اندر اردو میں جو ادب پیدا ہوا ہے وہ جنگ عظیم کے پیشتر کے ادب سے بہت مختلف ہے اور ہر لحاظ سے اس پر اضافہ اور ترقی کا حکم رکھتا ہے۔

ادب کے مختلف اصناف میں شاعری بڑی کٹر صنف ہے اور وہ بہت مشکل سے روایتی اصول اور اسالیب کو چھوڑ کر انقلابی اور ترقی کے نئے تصورات کو قبول کر سکتی ہے۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ حالی، آزاد اور اسماعیل میرٹھی وغیرہ کی تمام مخلصانہ کوششوں کے باوجود ایک مدت تک اردو میں جو شاعری رائج اور مقبول عام رہی وہ داغ اور امیر کی شاعری تھی۔ اقبال جیسا مفکر اور بالغ نظر شاعر بھی اس نقار خانے میں اپنی آواز کو موثر نہ بنا سکا۔ لیکن 19ء اور 20ء کے بعد اردو شاعری کا رخ اور اس کا انداز کچھ ایسا بدلا کہ ہم دیکھتے رہ گئے اور پھر قدامت پرستی اور رجعت کی مختلف قوتیں اپنا سارا زور لگاتی رہ گئیں مگر اردو شاعری کا قدم آگے ہی بڑھتا گیا اور اس میں نئی راہیں نکلتی گئیں اور اب اقبال کی شاعری کو موقع ملا کہ وہ اپنی آواز سے لوگوں کو متاثر کرے اور اپنی تاریخی تقدیر کی تکمیل کرے۔ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد اردو شاعری نے جتنی ترقیاں کی ہیں سب کا سلسلۂ فکر اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے براہ راست یا بالواسطہ اقبال کی شاعری سے ملتا ہے۔

3

ہم کو یہ دیکھ کر بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ اس وقت اردو شاعری میں نوجوانوں کی ایک پوری نسل تیار ہو چکی ہے جو طرح طرح کے نئے تجربے کر رہی ہے اور پرانی اور پامال لیکوں کو چھوڑ کر نئی راہیں نکال رہی ہے۔ اس نسل میں زیادہ تعداد ایسے شاعروں کی ہے جن کو ارمان اور اصرار ہے کہ ہم ان کو ترقی پسند سمجھیں اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارے درمیان اس وقت ایسے شاعروں کی کمی نہیں جو انقلاب اور ترقی کا راز سمجھے ہوئے ہیں اور جو نئی زندگی کا صحیح تعمیری تصور سامنے رکھ کر شعر کہتے ہیں۔ اگر چہ یہ دیکھ کر ہم کچھ مضمحل بھی ہو جاتے ہیں کہ اس گروہ میں بہت سے ایسے شعراء بھی غلطی سے شامل سمجھ لیے گئے ہیں جو سوچنے سمجھنے کی صالح توانائی نہیں رکھتے، جو انقلاب اور ترقی، تخریب اور تعمیر نو کے صحیح مفہوم سے بالکل نابلد ہیں اور جو ہر بے معنی اور بے غائت بدعت کو ترقی کا اقدام سمجھتے ہیں۔

جن نوجوان ادیبوں اور صناعوں نے حیات انسانی کی تواریخی رفتار کا مطالعہ کیا ہے اور انقلاب اور ترقی کے فطری اصول و میلانات پر فکر و بصیرت کے ساتھ غور کیا ہے ان میں علی سردار جعفری ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور جدید اردو شاعری ان سے خاص امید لگائے ہوئے ہے۔

علی سردار کی ادبی عمر ابھی بہت زیادہ نہیں ہے لیکن تھوڑی سی مدت میں وہ اپنے کو کئی حیثیتوں سے

نمایاں کر چکے ہیں۔ 'منزل' کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ علی سردار افسانے بھی لکھتے ہیں۔ تمثیل نگاری کے میدان میں بھی وہ مجبور نظر نہیں آتے ،ان کا قلم تنقیدی جنبش بھی دکھاتا رہتا ہے اور ان کی شاعری کا چرچا تو خیر عام ہو چکا ہے۔ان حیثیتوں کے علاوہ 'نیا ادب' کی ادارت اور 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کی سرگرم رکنیت ایسے کام نہیں ہیں جن کو کبھی انصاف کے ساتھ فراموش کیا جا سکے مگر میری نگاہ میں شاعر اور نقاد کی حیثیت سے علی سردار کا مرتبہ سب سے زیادہ مستقل اور مضبوط ہے۔انھوں نے اپنے لہجے اور انداز سے نئی شاعری کو وقیع اور متین بنا کر اس قابل کر دیا ہے کہ وہ پختگی اور شائستگی میں روایتی شاعری سے آنکھیں ملا سکے۔

علی سردار کی شاعری کی جو خصوصیت سب سے پہلے ہم کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ انھوں نے اپنے 'بربط دل' کو 'نئے انداز' سے چھیڑا ہے لیکن ان کا یہ 'نیا انداز' بہت رچا ہوا ہے اور ہمارے موروثی روایات کی تمام شائستگی اور تہذیب کے لطیف ترین عناصر کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ہمارے اکثر نوجوان شعراء جب انقلاب کا ذکر کرتے ہیں یا قدامت پرستی اور ترقی کے سوال کی طرف کوئی در پردہ یا کھلا ہوا اشارہ کرتے ہیں تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور ان کی شاعری وفور ہیجان میں یا تو محض تبرا ہو کر رہ جاتی ہے یا کرب و تشنج کی چیخ اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے نہ تو زندگی کے رموز وانقلاب و ترقی کے اصول کا کتابی مطالعہ کیا ہے اور نہ تو خود ہی غور و فکر سے کام لیا ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر ظرف پیدا نہ ہو سکا اور وہ چیخ و پکار واویلا کو انقلابی شاعری سمجھنے لگے اور تو اور اس وقت جو شاعر ترقی پسند شاعروں کی امامت کر رہا ہے اس کے وہاں بھی یہ کمزوری اہل فکر و بصیرت کو نمایاں طور پر اور افسوس ناک حد تک محسوس ہوتی ہے۔ جوش کی انقلابی شاعری کا بہترین حصہ اکثر و بیشتر ایک کف در دہاں چیخ سے زیادہ وقیع نہیں۔ جوش کی شاعری اندر سے بے انتہا بے مغز اور کھوکھلی ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ اس وقت ان کے سوا کوئی دوسرا ایسا 'مرد بزرگ' نہیں جس کو ترقی پسند حضرات اپنا 'امیر' یا 'قائد' بنائیں۔ یہ ستم ظریفی بھی قابل لحاظ ہے کہ ترقی پسندوں کی جماعت بھی کسی کو اپنا 'رئیس' یا 'آمر' بنانے کی رسم سے بے نیاز نہ رہ سکی۔

بہر حال علی سردار کی شاعری بہت دور تک ان خامیوں اور کمزوریوں سے پاک ہے۔ان کی نظمیں ایک ظرف کا پتہ دیتی ہیں انھوں نے زندگی کی جدلیات کو دیکھا ہے۔ان کے ذہن میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کا صحیح تصور موجود ہے۔اس لیے وہ جب رجعتی قوتوں کی کہنگی اور بے مائیگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو ایک خاص عارفانہ تیور کے ساتھ جو تبرا سے کہیں زیادہ موثر ہوتا ہے یا جب کبھی وہ

انقلاب اور زندگی کی نئی قوتوں کا احساس ہمارے اندر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے ہونٹوں میں کہیں سے وہ کپکپاہٹ نہیں پیدا ہوتی جو صرف خامکارانہ ہیجان کی علامت ہوتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

ایک نظم میں جوانی کا مسلک یوں بیان کرتے ہیں۔

کھلایا ہے مجھے گودوں میں جرأت نے حمیت نے
سلایا لوریاں دے کر مجھے ہمت نے غیرت نے

....

مری افسردہ نظروں میں نہاں دنیا کی قسمت ہے
مری چین جبیں پر نقش تاریخ حقیقت ہے

مرے زخموں میں حدت زندگی کے آفتابوں کی
مری ٹھوکر میں پنہاں داستانیں انقلابوں کی

نیا نغمہ کوئی جب سانس لے لیتا ہے سینے میں
ہزاروں داغ پڑ جاتے ہیں پتھر کے کلیجے میں

....

سکوں کو لا کے ہنگاموں کے پہلو میں سلاتا ہوں
نوائے تلخ سے میں سارے عالم کو جگاتا ہوں

....

حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مسلک میرا مذہب نوجوانی ہے

یا 'سماج' کے عنوان سے موجودہ ہیئت اجتماعی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کہیں پیری کا سحر خواب آور نوجوانوں پر
کہیں مذہب کا پہرا ارتقاء کے رازدانوں پر
عیاں سفاکیاں پرہیزگاروں کی جبینوں سے
ٹپکتا ہے لہو پیر حرم کی آستینوں سے
نہ جانے کیوں یہ دنیا قومیت کے راگ گاتی ہے
یہ وہ چکی ہے جس میں آدمیت پیسی جاتی ہے
نظام کہنہ کے کندھوں پہ اصلاحوں کے لاشے ہیں
بہت سے بت ملوکیت کے آذر نے تراشے ہیں
تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو
زمانہ کس قدر بیتاب ہے کروٹ بدلنے کو

ایسے اشعار وہی کہہ سکتا ہے جس نے مارکس اور لینن کا صرف نام نہ سنا ہو، بلکہ ان کے فلسفہ کا غور سے مطالعہ کیا ہو اور انسانی تہذیب کی تواریخ اور اس کی رفتار کو سمجھے ہوئے ہو۔

علی سردار کی شاعری کا زیادہ حصہ جماعتی ہے۔ وہ اپنی جماعت کے بڑے سچے اور مخلص نمائندہ ہیں وہ اپنی ساری ہستی اور اپنے سارے فن کو صدق نیت کے ساتھ اپنی جماعت کی خدمت کے لیے وقف کئے ہوئے ہیں۔ اسی لیے ان کے کلام کا اکثر حصہ تبلیغی انداز لیے ہوئے ہوتا ہے بعضوں کو اس کی شکایت ہے لیکن یہ شکایت نافہمی کی بناء پر ہے۔ اس زمانے میں غائتی میلان سے بالکل خالی رہ کر کوئی ادبی حرکت وقیع اور قابل قدر نہیں ہو سکتی اور غائتی میلان کے صرف یہ معنی ہیں کہ اس وقت زندگی میں جو دو متضاد قوتیں یعنی رجعت اور انقلاب، قدامت اور ترقی باہم برسر پیکار ہیں ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ہولیا جائے۔ اب یہ اپنی اپنی ہمت پر منحصر ہے کہ ہم رجعتی قوت کا ساتھ دیں یا انقلابی قوت کا۔ ہمارے ادیب اور صناع کو بہ حال کسی نہ کسی حد تک جانب دار رہنا ہے لیکن ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ ہمارا جماعتی ادیب اپنے تبلیغی میلان کو ادب کس حد تک بنا سکا ہے۔ اگر اس کے کارناموں میں فنی یا اسلوبی کیفیت نہیں ہے تو وہ محض صحافی یا ڈھنڈورریا ہے۔

علی سردار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑے بے نفس اور بے نیاز انسان ہیں اور جماعت کی بہبود اور ترقی اور اس کے ذریعہ عوام الناس کی بہتری ان کے دل کی تنہا آرزو ہے۔ ترقی پسند شاعروں کی جماعت میں علی سردار اور مخدوم محی الدین صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جن کی شاعری میں دور تک کہیں انفرادیت کی مہک محسوس نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کا سارا فن غیر شخصی ہے اور اس فن کو یہ لوگ فن لطیف بنانے میں حیرت ناک حد تک کامیاب ہیں۔ یعنی ان کے اسالیب میں جمالیاتی کیفیتیں بھی بھرپور ہوتی ہیں اور یہ بہت نمایاں طور پر اقبال کے مطالعے کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ علی سردار اپنے اسلوب میں صرف کسی حد تک جوش سے متاثر ہیں ورنہ نناوے فی صدی ان کی شاعری اقبال کے اثر کی علامتیں لیے ہوئے ہے۔ ان کے مصرعوں اور مصرعے کے ٹکڑوں میں جو دھم ہموار اور پرسکون ترنم ہوتا ہے وہ بے اختیار اقبال کی یاد لاتا ہے۔ ان کے وہاں الفاظ بے شک اکثر نئے ملتے ہیں اور ایسے کہ اس سے پہلے شاعری میں نہیں استعمال کئے گئے ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کے اسلوب اور انداز بیان میں وہی رچی ہوئی پختگی ہوتی ہے جو اقبال کے سوا کسی دوسرے نظم نگار کو میسر نہیں ہوئی اور جس کا آج کل کے نوجوان شاعروں کے کلام میں تو منزلوں پتہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

دامن جھٹک کے منزل غم سے گزر گیا　　　اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گرد سفر مجھے

اس شعر میں روایتی شاعری کی تمام پختگی، شائستگی اور سنجیدگی موجود ہے لیکن جس خیال کا اظہار کیا گیا ہے وہ نئی اور ترقی پذیر زندگی کا ایک ایسا مطالبہ ہے، جس کو کوئی ایسا ہی شاعر محسوس اور بیان کر سکتا تھا جو انقلاب اور ترقی کے فلسفہ پر فکری عبور رکھتا ہو۔

سرمایہ دار اور مزدور کا اختلاف آج کل کے نئے ادب کا ایک نہایت پامال موضوع ہے شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر ایسا ہو جو نئی نسل اور نئے میلانات سے اپنے کو وابستہ کیے ہو اور جس نے اس موضوع کو ہاتھ نہ لگایا ہو لیکن شاید ہی کوئی علی سردار کی طرح اسلوب کی پختگی اور تازگی سے اس میں ایسی مستقل کشش پیدا کر سکا ہو۔ 'مزدور لڑکیاں' کے عنوان سے جو نظم ہے اس کے کچھ اشعار سنیے۔

گردشِ افلاک نے گودی میں پالا ہے انھیں — سختیِ آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انھیں
بیکسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب — ساز ان کا سوزِ حسرت خامشی ان کا رباب
سر سے پا تک داستانیں حسرتِ ناکام کی — نرم و نازک قہقہوں میں تلخیاں ایام کی
ان کے ساتھی پھاوڑے ان کی سہیلی ہے کدال — زندگی پر یہ وبال اور زندگی ان پر وبال
ٹھوکروں پر ان کی جھک سکتے ہیں ایوان و قصور — توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹانوں کے غرور
ان کی چوٹوں سے نکلتے ہیں پہاڑوں سے شرار — یہ اگر چاہیں الٹ ڈالیں بساطِ روزگار
بن کے قوت ایک دن ابھرے گی برسوں کی تھکن — دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظامِ انجمن

ان کے مقابلے میں ذرا 'سرمایہ دار لڑکیاں' بھی ملاحظہ ہوں۔

دید ہے ان کی بہشتِ کیف و فردوسِ نشاط — خوش رخ و خوش پیرہن خوش پیکر و خوش اختلاط
بزم آرائی کی خو ذوقِ کم آمیزی کے ساتھ — جنبشِ مژگاں بھی اک شانِ دلآویزی کے ساتھ
گردنوں کا خم، کمر کا لوچ، سینے کا ابھار — صندلی ہاتھوں سے بت خانوں کی قسمیں آشکار
اہرمن تو اہرمن ہو جائے یزداں بھی شکار — ان کا ہر انداز تاجر ہر ادا سرمایہ دار
عشق کے ذوقِ نظارہ نے نکھارا ہے انھیں — مرد کی صدیوں کی محنت نے سنوارا ہے انھیں
ڈوب تو سکتی ہیں یہ لیکن ابھر سکتی نہیں — یہ کنار و بوس کی حد سے گزر سکتی نہیں

ایسا کامیاب مہذب اندازِ بیان نئے شاعروں کے وہاں قریب قریب نایاب ہے۔ 'جنگ اور انقلاب' کے عنوان سے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رقص کر اے روحِ آزادی کہ رقصاں ہے حیات
گھومتی ہے وقت کے محور پہ ساری کائنات

آ گیا ہے وقت وہ جو آ کے ٹلتا ہی نہیں
اپنا لنگر آج اپنے سے سنبھلتا ہی نہیں

انقلاب دہر کا چڑھتا ہوا پارہ ہے جنگ
وقت کی رفتار کا مڑتا ہوا دھارا ہے جنگ

روحِ آزادی کو سینے میں جکڑ سکتا ہے کون
ناچتے سورج کی کرنوں کو پکڑ سکتا ہے کون

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کی نگاہیں گردوپیش کے حالات پر گہری پڑ رہی ہیں اور وہ ان سے دور تک کے نتیجے نکال رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں اور وہ ان سے جو کچھ سمجھتا ہے اس کو سلیقہ اور شعور کے ساتھ زبان پر بھی لا سکتا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

4

علی سردار کی نظموں کا تعلق زیادہ تر ایسے موضوعات اور مسائل سے ہے جن کو وقت کا راگ کہنا چاہئے۔ 'تاریخ' 'آثار سحر' 'ارتقاء و انقلاب' 'سال نو' 'زمانہ قبل تاریخ' سب اسی عنوان کی چیزیں ہیں۔ پوچھنے والے پوچھ سکتے ہیں کہ جب یہ دور گزر جائے گا، جب زندگی کا نیا نظام قائم ہو چکے گا، جب مزدور اور سرمایہ داروں کی تفریق باقی نہ رہے گی۔ اس وقت ان نظموں کی حیثیت کیا ہوگی؟ یہ سچ ہے کہ جلد یا دیر ایک ایسا دور آئے گا جب کہ اس قسم کی شاعری ہمارے لیے صرف تواریخی نوادر ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن علی سردار کی شاعری میں ان کے اسلوب کی گداختگی کی وجہ سے ایک مستقل کشش بھی پیدا ہو گئی ہے اور ان کی یہ نظمیں جب بھی پڑھی جائیں گی تو ان میں ایک موثر کیفیت محسوس ہوئے بغیر نہ رہے گی۔

لیکن علی سردار کے وہاں ان دوری اور عارضی موضوعات اور عنوانات سے قطع نظر کر کے ہم کو جا بجا عام حیات انسانی اور اس کی ارتقائی فطرت کے متعلق کلی اور مستقل حقیقتوں کا بھی اظہار ملتا ہے۔ دو تین اشعار درج ہیں۔

گزشتہ دور خواب آلودہ پیری کا سہارا ہے	شکست عصر حاضر میں ہیں مستقبل کی تعمیریں
کشاکش عظمتِ کردار عطا کرتی ہے	زندگی عافیت انجام نہیں ہے اے دوست

'ٹوٹا ہوا ستارہ' کے عنوان سے ایک مختصر نظم ہے جس میں تمثیل نگاری کے پردے میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ بڑھی ہوئی انفرادیت اپنی شکست اور بربادی کا سامان خود ہی مہیا کرتی ہے۔ آخری شعر ہے۔

لیکن ایسا انجم[1] روشن جبین و تابناک   خودی ہو جاتا ہے اپنی تابنا کی کا شکار

ایسے اشعار کی تعداد بھی علی سردار کے وہاں کم ہے۔ یہ ان کی شاعری میں یقیناً ایک کمی ہے جو پوری ہو سکتی ہے۔ علی سردار کو زندگی کے جدلیاتی رموز کا کافی شعور ہے۔ اور وہ اس شعور کو کام میں لا کر اپنی شاعری کو زیادہ جاندار اور مستقل قدر و قیمت کی چیز بنا سکتے ہیں۔ ان کی شاعری بالکل نئے عنوان کی چیز ہے اور ابھی نئے تجربے کی منزل پر ہے۔ اس لیے اس میں کہیں رکی ہوئی بالیدگی، کہیں تذبذب اور بعض اوقات کچھ نارسائیوں اور کمیوں کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن ابھی علی سردار کے سامنے پوری عمر پڑی ہے اور ان کی کوششیں جاری ہیں۔ وہ ابھی بہت کچھ ہو سکتے ہیں اور آثار کہہ رہے ہیں کہ بہت کچھ ہوں گے میرا خیال ہے کہ اگر وہ نئے انداز کی غزلیں لکھیں جن میں ایک ایک شعر کی صورت میں زندگی کے پیچ در پیچ اور باہم متضاد حقیقتوں کو اپنے دل نشین اسلوب میں پیش کریں تو یہ نہ صرف ان کا ایک زبردست اکتساب ہوگا بلکہ اردو شاعری میں ایک نئے عنوان کا مستقل اضافہ ہوگا۔ وہ اس کے اہل ہیں۔ ایک طرف ان کو زندگی کی صحیح بصیرت حاصل ہے تو دوسری طرف ان کے اسلوب میں وہ تمام جمالیاتی خوبیاں موجود ہیں جو خالص تغزل سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اب یہ علی سردار کا کام ہے کہ وہ غزل کی پرانی صنف کو نئی سمت میں لگائیں اور اس سے نئی خدمتیں لیں۔

علی سردار کے وہاں ایسی نظمیں بھی ملیں گی جن کو رومانی کہہ سکتے ہیں لیکن ان نظموں میں بھی ان کا میلان وہی ہے جو دوسری قسم کی نظموں میں ہے۔ وہ حسن و عشق میں کھوئے ہوئے نہیں ہیں۔ ان کے وہاں وہ سپردگی اور مغلوبیت نہیں ملتی جو اب تک رومانی شاعری کی ایک لازمی خصوصیت رہی ہے۔ ان کی رومانی نظموں میں بھی ایک تازہ ولولہ ایک حوصلہ انگیز انبساط ہوتا ہے اور سعی و عمل اور انقلاب و ترقی کی طرف ذوق انگیز اشارے ملتے ہیں۔ 'لکھنؤ کی ایک شام' 'انتظار نہ کر' 'فراموش کردند عشق' 'ایک خط کا جواب' 'محبت کا فسوں' 'حسن ناتمام' اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ ان میں ایک طرف تو وہ تمام اسلوبی لطافتیں اور لب و لہجہ کی وہ ساری نرمیاں موجود ہیں جن کو ہم رومانیت اور تغزل سے منسوب کرتے ہیں دوسری طرف ان میں بدلتی ہوئی زندگی کی ان نئی توانائیوں کا بھرپور احساس ملتا ہے جو دور جدید کی لازمی علامتیں ہیں۔

خود علی سردار ایک جگہ اپنی شاعری کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں۔

---

1 یہاں زبان کی ایک فاش غلطی سرزد ہوگئی ہے 'انجم' جمع ہے اور اس کو واحد سمجھا گیا۔ امید کہ دوسری اشاعت میں اس کو درست کر لیا جائے گا۔ (مجنوں)

انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب (اقبال)؟ اسی انجم کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن (اقبال)؟

فولاد کی گرج ہے یہ آہن کا شور ہے
نغمہ نہیں ہے شاعرِ نازک خیال کا

یہ شعر بھی کامیاب اسلوب بیان کی ایک اچھی مثال ہے۔ اور اپنی جگہ خوب ہے لیکن اس سے شاعری کے متعلق عام طور سے علی سردار کی شاعری کے متعلق خصوصیت کے ساتھ مغالطہ پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ 'شاعر نازک خیال' کا جو مفہوم اب تک رہا ہے اور اس کا جو منصب اب تک سمجھا جاتا رہا ہے وہ ایک گزرے اور مڑے ہوئے دور کی چیز ہے جو یقیناً ساقط الاعتبار ہو چکی ہے لیکن اب جب کہ ہم تخلیق اور حیات انسانی کی تضاد آمیز فطرت سے آگاہ ہوتے جا رہے ہیں اور زندگی کے تمام تصورات اور مفروضات بدل رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ 'شاعر نازک خیال' کا وہی فرسودہ اور بے جان روایتی تصور بدستور باقی رہنے دیا جائے۔ زندگی میں صلابت اور نزاکت، سختی اور نرمی کی ساتھ ساتھ ضرورت ہے اور دونوں کا امتزاج ہی زندگی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے شاعر کی آواز بیک وقت فولاد کی گرج اور مزمار کی جھنکار نہ ہو۔ علی سردار کو اس کا احساہو یا نہ ہو لیکن خود ان کی شاعری اشارہ ہے کہ شاعر میں اگر شعور ہو تو وہ کامیابی کے ساتھ اپنی شاعری کو ایسا خوشگوار اور دلپذیر آہنگ بنا سکتا ہے۔

آخر میں علی سردار اور دوسرے نوجوان شاعروں میں مجھے جو ایک نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے اس کو بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ ہمارے اکثر نئے شاعر اب بھی صرف حسرت و محرومی کے شاعر ہیں وہ ہمارے اندر نامرادی کا شدید احساس پیدا کر کے ہم کو اپنی موجودہ زندگی سے بددل تو کر سکتے ہیں لیکن ان کے لہجوں میں مستقبل کی بشارت کا خفیف سے خفیف بھی کوئی ارتعاش محسوس نہیں ہوتا۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان شاعروں کے سامنے مستقبل کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔ لیکن علی سردار حسرت و حرماں کے شاعر نہیں ہیں۔ وہ ماضی اور حال کو سمجھے ہوئے ہیں اور مستقبل کا صحیح اور قطعی درک رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری مستقبل کی بشارت لیے ہوئے ہوتی ہے اور ہماری رگوں میں امید کا انبساط اور حوصلہ کا جوش پیدا کرتی ہے۔

اگر علی سردار اپنی شاعری میں کچھ اور جامعیت اور گہرائی پیدا کر لیں۔ اگر وہ زندگی کی کلی حقیقتوں کو اپنے اشعار میں زیادہ جگہ دینے لگیں۔ اگر ان کی فکر و بصیرت زیادہ رسا اور ہمہ گیر ہو سکے اگر وہ اپنے لہجہ اور اسلوب میں اس سے بھی زیادہ نرمی اور گداختگی پیدا کر سکیں جس کی آگے چل کر ہم کو ان سے قطعی امید ہے تو وہ اردو شاعری میں ایک ایسی جگہ لے سکتے ہیں جو ابھی خالی ہے۔

مجنوں گورکھپوری

لے اڑا ہوں چند نغمے زندگی کے ساز سے
چھیڑتا ہوں بربطِ دل کو نئے انداز سے

آنسوؤں سے غم کے پیمانے کو پھر بھرتا ہوں میں
دیدۂ پُر نم کو اپنے خونفشاں کرتا ہوں میں

کر رہا ہوں جمع اپنے دل کے شیشہ پاروں کو پھر
جوڑتا ہوں اِک شکستہ ساز کے تاروں کو پھر

پھول بن کر کھل رہے ہیں آج پھر سینے کے داغ
جل رہے ہیں سوزِ دل سے آرزوؤں کے چراغ

عہدِ ماضی سے ہوا جاتا ہوں پھر نزدیک تر
حکمرانی کر رہا ہوں وقت کی رفتار پر

ڈھونڈتا ہوں خواب کو پھر خواب کی تعبیر میں
بھر رہا ہوں رنگ اک مٹتی ہوئی تصویر میں

پھر کسی جانب لیے جاتا ہے شوقِ اضطراب
اٹھ رہے ہیں جلوہ گاہِ حسن کے رنگیں حجاب

آسماں کی رفعتوں پر گیت گاتا ہے کوئی
پھر فضائے کہکشاں میں گنگناتا ہے کوئی

پھر سلیمیٰ کی نگاہوں میں ہے جادو کا اثر
دیکھتا ہے پھر کوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

ہو رہا ہے آج پیدا بادۂ حافظ میں جوش
نغمۂ فردوسیِ طوسی ہے پھر فردوس گوش

پھر جلا فطرت نے کی آئینۂ ایام پر
جھومتی ہے پھر گھٹا میخانۂ خیام پر
نغمۂ عصرِ کہن ہے زندگی کے ساز میں
آج ہے اک درد سا پھر رام کی آواز میں
بانسری کے زمزموں پر رقص کرتی ہے فضا
آ رہی ہے آسمانوں سے کرشنا کی صدا
ہر طرف بکھرا ہوا ہے چاند سے ماتھے کا نور
موجِ جمنا میں ہے رادھا کی نگاہوں کا سرور
آج پھر کاشی کی پیشانی پہ رقصاں نور ہے
آج پھر تلسی کے نغموں سے فضا معمور ہے
تیرتے ہیں آج پھر شمعِ تفاول کے نجوم
دیکھتا ہوں ساحلِ گنگا پہ پریوں کا ہجوم
جا رہا ہے پھر کبوتر لے کے ہاتھوں میں کوئی
ہنس رہا ہے سیکری کے سرخ محلوں میں کوئی
سن رہا ہوں نرم و نازک قہقہوں کی پھر صدا
ہو رہا ہوں زندگی کی لذتوں سے آشنا
پھر فضاؤں میں کسی پازیب کی جھنکار ہے
پھر شرر افشاں کوئی ٹوٹی ہوئی تلوار ہے
ٹوٹنے والی ہے اک جھٹکے میں زنجیرِ فریب
زیبِ اورنگِ حکومت ہے کوئی اورنگ زیب

جنگ کی دیوی نظر آتی ہے پھر چیں بر جبیں
کانپتی ہے آج پھر ٹیپو کے نعروں سے زمیں
دشمنوں کو آج پھر للکارتے ہیں شہسوار
اٹھ رہا ہے مغربی جادوگروں کا اقتدار
چپہ چپہ سرزمین ہند کا آباد ہے
آج شاید مادرِ ہندوستاں آزاد ہے
اے خدا لیکن کہاں پادر ہوا پھرتا ہوں میں
وہم کی دنیا میں کس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں
آہ کس رنگیں بیانی میں الجھ کر رہ گیا
عہدِ ماضی کی کہانی میں الجھ کر رہ گیا

1936

جوانی

نہ چھیڑ اے ہم نفس ٹوٹے ہوئے بربط کے تاروں کو
جگایا یوں نہیں کرتے ہیں خوابیدہ شراروں کو
مری آشفتہ حالی دیکھ کر تو مسکراتا ہے
مرے بوسیدہ پیراہن سے تو نظریں چراتا ہے
مری آواز تیرے نرم کانوں پر گراں کیوں ہے؟
مری افسردگی سے اس قدر تو بدگماں کیوں ہے؟
زمانے کا ستم ہر دم رہا ہے رازداں میرا
بھرا ہے ایسے ہی کانٹوں سے سارا گلستاں میرا
غموں کو روند کر ہنستا ہوا پھرتا ہوں دنیا میں
طمانچے موج کے کھاتا ہوا جاتا ہوں دریا میں
زمانے بھر میں تنہا رازداں ہوں لذتِ غم کا
سراپا درد ہو کر بھی ہوں درماں سارے عالم کا
مری فطرت زمیں کی وسعتوں کو تنگ کہتی ہے
مری عزت اضافی عزتوں کو ننگ کہتی ہے
امنگوں نے مجھے دودھ اپنے سینے سے پلایا ہے
ہزاروں ولولوں نے میرا گہوارہ ہلایا ہے

کھلایا ہے مجھے گودوں میں جرأت نے حمیت نے
سلایا لوریاں دے کر مجھے ہمت نے غیرت نے
جہاں کی گردشوں نے دردوغم کی راحتیں بخشیں
مری خودداریوں نے زندگی کی لذتیں بخشیں
میرے نعروں میں ہے جاہ و جلالِ جوشِ طوفانی
میری آہوں پہ بل کھاتی ہوئی موجوں کی طغیانی
مری آواز میں لاکھوں یتیموں کی دعائیں ہیں
مرے نغموں میں زنجیروں کے بجنے کی صدائیں ہیں
مری افسردہ نظروں میں نہاں دنیا کی قیمت ہے
مری چینِ جبیں پر نقش تاریخِ حقیقت ہے
مرے زخموں میں حدت زندگی کے آفتابوں کی
مری ٹھوکر میں پنہاں داستانیں انقلابوں کی
نیا نغمہ کوئی جب سانس لے لیتا ہے سینے میں
ہزاروں داغ پڑ جاتے ہیں پتھر کے کلیجے میں
چٹانوں کا جگر پھٹتا ہے اِس نغمہ سرائی سے
پگھل جاتا ہے دل آہن کا اس آتش نوائی سے
گرج گولوں کی اکثر بے اثر ہوتی ہے کانوں پر
کبھی جب نیند آ جاتی ہے توپوں کے دہانوں پر
گزر جاتا ہوں طوفاں بن کے دریا کے کناروں سے
پہاڑوں کو ہٹا دیتا ہوں آنکھوں کے اشاروں سے
زمانے بھر پہ چھا جاتا ہوں سقفِ آسماں ہو کر
اچھل جاتا ہوں جب ساحل سے موجِ بیکراں ہو کر

میں چشمہ بن کے پتھر کے شگافوں سے ابلتا ہوں
تڑپ موجوں کی بن کر سنگ ریزوں پر مچلتا ہوں
سکوں کو لا کے ہنگاموں کے پہلو میں سلاتا ہوں
نوائے تلخ سے میں سارے عالم کو جگاتا ہوں
پکڑ کر ہاتھ مسند سے اٹھا دیتا ہوں سلطاں کو
بٹھا دیتا ہوں لا کر تخت پر قیصر کے دہقاں کو
مرا جی لگ نہیں سکتا ہے شاہوں کی شبستاں میں
بنایا ہے نشیمن میں نے زخموں کے گلستاں میں
مرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خون سے سرمایہ داروں کے
حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مسلک میرا مذہب نوجوانی ہے

1936

سماج

غلط ہے یہ کہ یاں ٹوٹے ہوئے دل جوڑے جاتے ہیں
مرے نزدیک یاں لبریز ساغر توڑے جاتے ہیں
کہیں آپس میں اہل زر کے مذہب کی لڑائی ہے
کہیں کھوٹے کھرے چاندی کے ٹکڑوں کی خدائی ہے
کہیں پیری کا سحرِ خواب آور نوجوانوں پر
کہیں مذہب کا پہرا ارتقاء کے رازدانوں پر
کہیں گردن میں بھاری طوق آویزاں خطابوں کے
کہیں کندھوں کے اوپر بوجھ فرسودہ کتابوں کے
کہیں انساں کے سر پر گُرزِ آہن بادشاہت کا
کہیں پیروں کے نیچے جال شیطانی سیاست کا
قیامت ہے متاعِ آدمیت لوٹی جاتی ہے
کمر قانون کے بارِ گراں سے ٹوٹی جاتی ہے
چھپی بیٹھی ہے مکاری حریم زہدوتقویٰ میں
گناہوں کی جھلک ہے حسنِ معصومِ کلیسا میں
عیاں سفاکیاں پرہیزگاروں کی جبینوں سے
ٹپکتا ہے لہو پیرِ حرم کی آستینوں سے
ریاکاری اشارے کر رہی ہے چشمِ پرفن سے
تعصب کی صدا آتی ہے ناقوسِ برہمن سے
اخوت کی زباں محروم اندازِ تکلم ہے

بتانِ رنگ وخوں کے لب پہ زہریلا تبسم ہے
نہ جانے کیوں یہ دنیا قومیت کے راگ گاتی ہے
یہ وہ چکی ہے جس میں آدمیت پسی جاتی ہے
مظالم ڈھائے اس سرمایہ داری نے خدا بن کر
تمدن آ گیا وہم وگماں کا دیوتا بن کر
لہو چوسا مزے لے لے کے مذہب نے خدائی کا
بچھایا جال پیرانِ کہن نے پارسائی کا
نظامِ کہنہ کے کندھوں پہ اصلاحوں کے لاشے ہیں
بہت سے بت ملوکیت کے آذر نے تراشے ہیں
دھمک پیروں کے نیچے ہے گرج توپوں کی کانوں پر
گھٹائیں جنگ کی منڈلا رہی ہیں آسمانوں پر
فضا بگڑی ہوئی ہے زہر پھیلا ہے ہواؤں میں
نئی پرخاش ہے جھوٹی سیاست کے خداؤں میں
بیابانوں پہ حملہ ہے پہاڑوں پہ چڑھائی ہے
سمندر پر چھڑی ہے جنگ نہروں پر لڑائی ہے
قیامت کب تلک ڈھائیں گے یہ آفت کے پرکالے
یہ جمہوری کمیں گاہوں میں چھپ کر بیٹھنے والے
تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو
زمانہ کس قدر بیتاب ہے کروٹ بدلنے کو

1937

بغاوت

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر بغاوت ہے خدا میرا
بغاوت رسم چنگیزی سے تہذیب تتاری سے
بغاوت جبرواستبداد سے سرمایہ داری سے
بغاوت سرسوتی سے لکشمی سے بھیم و ارجن سے
بغاوت دیویوں اور دیوتاؤں کے تمدّن سے
بغاوت وہم کی پابندیوں سے قیدِ ملّت سے
بغاوت آدمی کو پیسنے والی مشیّت سے
بغاوت عزت وپندار ونخوت کی اداؤں سے
بغاوت بوالہوس ابلیس سیرت پارساؤں سے
بغاوت زرگری کے مسخ مذہب کے ترانوں سے
بغاوت عہد پارینہ کی رنگیں داستانوں سے
بغاوت اپنی آزادی کی نعمت کھونے والوں سے
بغاوت عظمتِ رفتہ کے اوپر رونے والوں سے
بغاوت دورِحاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے
بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بد دعاؤں سے

بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے
بغاوت ہاں بجز انسان کے سارے زمانے سے
بغاوت حریّت کے دیوتا کا آستانہ ہے
بغاوت عصرِ حاضر کے سپوتوں کا ترانا ہے

1937

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

انگڑائی

مسکرا کر ہاتھ اٹھا کر یوں نہ لے انگڑائیاں
دامنِ ہستی کی ہو جائیں گی لاکھوں دھجیاں
کھنچ کے آ جائے گی نیچے آسماں کی انجمن
چھوڑ دیں گی بجلیاں گھبرا کے اپنا بانکپن
رقص اپنا بھول جائے گا سنہرا آفتاب
گر پڑے گا چھوٹ کر زہرہ کے ہاتھوں سے رباب
کوئی کونپل پھر حیا سے سر اٹھا سکتی نہیں
پھر کلی بھی گلستاں میں مسکرا سکتی نہیں

1936

گذشتہ دور خواب آلودہ پیری کا سہارا ہے
شکستِ عصرِ حاضر میں ہیں مستقبل کی تعمیریں

تڑپ قطروں کی جب بڑھتی ہے موجوں میں نہاں ہو کر
پہاڑوں سے گذر جاتی ہے جوئے نغمہ خواں ہو کر

مزدور لڑکیاں

گردشِ افلاک نے گودی میں پالا ہے انھیں
سختیِ آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انھیں
گھورتی رہتی ہے گرمی میں نگاہِ آفتاب
آسماں کرتا ہے نازل ان پہ کرنوں کا عتاب
سر سے ساون کی گھٹا جاتی ہے منڈلاتی ہوئی
سرد جاڑوں کی ہوا سینوں کو برماتی ہوئی
بیکسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب
ساز ان کا سوزِ حسرت خاموشی ان کا رباب
سر سے پا تک داستانیں حسرتِ ناکام کی
نرم و نازک قہقہوں میں تلخیاں ایام کی
خشک لب پھیکی نظر مدقوق چہرے زرد گال
وہ دھنسی آنکھیں فسردہ رنگ گرد آلود بال
پپڑیاں ہونٹوں پہ زخموں کے کناروں کی طرح
گرم ہاتھوں پر عرق مدھم ستاروں کی طرح
بوجھ کا مرہونِ منت ان کے ابرو کا تناؤ
ان کا حاکم ظلم ان کا پاسباں بیجا دباؤ

ان کے ساتھی پھاوڑے ان کی سہیلی ہے کدال
زندگی پر یہ وبال اور زندگی ان پر وبال
لیکن ان کی پستیوں کو اپنی رفعت سے نہ دیکھ
ان کی غربت پر نہ جا ان کو حقارت سے نہ دیکھ
اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب
ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشمِ انقلاب
ٹھوکروں پر ان کی جھک سکتے ہیں ایوان وقصور
توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹانوں کا غرور
ان کی چوٹوں پر نکلتے ہیں پہاڑوں سے شرار
یہ اگر چاہیں الٹ ڈالیں بساطِ روزگار
بن کے قوت ایک دن ابھرے گی برسوں کی تھکن
دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظامِ انجمن

1937

سرمایہ دار لڑکیاں

شہر کے رنگیں شبستانوں کی تنویریں ہیں یہ
نوجوانی کے حسین خوابوں کی تعبیریں ہیں یہ
ہے انھیں کے دم سے مصنوعی تمدن کی بہار
ہیں یہی تہذیب کے آذرکدے کی شاہکار
دید ہی ان کی بہشتِ کیف و فردوسِ نشاط
خوش رُخ وخوش پیرہن، خوش پیکروخوش اختلاط
محفلوں کی شادمانی رقص گاہوں کا سرور
دل کے کاشانوں کی آبادی طرب گاہوں کا نور
اِک لطافت اِک نزاکت نطقِ گوہر بار کی
اِک شعاعِ نورِ شاعر کے تجلّی زار کی
اِک مُغنّی کے نفس کا نغمۂ کیف و بہار
اِک مصوّر کے قلم کی جنبشِ بے اختیار
بزم آرائی کی خو ذوقِ کم آمیزی کے ساتھ
جنبشِ مژگاں بھی اک شانِ دلآویزی کے ساتھ
گردنوں کا خم، کمر کا لوچ، سینے کا ابھار
صندلی ہاتھوں سے بت خانوں کی صبحیں آشکار

قہقہے سوئے ہوئے جذبے جگانے کے لیے
گفتگو ہر سننے والوں کو لبھانے کے لیے
بیقرار آنکھیں دلوں کو دعوتیں دیتی ہوئی
نوجوانی بار بار انگڑائیاں لیتی ہوئی
ولولے ہر ہر نفس زیر و زبر ہوتے ہوئے
دم بدم جھونکے ہوا کے تیز تر ہوتے ہوئے
سامنے اک بار آ جانا ٹھٹکنے کے لیے
نوجوانوں سے الجھ پڑنا جھجکنے کے لیے
اہرمن تو اہرمن ہو جائے یزداں بھی شکار
ان کا ہر انداز تاجر ہر ادا سرمایہ دار
عشق کے ذوقِ نظارہ نے نکھارا ہے انھیں
مرد کی صدیوں کی محنت نے سنوارا ہے انھیں
ڈوب تو سکتی ہیں یہ لیکن ابھر سکتی نہیں
یہ کنار و بوس کی حد سے گزر سکتی نہیں

اختلافِ رائے

کیوں نہیں تجھ کو گوارا مرا اظہارِ خیال!
یہ کوئی زہر بھرا جام نہیں ہے اے دوست

اختلافات سے کھلتی ہے تخیل کی گرہ
یہ بھی اک رائے ہے دشنام نہیں ہے اے دوست

کشمکش عظمتِ کردار عطا کرتی ہے
زندگی عافیت انجام نہیں ہے اے دوست

جمہوری اسپین کی طرف سے لڑنے والے ادیبوں کی موت پر

وہ نہیں ہیں نہ سہی، ان کے عمل کے جلوے
اب بھی پیشانیٔ اسپین پہ ہیں آئینہ کار
زندگی کا تو کوئی ذکر نہیں، موت بھی آج
ان شہیدوں کے لہو سے ہے گلستاں بہ کنار

1938

اِشتراکی

برہمن تجھ کو سمجھتا ہے نجس
مولوی کے لیے کافر تو ہے
توڑ دے جھوٹے خداؤں کا طلسم
صبح صادق کا پیمبر تو ہے

1938

لکھنؤ کی ایک شام

یہ مال روڈ یہ گرمی کی شام کیا کہنا
وفورِ جلوۂ دیدار عام کیا کہنا
بساطِ ارض پہ عرشِ بریں کے مہ پارے
زمیں کی گود میں ماہِ تمام کیا کہنا
دلہن کی طرح سے آراستہ دکانوں پر
جوانیوں کا حسیں اژدہام کیا کہنا
کشیدہ قامت و گل پیکر و سبک اندام
غزالِ وحشت و آہو خرام کیا کہنا
کوئی ہلال، کوئی ماہ، کوئی مہر مبیں
کوئی تمام کوئی ناتمام کیا کہنا
کسی کی شوخیِ انداز لغزشِ پا میں
ہزار ناز و نیاز و پیام کیا کہنا
کسی کی آنکھ کے ہلکے سے اک اشارے میں
شکستِ شیشہ و مینا و جام کیا کہنا
فضا میں رات کی پرچھائیوں کی بیتابی
زمیں پہ رقص کناں روحِ شام کیا کہنا
مچل رہی ہے جوانی ابل رہی ہے شراب
نگاہِ شوق ہے پھر تشنہ کام کیا کہنا

1939

انگارہ

اشک ہی اشک ہے دنیا میری
ہاں تبسم ہی تبسم تھی کبھی
اک دہکتا ہوا انگارہ ہے
وہ کہ رشکِ مہ و انجم تھی کبھی

1939

حسن کی رنگیں ادائیں کارگر ہوتی گئیں
عشق کی بیباکیاں بیباک تر ہوتی گئیں
یاں مری بہکی ہوئی نظریں بہکتی ہی رہیں
واں نگاہیں اور زیادہ معتبر ہوتی گئیں
زندگانی اپنے نشتر آزماتی ہی رہی
ان کی نظریں بخیۂ چاکِ جگر ہوتی گئیں
لب پہ ہلکے سے تبسم کی مٹھاس آتی گئی
زندگی کی تلخیاں شہد و شکر ہوتی گئیں
آرزوئیں نارسائی کا گلہ کرتی رہیں
اور وہ زلفیں زینتِ دوش و کمر ہوتی گئیں

1939

نیا زمانہ

اے دوست نیا زمانہ آیا
بہنے لگا زندگی کا دھارا

مشاطۂ عہدِ نو نے بڑھ کر
فطرت کی عروس کو سنوارا

غنچوں نے نیا لباس بدلا
کلیوں نے بھی پیرہن اتارا

لالے کے جگر کی آگ بھڑکی
نرگس نے نگہ کا تیر مارا

رنگین شفق نے گود کھولی
سورج نے افق سے سر ابھارا

انوار سحر میں ہو گیا گم
ڈھلتی ہوئی رات کا ستارا

1939

معلوم نہیں عقل کی پرواز کی زد میں

معلوم نہیں عقل کی پرواز کی زد میں
سرسبز امیدوں کا چمن ہے کہ نہیں ہے
لیکن یہ بتا وقت کا بہتا ہوا دھارا
طوفان گرد کوہ شکن ہے کہ نہیں ہے
سرمائے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے
وہ زیر افق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانیٔ افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

1939

ڈر نہ حیات و موت کے سیلِ سبک خرام سے
غلطاں ہر ایک موج میں تابش صد گہر بھی ہے

تاریخ

تری نگاہ نے دیکھا ہے مِلّتوں کا عروج
تری نظر میں فسوں کار اُمّتوں کا زوال
ترا شباب ترے بچپنے سے ہم آہنگ
تمام عمر تری داستان جنگ و جدال
خزینہ وار ہے تو ارتقائے عالم کی
ترے غلام ہیں ماضی و حال استقبال
تجھے قسم ہے انھیں تجربات پیہم کی
ادھر بھی دیکھ یہ نکلا ہے کون لے کے کدال
زمیں سے خون کا چشمہ ابلنے والا ہے
زمانہ سوز تحمل سے جلنے والا ہے

1939

آثارِ سحر

اس تجارت کے منافع کے جنوں خانے میں
لذتیں خام ہیں مجروح ہے انساں کا وقار
نہ تو ساقی ہے، نہ میکش ہے، نہ مے ہے، نہ سرور
نہ محبت، نہ حرارت، نہ تمنا ، نہ ابھار
حسن اک جنس ہے بازار میں بکنے کے لیے
عشق بہکے ہوئے مے نوش کی آنکھوں کا خمار
حدتِ شوق سے جلتی ہوئی شاعر کی جبیں
شدتِ درد سے ٹوٹا ہوا نغموں کا ستار
کٹنے والی ہیں مگر غم کی بھیانک راتیں
بام و در پر نظر آتے ہیں سحر کے آثار

1939

فضاؤں پہ اک بیخودی چھا رہی ہے
گھٹا بال کھولے ہوئے آ رہی ہے
مرے پاس آؤ تمھیں بھی سکھا دوں
وہ نغمے جو کوئل کہیں گا رہی ہے

متاعِ ہنر

بہت پُر لطیف ہے ڈھلتی ہوئی شراب کا رنگ
لطیف تر ہے نگہ کی شراب افشانی
بہت حسین ہے تاروں کی چھاؤں کا جادو
حسین تر ہے عروسِ قمر کی پیشانی
وہ ساز و بربط و نغمہ وہ کیف و بد مستی
وہ حسن و جلوہ و رنگینی و درخشانی
طلوعِ مہرِ درخشاں نمودِ صبحِ بہار
شفق کا رنگ جبینِ سحر کی تابانی
متاعِ ذوقِ نظارہ گراں نہیں لیکن
گراں ہے مجھ کو متاعِ ہنر کی ارزانی

1939

گہری بہت شکن ہے جبینِ حیات کی
یہ خط نہیں مصوّرِ رنگیں کمال کا

ابروئے کائنات پہ ہے بجلیوں کی ضو
پرتو نہیں ہے عارضِ آتش جمال کا

یہ وقت کے کھنچے ہوئے خنجر کی دھار ہے
یہ بانکپن نہیں ہے عروسِ ہلال کا

فولاد کی گرج ہے یہ آہن کا شور ہے
نغمہ نہیں ہے شاعرِ نازک خیال کا

1939

ارتقاء و انقلاب

ایک ہی قوت عطا کرتی ہے تاروں کو چمک
چاند کو تنویر سورج کا نگاہ شوخ و شنگ
کشت زاروں کو تبسم کوہساروں کو سکوت
پھول کو بو، تاک کی نبضوں کو خونِ لالہ رنگ
سرکشی طوفان کو ملاح کے بازو کو زور
کشتیٔ امید کے پتوار کے کھینے کا ڈھنگ
وقت کے شہپر کو سرعت وہم کے پرواز کی
عہد پارینہ کی فطرت کو جمودِ خشت و سنگ
زندگی کے نظمِ افسردہ کو خوئے انقلاب
مفلسی کو منعمی کی ساحری سے شوق جنگ
رقص نشتر ہو چکا اب ضربتِ کاری بھی دیکھ
ارتقائے زندگی کی تیز رفتاری بھی دیکھ

1939

اِنتظار نہ کر

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا
سرورِعشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے سازِ محبت پہ گا نہیں سکتا

میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

خراج اپنی جوانی سے لے رہا ہوں میں
سفینہ خون کے دریا میں کھے رہا ہوں میں
صدا اجل کے فرشتے کو دے رہا ہوں میں

بس اب نوازشِ پیہم سے شرمسار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

عذار نرم پہ رنگ بہار رہنے دے
نگاہِ شوق میں برق و شرار رہنے دے
لبوں پہ خندۂ بے اختیار رہنے دے

متاعِ حسن جوانی کو سوگوار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

شکستہ ساز کی ٹوٹے ہوئے سبو کی قسم
دھڑکتے دل کی ٹپکتے ہوئے لہو کی قسم
تجھے وطن کے شہیدوں کی آبرو کی قسم

اب اپنے دیدۂ نرگس کو اشکبار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

1939

جنگ اور انقلاب

رقص کر اے روحِ آزادی کہ رقصاں ہے حیات
گھومتی ہے وقت کے محور پہ ساری کائنات
زندگی مینا و ساغر سے ابل جانے کو ہے
کامرانی کے نئے سانچے میں ڈھل جانے کو ہے
اڑ رہا ہے ظلم و استبداد کے چہرے سے رنگ
چھٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے سے زنگ
ہے فضاؤں میں نوید شادمانی کا سرور
پڑ رہا ہے عشرتِ فردا کی پیشانی پہ نور
موت ہنس کر دیکھتی ہے آئینہ تلوار میں
زر پرستی کا سفینہ آ گیا منجدھار میں
خون کی بو سے مشامِ زندگی مخمور ہے
گولیوں کی سنسناہٹ سے فضا معمور ہے
یہ ہے وہ زنجیر خود ہاتھوں سے ڈھالا تھا جسے
یہ ہے وہ بجلی کہ خود خرمن نے پالا تھا جسے
تیر جو چٹکی میں تھا پیوست اب بازو میں ہے
آستیں میں تھا جو خنجر آج وہ پہلو میں ہے

آ گیا ہے وقت وہ جو آ کے ٹلتا ہی نہیں
اپنا لنگر آج اپنے سے سنبھلتا ہی نہیں
ہل چکا ہے تختِ شاہی، گر چلا ہے سر سے تاج
ہر قدم پر ڈگمگایا جا رہا ہے سامراج
ڈھل رہی ہے زرگری کی رات کے تاروں کی چھاؤں
مفلسی پھیلا رہی ہے وقت کی چادر میں پاؤں
انقلابِ دہر کا چڑھتا ہوا پارہ ہے جنگ
وقت کی رفتار کا مڑتا ہوا دھارا ہے جنگ
ہم سے خودداروں کا اس دم گیت، گانا خوب ہے
سر پھرے باغی جوانوں کا ترانا خوب ہے
غم کے سینے میں خوشی کی آگ بھرنے دو ہمیں
خوں بھرے پرچم کے نیچے رقص کرنے دو ہمیں
وقت کے پہیے کی گردش رک نہیں سکتی کبھی
عمر کی نبضوں کی جنبش رک نہیں سکتی کبھی
روحِ آزادی کو سینے میں جکڑ سکتا ہے کون؟
ناچتے سورج کی کرنوں کو پکڑ سکتا ہے کون؟

ستمبر 1939

سالِ نو

یہ کس نے فون پہ دی سالِ نو کی تہنیت مجھ کو
تمنا رقص کرتی ہے تخیل گنگناتا ہے
تصور اک نئے احساس کی جنت میں لے آیا
نگاہوں میں کوئی رنگین چہرہ مسکراتا ہے
جبیں کی چھوٹ پڑتی ہے فلک کے ماہ پاروں پر
ضیاء پھیلی ہوئی ہے سارا عالم جگمگاتا ہے
شفق کے نور سے روشن ہیں محرابیں فضاؤں کی
ثریا کی جبیں زہرہ کا عارض تمتماتا ہے
پرانے سال کی ٹھٹھری ہوئی پرچھائیاں سمٹیں
نئے دن کا نیا سورج افق پر اٹھتا آتا ہے
زمیں نے پھر نئے سر سے نیا رخت سفر باندھا
خوشی میں ہر قدم پر آفتاب آنکھیں بچھاتا ہے
ہزاروں خواہشیں انگڑائیاں لیتی ہیں سینے میں
جہانِ آرزو کا ذرہ ذرہ گنگناتا ہے

امیدیں ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں مسکراتی ہیں
زمانہ جنبشِ مژگاں سے افسانے سناتا ہے
مسرت کے جواں ملاح کشتی لے کے نکلے ہیں
غموں کے ناخداؤں کا سفینہ ڈگمگاتا ہے
خوشی مجھ کو بھی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں
مسرت کے اس آئینے میں غم بھی جھلملاتا ہے
ہمارے دور محکومی کی مدت گھٹتی جاتی ہے
غلامی کے زمانے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے
یہی انداز گر باقی ہیں اپنی سست گامی کے
نہ جانے اور کتنے سال آئیں گے غلامی کے

یکم جنوری 1940

سامراجی لڑائی

مے خانے کی رسم و راہ بدلی　　ساقی کی حسیں نگاہ بدلی
بدلے ارض و سما کے تیور　　ہیں شعلہ فشاں فضا میں خنجر
ہر سمت بپا ہے قتل و غارت　　انساں میں نہیں رہی محبت
طیارے ہیں پرفشاں ہوا میں　　بمبار گرجتے ہیں فضا میں
توپوں سے دہل رہی ہے دنیا　　اک آگ میں جل رہی ہے دنیا
شائستگی حسن کھو رہی ہے　　تہذیب کی آنکھ رو رہی ہے
بندوقوں کے شور سے ہیں پھیکے　　طاؤس و رباب کے بھی نغمے
بارود کی بو میں غرق یکسر　　پھولوں کی شمیم روح پرور
فرصت نہیں جام اور سبو کی　　قیمت نہیں موج رنگ و بو کی
ویران ہیں ساری رقص گاہیں　　چوروں سے بھری ہوئی ہیں راہیں
بے رنگ حیات زندگانی　　بے کیف شباب ہے جوانی
میدان ہے جنگ ہے جدل ہے　　سرمائے کے پیڑ کا یہ پھل ہے
شرمندہ ہیں دیکھ کر یہ لشکر　　چنگیز و ہلاکو و سکندر
مزدور کھڑا ہوا ہے گم سم　　سرمائے کے لب پہ ہے تبسم
دنیا ہے کہ تاجروں کی بستی　　مہنگی ہے حیات موت سستی
جاں بیچ کے لڑتے ہیں سپاہی　　انسان پہ آ گئی تباہی

یہ ظلم وستم کا راج کب تک
یہ تخت شہی یہ تاج کب تک

1940

عہدِ حاضر

وقت کی پلکوں پہ اِک آنسو چمکتا ہے مگر
تھرتھرا سکتا ہے عارض پر ٹپک سکتا نہیں
عمر کی بوڑھی رگوں میں نوجوانی کا لہو
دوڑتا پھرتا ہے چہرے پر جھلک سکتا نہیں
تاج انگریزی میں اک ہیرا ہے مثلِ آفتاب
ہند کے بے نور ماتھے پر دمک سکتا نہیں
چپکے چپکے کِھل رہا ہے عہدِ نو کا سرخ پھول
مسکرا سکتا ہے زیرِ لب مہک سکتا نہیں
ایک انگارا چھپا ہے زندگی کی راکھ میں
راکھ کے نیچے سلگتا ہے دہک سکتا نہیں

1940

جواہر لال نہرو کے نام

'میں انگلستان اور فرانس کی تہذیب کی تباہی نہیں برداشت کر سکتا'

نہرو

یوں تو ہنگاموں سے معمور ہے دنیا ساری
سینۂ ہند میں بھی کوئی شرر ہے کہ نہیں؟
بطنِ گیتی میں بہت نیلم و الماس و عقیق
دیکھنا بطن صدف میں بھی گہر ہے کہ نہیں؟
دھیان مجھ کو بھی ہے یورپ کی تباہی کا مگر
تم کو اپنی بھی تباہی کی خبر ہے کہ نہیں؟
کتنا گلرنگ ہے انگلینڈ کی تہذیب کا جام
اس میں کچھ ہند کا بھی خونِ جگر ہے کہ نہیں؟
رات کے ڈوبتے تاروں کا یہ ماتم کیسا
دیکھنا زیرِ افق رنگِ سحر ہے کہ نہیں؟
راکھ کا ڈھیر ہے بجھتے ہوئے انگاروں پہ
تیری اٹھتے ہوئے شعلے پہ نظر ہے کہ نہیں؟
درد ہے مادرِ ایام کے پہلو میں مگر
آمدِ طفلکِ خورشید نظر ہے کہ نہیں؟

مئی 1940

عورت کا احترام

(ایک دوست کی شکایت کے جواب میں)

کیا ہوا گر تری رنگیں رہگذر سے دور دور
زندگی کے راستوں میں پیچ و خم کھاتا ہوں میں
تو نہ جانے کیوں سمجھتی ہے کہ تجھ کو بھول کر
اپنے احساسات کی دنیا میں کھو جاتا ہوں میں
میری خاموشی پہ اکثر تمتما اٹھتی ہے تو
تیری خاموشی کا لیکن راز پا جاتا ہوں میں
چاہتی ہے مجھ سے تو نسوانیت کا احترام
اور تری انسانیت کے زمزمے گاتا ہوں میں
آہ یہ تہذیب کا جادو تمدن کا فریب
سوچتا ہوں جس قدر اتنا ہی شرماتا ہوں میں
اس نظامِ زندگی میں جس سے رسوا ہے حیات
تیری ہستی رقصِ عشرت کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنے ہونٹوں کے حسیں گلنار محرابوں سے پوچھ
ان میں بوسوں کی حرارت کے سوا کچھ بھی نہیں

تیرے ابرو کے اشاروں میں ارادہ ہے نہ شوق
تیری آنکھوں میں شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ ترے ماتھے کا ٹیکہ یہ تری زلفوں کا خم
کاروانِ رنگ و نکہت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ ترے چہرے کا غازہ یہ ترے ہونٹوں کا رنگ
عشق کی نظروں میں دعوت کے سوا کچھ بھی نہیں
تیرے اعضاء کی نزاکت تیرے پہلو کا گداز
مرد کے بستر کی زینت کے سوا کچھ بھی نہیں
میں یہ کہتا ہوں محبت زندگی کا دور ہے
تو یہ کہتی ہے محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
سوچتا ہوں اور اکثر سوچتا رہتا ہوں میں
کیا تری دنیا نزاکت کے سوا کچھ بھی نہیں
جذب کر لیتی ہے تجھ کو مرد کی جادو گری
تو کہ اک لمحے کی فرصت کے سوا کچھ بھی نہیں
اک نشاط آگیں کھلونا بن کے رہ جاتی ہے تو
جیسے تو سامانِ لذت کے سوا کچھ بھی نہیں
جب تلک تو خود نہ توڑے گی طلسم رنگ و بو
تیری قیمت ایک عورت کے سوا کچھ بھی نہیں

1940

کب تک

یہ لوہے کی سلاخیں کب تلک روکیں گی ملنے سے
یہ دیواریں رہیں گی تیرے میرے درمیاں کب تک؟
تجھے مجھ تک نہ آنے دے گا پھاٹک قید خانے کا
مجھے تجھ تک نہ جانے دیں گے آخر پاسباں کب تک؟

جواب اس کا تجھے اے دوست میں کچھ دے نہیں سکتا
زمیں پر سرنگوں ہوگا نہ انگریزی نشاں جب تک
ہمیں اس وقت تک شاید نہ ملنے کی اجازت ہو
غلام آباد کہلائے گا یہ ہندوستاں جب تک

لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل، 1940

تخریب کے دیوتا

(بھگت سنگھ کے تین ساتھی جے دیو کپور، ڈاکٹر گیا پرشاد اور شیو ورما اب تک جیل میں بند ہیں۔ مجھے کچھ دنوں ان کے ساتھ لکھنؤ جیل میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان کے سپرد باغ لگانے کا کام تھا جسے وہ بڑے شوق اور خوشی سے کرتے تھے۔ اب وہ دہشت پسند نہیں ہیں۔ تخریب ان کا مقصد زندگی نہیں بلکہ تعمیر ہے۔ وہ قومی اتحاد کی تعمیر کر کے ملک کو جاپانی درندوں سے بچانا چاہتے ہیں۔ یہ چھوٹی سی نظم میں نے جیل میں لکھی تھی۔)

حکومت آج ان پر اپنی قوت آزماتی ہے
یہ کل نکلے تھے قوت بازوؤں کی آزمانے کو
یہ دل بجھتے نہیں ہیں وقت کی ناقدردانی سے
ذرا دیکھے تو کوئی آ کے ان کے مسکرانے کو
سمجھ لیں کس طرح تخریب کا ہم دیوتا ان کو
بنا دیتی ہے گلشن جن کی محنت قید خانے کو
جو سچ پوچھو تو ایسے انقلابی نوجوانوں کی
ضرورت ہے بہت اجڑے ہوئے بنجر زمانے کو

لکھنؤ جیل، دسمبر 1940

ٹوٹا ہوا ستارہ

(انفرادیت کی شاندار ناکامی)

آ رہا ہے اِک ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار
اپنے دل کے شعلۂ سوزاں میں خود جلتا ہوا
منتشر کرتا ہوا دامانِ ظلمت میں شرار
اپنی تنہائی پہ خود ہی ناز فرماتا ہوا
شوق پر کرتا ہوا آئینِ فطرت کو نثار
کس قدر بیباک، کتنا تیز، کتنا گرم رو
جس سے سیاروں کی آسودہ خرامی شرمسار
موجۂ دریا اشاروں سے بلاتی ہے قریب
اپنی سنگیں گود پھیلائے ہوئے ہے کوہسار
ہے ہوا بے چین آنچل میں چھپانے کے لیے
بڑھ رہا کرۂ گیتی کا شوقِ انتظار
لیکن ایسا انجم روشن جبین و تابناک
خود ہی ہو جاتا ہے اپنی تابناکی کا شکار

1940

٭٭٭٭٭٭٭٭

فراموش کردند عشق

دزدیدہ نگاہوں میں محبت کی چمک ہے
قائل ہوں ہمیشہ سے ترے کیفِ نظر کا

سینے کے تلاطم سے اُبلتی ہے جوانی
درکھول دیا کس نے خمستانِ سحر کا

ہونٹوں پہ ہے بہکا ہوا ہلکا سا تبسم
اک پھول ہے شاعر کے گلستانِ ہنر کا

زلفوں کی گرہ رات کے آنچل کی شکن ہے
ماتھے پہ ہے ٹیکا کہ ستارہ ہے سحر کا

کیا مستیِ رفتار ہے کیا لغزشِ پا ہے
رقصاں ہے ہر اِک ذرہ تری راہگذر کا

اس جنتِ نظارہ کو آباد کرے کون؟
غمگین ہو جب روح تو دل شاد کرے کون؟

1940

ایک خط کا جواب

(جیل میں ایک دوست کا پہلا خط)

یہ ترا چھوٹا سا خط تیری محبت کا پیام
کر رہا ہے دل سے سرگوشی نگاہوں سے کلام

اس کی خاموشی میں ہے تیرے تکلم کی نمود
توڑ ڈالا اس نے آکر قید خانے کا جمود

آرزوئیں ناچ اٹھی ہیں دلِ بیتاب میں
کتنی قندیلیں ہیں روشن وقت کی محراب میں

لوٹ آئے ہیں پرانی زندگی کے ماہ و سال
مسکراتی ہے تمنا رقص کرتا ہے خیال

آج روحِ شادمانی کس قدر مخمور ہے
آج دل احساسِ ناکامی سے کوسوں دور ہے

جنوری 1941
بنارس سنٹرل جیل

لکھنؤ کے دوستوں کے نام

تمھیں شاید نہ ہوں اب یاد باتیں عہدِ رفتہ کی
تمہاری انجمن میں تھے تمھارے ہم زباں ہم بھی
جواں ہم بھی ہوئے تھے کھیل کر موجِ حوادث سے
پلے تھے گردشِ شام وسحر کے درمیاں ہم بھی
تمھاری طرح اپنے دامنوں میں آستینوں میں
لیے پھرتے تھے سوزِ زندگی کی بجلیاں ہم بھی
چلا کرتے تھے شانوں پر بغاوت کا علم لے کر
اٹھا لیتے تھے آسانی سے یہ بارِ گراں ہم بھی
تمھاری طرح ہم بھی نطق کے دریا بہاتے تھے
دکھا سکتے تھے اپنی قوت شرح وبیاں ہم بھی
وہ دن بھی تھے کہ ہم پرواز کرتے تھے فضاؤں میں
کبھی تھے وسعتِ گردوں کے آخر رازداں ہم بھی
ہمارے ہاتھ بھی تھے بجلیوں کے جیب و دامن پر
کچل دیتے تھے قدموں سے بساطِ کہکشاں ہم بھی
ہماری راہ میں حایل نہ تھی دیوار زنداں کی
کبھی آزادہ رو تھے صورتِ سیلِ رواں ہم بھی

دسمبر 1941، بنارس سنٹرل جیل

جیل میں ایک دوست کی موت کی خبر سن کر

اک شرر کی طرح گزرا عمر کی منزل سے تو
ہم نشیں کیا بات تھی کیوں اٹھ گیا محفل سے تو ؟
ہم سِنوں کی انجمن کس واسطے بھائی نہیں ؟
راس کیوں آب و ہوائے زندگی آئی نہیں ؟
دل کی جمعیت ترے جانے سے برہم ہوگئی
دم کے دم میں بزمِ عشرت بزمِ ماتم ہوگئی
تو نے سازِ دل پہ نغمے شوق کے گائے نہ تھے
مر گیا تو اور ابھی مرنے کے دن آئے نہ تھے
بجلیوں کی طرح لہرا کر فضا میں کھو گیا
ایک ہلکی سی جھلک دکھلا کے غائب ہو گیا

جس قدر سیماب پا تھا اس قدر پیارا تھا تو
قطرۂ شبنم تھا تو یا صبح کا تارا تھا تو ؟
مسکرایا تھا مگر آنسو بہانے کے لیے
تو وہ تارا تھا جو چمکا ٹوٹ جانے کے لیے

اے انیسِ برقِ فطرت اے رفیقِ تیز گام
مڑ کے لیتا جا اسیرانِ محبت کا سلام
میرے طاقِ دل میں اک رنگین گلدستہ ہے تو
بچپنے کی سیکڑوں یادوں سے وابستہ ہے تو
زندگی کا مکتبِ دل میں سبق لیتے تھے ہم
تاؤ طفلی کی، جوانی کی طرف کھینچتے تھے ہم
چاہے جب مکتب سے اٹھ کر بھاگ آنا یاد ہے
پھر خوشی میں ہنستے ہنستے لوٹ جانا یاد ہے
آپ لڑتے آپ ہی جھگڑا چکا لیتے تھے ہم !
اس طرح اپنی محبت آزما لیتے تھے ہم

تھی کسی کو بھی نہ ہم دونوں میں فکرِ روزگار
آہ ہم دونوں ہی تھے دلدادۂ سیرو شکار
تیز دوڑاتے تھے گھوڑوں کو تو اتراتے تھے کیا
باغ و صحرا کی ہوا کھا کھا کے لہراتے تھے کیا
زندگی بے فکریوں کی راگنی گاتی رہی !
باغِ طفلی میں جوانی کی ہوا آتی رہی
ہائے وہ خلد علی گڈھ کی پرانی صحبتیں
کھو گئی ماضی کے ویرانے میں کتنی جنتیں
قید کی تنہائیوں میں یاد آتی ہے تری
بجلیاں سی کوند جاتی ہیں نگاہوں میں مری
دل دعائیں دے رہا ہے جیل کی دیوار کو
رہ گئی آنکھیں ترس کر آخری دیدار کو
یوں تو ہے بزم جہاں میں موت قانونِ حیات
ہے تغیر ہی سے روحِ زندگانی کو ثبات
موت ہی سے زندگی کا رقص دنیا کا وجود
موت کیا ہے اک تغیرِ عناصر کی نمود
یہ وہ کہنہ مے ہے جو ہستی کے پیمانے میں ہے
موت عکس افگن جہاں کے آئینہ خانے میں ہے
موت کا غم کرکے کوئی شخص جی سکتا نہیں
موت سے گھبرا کے کوئی زہر پی سکتا نہیں
دل مگر ٹکڑے ترے نا وقت مر جانے سے ہے
غم یہ نو آراستہ زلفیں بکھر جانے سے ہے
'پھول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے'

اپریل 1941
سنٹرل جیل بنارس

ایک قیدی کی موت

اس نظارے کے تصور ہی سے دل ہے پاش پاش
اک پھٹے کمبل کے ٹکڑے پر ہے اک قیدی کی لاش
کھنچ کے آیا دل سے پتھرائی ہوئی آنکھوں میں درد
اینٹھتے ہونٹوں پہ جم کے رہ گئی اک آہ سرد
نزع کے عالم میں یوں رگڑیں زمیں پر ایڑیاں
گر گئیں کٹ کر غلامی کی پرانی بیڑیاں
چھٹ گئی قیدِ حوادث سے وہ جان بے قرار
موت نے سینے پہ اپنے لے لیا دھرتی کا بار
تھا غلام آباد میں تجھ کو نہ جینے کا دماغ
نصف شب آئی نہ تھی اور بجھ گیا تیرا چراغ
زندگی کی مٹ گئی دھندلی سی اک تصویر آج
ڈھونڈتی ہے تجھ کو اک ٹوٹی ہوئی زنجیر آج
گھر پہ تڑپاتا ہے سب کو تیرا درد انتظار
رو رہی ہے جیل اس پر چھن گیا منہ سے شکار
کوئی تجھ سے جبریہ اب کام لے سکتا نہیں
کوئی روکھے پن سے اب آواز دے سکتا نہیں

زندگانی تھی تری بے منتِ مینا و جام
عمر کی راہوں میں بے آوازِ پا تیرا خرام
تیری جانب اٹھ نہ سکتی تھی زمانے کی نظر
تو تھا اک آنسو کا قطرہ وقت کے رخسار پر
گو ترا دل شوق کی لذت سے بیگانہ نہ تھا
تو جہاں میں عزت و شہرت کا دیوانہ نہ تھا
کام تھا تجھ کو اگر کوئی تو اپنے کام سے
کوئی بھی واقف نہ تھا دنیا میں تیرے نام سے
تیرے رخ پر تربیت کی آئینہ کاری نہ تھی
تیرے لب پر علم کی سنجیدہ گفتاری نہ تھی
تو تھا دنیا کے سمندر میں وہ موجِ بے خروش
جس کے بل بوتے پہ اتراتا ہے طوفانوں کا جوش
تیری محنت پر ہمیشہ دوسروں کی تھی نگاہ
تیرا خرمن تھا ہزاروں بجلیوں کی رزم گاہ
سر سے لیکر پاؤں تک اک حسرت ناکام تھا
تیرے آئینہ میں عکس گردشِ ایام تھا
تو نے آخر ختم کر دی داستانِ زندگی
تنگ ہے محکوم قوموں پر جہانِ زندگی
آج خونی موت کے پنجے میں تو مجبور ہے
لیکن انگریزی حکومت کی حدوں سے دور ہے

بنارس سنٹرل جیل

1941

زندگی

گردشِ چرخ و دورِ جام بھی ہے
تیز رو بھی، سبک خرام بھی ہے
ارتقاء میں ہے انقلاب کا راز
زندگی رقص بھی ہے گام بھی ہے

1941

عذرواعتراف

سبک ہے مثلِ نسیمِ سحر خرام ترا
لطیف خندۂ گل کی طرح کلام ترا
میرے لیے ہے بہت خاص لطفِ عام ترا
پیامِ شوق ہے دل کے لیے سلام ترا
خوشی کی دیکھنے والی مرا ملال بھی دیکھ
گزر رہے ہیں جو پھیکے وہ ماہ و سال بھی دیکھ

تجھے پسند تھے جو گیت وہ میں گا نہ سکا
ترے خیال کی رعنائیوں پہ چھا نہ سکا
جو دل کی بات تھی بھولے سے بھی بتا نہ سکا
میں تیرے جلوۂ رنگیں کی تاب لا نہ سکا
لگاؤ تھا مجھے لیکن جتا نہ سکتا تھا
متاعِ حسن و محبت گنوا نہ سکتا تھا

شکستِ حسن کا جذبہ جگا دیا میں نے
بجھا ہوا تھا جو شعلہ جلا دیا میں نے
اک انتقام کا طوفاں اٹھا دیا میں نے
چھلکتا جام زمیں پر گرا دیا میں نے
ترا عتاب بڑھا دل کو اور پیار آیا
غرورِ وینس و ہیلن[1] کا اعتبار آیا

1941

---

1. وینس یونانی دیو مالا میں حسن و محبت کی دیوی۔ ہیلن یونان کی ایک مشہور خوبصورت عورت۔

تغیر

(ایک دوست کے نام)

ہر چیز بدل رہی ہے ہر دم !
جو چھاؤں ہے ڈھل رہی ہے ہر دم

جو صبح ہے شام ہو رہی ہے
ہر رات تمام ہو رہی ہے

پانی سے سحاب اٹھ رہا ہے
موجوں سے حباب اٹھ رہا ہے

پتھر سے ابل رہے ہیں چشمے
چشموں سے نکل رہے ہیں نغمے

قطروں سے گہر گہر سے لڑیاں
لمحات سے بن رہی ہیں گھڑیاں

سو رنگ بدل رہی ہے تصویر
تخریب سے ہو رہی ہے تعمیر

ہر سمت برستی ہیں گھٹائیں
رخ اپنا بدلتی ہیں ہوائیں

بجھ جاتے ہیں آسماں کے تارے
کھو جاتے ہیں ناچ کر شرارے

گھٹ جاتی ہے دوست کی محبت
بڑھ جاتی ہے زندگی کی لذت

ہاں اصل ثبات ہے تغیر
قانونِ حیات ہے تغیر

ہر چیز بدل رہی ہے ہمدم
گر تو بھی بدل گئی تو کیا غم

1941

ترقی پسند مصنفین

آگ محفل میں غلاموں کی لگا دیں اے دوست
دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کر دیں
گائیں ٹوٹے ہوئے بربط پہ ترانے دل کے
بزم کو اپنی نواؤں سے غزل خواں کر دیں
کعبہ و دیر و کلیسا کی بجھا دیں قندیل
ہر طرف مشرق و مغرب میں چراغاں کر دیں
توڑ دیں وہم نے پہنائی تھیں جو زنجیریں
آگیا وقت کہ اب وادیِ زنداں کر دیں
ڈال دیں وقت کی افسردہ نگاہوں میں نگاہ
عہدِ پارینہ کو اک خوابِ پریشاں کر دیں
رنگ خوں بھر کے بنائیں وہ نئی تصویریں
کاوشِ مانی و بہزاد کو حیراں کر دیں
چھین لیں ہاتھ بڑھا کر مہ و پرویں سے چمک
ہند کی خاک کے ذروں کو درخشاں کر دیں
مسندِ عیش سے شاہوں کو اٹھا دیں چل کر
مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کر دیں

کب تلک راہ کے کانٹوں سے بچائیں گے قدم
ان کو تھوڑا سا لہو دے کے گلستاں کر دیں
اب نظر پھیر لیں ایران کے گلزاروں سے
نگہ شوق کو کشمیر بداماں کر دیں
دے کے احساس نیا ہند کے مہ پاروں کو
حسن یوسف کو چراغ تہ داماں کر دیں
داستاں وامق و عذرا کی بھلا دیں دل سے
شوق کی جنس گراں مایہ کو ارزاں کر دیں
عام ہو غالب و اقبال کی رعنائی فکر
بے زبانوں کو زباں دے کے زباں داں کر دیں
کھول دیں سب کے لیے قفل در میخانہ
حضرت جوش کو سر حلقۂ رنداں کر دیں

1941

زمانۂ ماقبل تاریخ کے انسان کا ذہنی تجزیہ

مسکراتے ہیں مناظر رقص کرتے ہیں نجوم !
گنگناتی ہیں چٹانیں گا رہے ہیں آبشار
چھن رہا ہے ابر کے پردے سے نورِ آفتاب
اور فضا میں پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی سی پھوار
وقت کے میلے بدن پر دھاریاں ہیں نور کی
تھرتھراتے ہیں ہوا میں سینکڑوں چاندی کے تار
عارضِ گلرنگ پر صبحِ تمدن کی نمود !
گود میں تہذیبِ انسانی کا طفلِ شیر خوار
آنکھ میں ماضی کا جادو رخ پہ مستقبل کا نور
انکھڑیوں میں ارتقاء کے جامِ رنگیں کا خمار
اپنے سینے میں لیے انسان کے سینے کا جوش
دوش پر اپنے اٹھائے فکرِ انسانی کا بار
ٹوٹتی ہے کیوں شعاعِ مہرِ تاباں کی کمند
شب اٹھا لیتی ہے کیوں ناہید و پرویں کا ستار؟
رات کے ڈھلتے ہی پڑ جاتی ہے پھیکی چاندنی
صبح ہوتے کیوں بکھر جاتا ہے تاروں کا غبار؟

جھوم کر اٹھتی ہے کیوں اودی فضاؤں میں گھٹا
کوہ و صحرا پر برس جاتا ہے کیوں ابرِ بہار ؟
کیوں پلٹ جاتا ہے موسم کیوں بدل جاتی ہے رُت؟
کھیلتی ہے کیوں خزاں کی گود میں فصلِ بہار ؟
موت اڑا لیتی ہے کیوں رنگین رخساروں کا رنگ ؟
ہے اجل کی نیند کا کیوں چشمِ ہستی میں خمار ؟
رات کو ہوتا ہے کیوں بھولے مناظر کا ہجوم ؟
خواب میں پیشِ نظر رہتی ہے کیوں تصویرِ یار ؟
ذہن کی تاریکیوں میں جلوہ فرما کون ہے ؟
کس کے نغمے ہیں سرود زندگی پر بے قرار ؟
زیر دامانِ افق سے پھول برساتا ہے کون ؟
کون ہوتا ہے شفق کے رنگ میں آئینہ کار ؟
کون سوتا ہے ردائے برف میں لپٹا ہوا ؟
کوہ کی چوٹی ہے کس دوشیزہ سینے کا ابھار ؟
آندھیوں سے اس طرح سرگوشیاں کرتا ہے کون؟
گونجتی ہے وادیٔ کہسار میں کس کی پکار ؟
کس کی ہیبت ہے کہ گیتی کا دہل جاتا ہے دل ؟
'کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار'
آسماں پر ہے یہ کس کے تازیانوں کی صدا؟
آرہا ہے کون یہ بادل کے گھوڑے پر سوار ؟
اٹھ رہا ہے کیوں پہاڑی کے کلیجے سے دھواں
ناچتا ہے کون یہ پہنے ہوئے شعلوں کے ہار
الاماں اے عالمِ فطرت کی ارواحِ عظیم
ہے حدِ ادراک سے باہر تمہارا اقتدار

ہے عناصر میں تمہارے حسن و ہیبت کی نمود
آتش و آب و ہوا پر ہے تمہارا اختیار
تم وہاں رہتی ہو انسانی تخیل سے پرے
جس جگہ جھک کر زمیں کو آسماں کرتا ہے پیار
اور لائے ہیں تمہاری بارگاہ ناز میں !
خوف کے مارے ہوئے مجبور انسانوں کی ہار
دیکھ کر انساں کی پستی وقت بھی تھرا گیا
ارتقاء کے نرم ماتھے پر پسینہ آگیا
آہ اے ناداں خیالی دیوتاؤں کو نہ پوج
ذہن میں بنتے ہیں جو ایسے خداؤں کو نہ پوج
جو برستے ہیں یہاں بھی اور وہاں بھی ہم نشیں
ایسے آوارہ طبیعت بے وفاؤں کو نہ پوج
ہوں مرادیں اپنی ان گونگی چٹانوں سے نہ مانگ
قدر کر اپنے ارادوں کی دعاؤں کو نہ پوج
پوجنا ہے پوج اپنی فطرت آزاد کو !
مشرق و مغرب کی آوارہ ہواؤں کو نہ پوج
گود میں سمٹی ہوئی رعنائیوں کو چھوڑ کر !
وادئ و کہسار کے رنگیں اداؤں کو نہ پوج
بھول کر اپنے سرودِ لذتِ گفتار کو
آسماں میں گونجنے والی صداؤں کو نہ پوج
یہ خدا یہ دیوتا دو روز ہی رہ پائیں گے
جہل سے پیدا ہوئے ہیں علم سے مر جائیں گے

1942

اکیلا ستارہ

افق کے کونے میں اک اکیلا ستارہ یوں جگمگا رہا ہے
کہ کوئی جیسے غموں کی یورش میں زیرِ لب مسکرا رہا ہے

فضاؤں کے سرمئی دھندلکے میں شامِ تحلیل ہو رہی ہے
ہوا میں اڑتا ہے شب کا آنچل اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا ہے

ٹپک پڑا ہے اندھیری شب کی سیاہ پلکوں سے ایک آنسو
شفق کے رخسار سے ڈھلک کر زمیں کے دامن میں آ رہا ہے

پہاڑ کی سر بلند چوٹی سے کوئی دیوی اتر رہی ہے
سنہری وادی میں کوئی بیٹھا ستار اپنا بجا رہا ہے

حیات کے زعفران زاروں میں اک کلی مسکرا اٹھی ہے
مہک رہا ہے ہوا کا دامن، فضاؤں کو وجد آ رہا ہے

گلاب کی پنکھڑی پہ شبنم کا ایک قطرہ لرز رہا ہے
جوان آغوش میں پہونچ کر کوئی حسیں تلملا رہا ہے

1942

خیر مقدم

مبارک ہو کہ وہ غمخوارِ جانِ بے قرار آیا
سوادِ لکھنؤ میں آہوئے دشتِ تتار آیا
نگارِ نو بہار و نو بہارِ گل عذار آیا
چمن ہے رنگ ساماں رنگ سامانِ بہار آیا
عنا دل سے کہو گائیں ترانے خیر مقدم کے
بہاروں کو خبر دو مطربِ سازِ بہار آیا
دلِ بے تاب کی تسکین کو پہلے خبر آئی
بڑی مدت کے بعد آخر وہ جانِ انتظار آیا
جسے سمجھا تھا دل نے دشمنِ تمکین و ہوش اب تک
سکونِ روح و دل بن کر وہ یارِ غمگسار آیا
ادا کی برق چمکی زلف پیچاں کی گھٹا برسی
اودھ کے میکدے کی سمت ابرِ کوہسار آیا
ہوائے شوق سے کھلنے لگیں کلیاں تبسم کی
نویدِ موسمِ گل مژدۂ فصلِ بہار آیا
رگوں میں خون بن کر لذتوں کی بجلیاں دوڑیں
نگہ میں لوٹ کر شبہائے عشرت کا خمار آیا
سنا کرتے تھے حسن وینس و ہیلن کے افسانے
جمالِ وینس و ہیلن کا آخر اعتبار آیا

1942

سرِ راہ

یہ کون ہے جس کی زلفوں سے گھنگھور گھٹائیں لپٹی ہیں
بجلی سی چمکتی ہے لیکن بجلی سے حیائیں لپٹی ہیں

اک لرزش سی ہے قامت میں، اک شعلہ سا تھرّاتا ہے
ہر گام پہ عشوے رقصاں ہیں، عشووں سے ادائیں لپٹی ہیں

مشرق سے نکلتے سورج کا ہوتا ہے گماں پیشانی پر
اس تابش رخ کا کیا کہنا، آنچل، سے شعاعیں[1] لپٹی ہیں

یہ جسم کی خوشبو ہے کہ مہک بیلے کی چٹکتی کلیوں کی
پیراہن رِنگیں سے شاید جنت کی ہوائیں لپٹی ہیں

ابرو کی کمانیں کھنچتی ہیں جنبش سی ہے تیرِ مژگاں میں
اس تیر سے کس کس کے دل کی مایوس دعائیں لپٹی ہیں

1942

---

1 میں اس قافیے کو جائز سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک قافیے کا تعلق سماعت سے ہے نہ کہ حرف تہجی سے۔

فاشسٹ دشمن سپاہیوں کا گیت

بگل کی سریلی صدا آ رہی ہے
شرو(ع) ہو گئی ہے ہماری لڑائی
حکومت کی بنیاد ہلنے لگی ہے
حکومت کی ہم کیوں کریں گے گدائی ؟

غریبوں کے گھر میں جنم ہم نے پایا
مصیبت کی گودوں کے پالے ہوئے ہیں
مگر توپ بندوق تلوار نیزے
یہ سب اپنے ہاتھوں کے ڈھالے ہوئے ہیں

یہ دھن اور دولت پہ قبضہ ہے جن کا
انھیں آسماں پر بٹھایا ہے ہم نے
وہاں آج ان سب کو جھکنا پڑے گا
جہاں کل تلک سر جھکایا ہے ہم نے

چلو آج کمزور ہاتھوں سے اپنے
غلامی کے زنداں کی دیوار ڈھا دیں
رہے فرق باقی نہ روس و حبش میں
حدیں چین و ہندوستاں کی ملا دیں

گرا آسماں سے اندھیرے کا پرچم
کٹی رات اب ہو رہا ہے سویرا
ہواؤں میں اک لہر سی دوڑتی ہے
وہ دیکھو کھلا انقلابی پھریرا

(ماخوذ)
(اگست1942)

تاجکستان کا ایک گیت

(تاجکستان سویت یونین میں ایک آزاد مسلم جمہوریت ہے۔ یہ گیت
1917 کے انقلاب کے بعد وہاں کے ایک شاعر نے لکھا تھا)

اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا
راہ میں تیرے لیے سنگ گراں ہیں لاکھوں
تاجکستان کے پیڑوں کی گھنی چھاؤں میں
نیزۂ و خنجر و شمشیر و سناں ہیں لاکھوں

اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا
بیلیں انگوروں کی زنجیر لیے بیٹھی ہیں
مرد شمشیر بہ کف تیری پذیرائی کو !
عورتیں جذبہ تحقیر لیے بیٹھی ہیں

اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا
کوہساروں کی بلندی کو جلال آئے گا
سنگریزوں کے کلیجے سے دھواں اٹھے گا
اور دریاؤں کے سینے میں ابال آئے گا

(ترجمہ)

1942

ایک نابینا ترکمان شاعر کی نظم

(ترکمانیہ سویت یونین کی ایک آزاد مسلم جمہوریت ہے۔ ذیل کی نظم وہاں کے ایک نابینا شاعر کرم علی کی لکھی ہوئی ہے۔ انقلاب سے پہلے اس ترکمان شاعر کی قوم زارِ روس کی غلامی میں گرفتار تھی۔ انقلاب کے بعد آزاد ترکمان قوم نے اپنی خود مختار ریاست بنالی جو سویت دفاق سے وابستہ ہے اسی لیے کرم علی نے روس کے 1917ء کے انقلاب کو بڑی محبت سے اپنی آنکھوں کی بینائی سے تعبیر کیا ہے۔)

آسماں پر آج بادل کا نشاں ملتا نہیں
صبح کی شاداب کرنوں سے فضا آباد ہے
سایہ افگن اب نہیں دن، پر اندھیرا رات کا
زار کے پنجے سے اب یہ سرزمیں آزاد ہے
زندہ باد اے بالشیوک انقلابی زندہ باد

تم نے ظالم حکمرانوں کو کچل کر رکھ دیا
دشمنوں سے مل گئی مظلوم قوموں کو نجات
آج ہم بھی ہیں تمھاری کامرانی میں شریک
شاخِ آہو پر نہیں ہے اب غریبوں کی برات
زندہ باد اے بالشیوک انقلابی زندہ باد

وہ کرن پھوٹی وہ نکلا عہدِ نو کا آفتاب
آج میرے دیدۂ بے نور میں نور آگیا
اٹھ رہی ہے میرے دل میں شادمانی کی ترنگ
چھا گیا عہدِ غلامی پر اندھیرا چھا گیا
زندہ باد اے بالشیوک انقلابی زندہ باد

(ترجمہ) 1942

بنگال

آبروئے ملک و ملت کے نگہبانوں اٹھو
شمع جان افروز آزادی کے پروانوں اٹھو
حریت کے پاسباں عزت کے دیوانے اٹھو
مادر ہندوستاں کے دل کے ارمانوں اٹھو
ناز ہے تلوار کو جس پر وہ بازو ہو تمہیں
وہ بہادر بھیم وہ خوددار ٹیپو ہو تمہیں

آج ہے بدلا ہوا رنگ مزاج روز گار
کرگسوں کی طرح منڈلاتی ہے روح انتشار
آہ وہ بنگال وہ حسن و محبت کا دیار
ہو گیا غیروں کی دیرینہ سیاست کا شکار
اِس مصیبت میں اگر اپنے بھی بیگانے رہے
'فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے'

جس افق سے روز ہوتا ہے طلوع آفتاب
جس نے پالی اپنے گہوارے میں روح انقلاب
جس کے فرزندوں نے دی تحریک آزادی کو آب
جس حسیں وادی میں شادابی بجاتی تھی رباب
آج اِس میں قحط ہے آلام ہیں ادبار ہے
زندگی سے آج اس کا ہر نفس بیزار ہے

تم ابھی الجھے ہو بحث اندک و بسیار میں
اور وطن ہے صید دامِ سکہ و دینار میں
ایک سکتے کا سا عالم ہے درو دیوار میں
جسم کس کے بک رہے ہیں کوچہ و بازار میں
چند ٹکڑوں کے لیے جھانسی کی رانی بک گئی
آبرو مریم کی سیتا کی جوانی بک گئی

بستیوں میں گاؤں میں شہروں میں لہراتی ہے موت　　جس طرف دیکھو اسی جانب نظر آتی ہے موت
چھین کر ماؤں سے بچوں کو لیے جاتی ہے موت　　زندگی ہے سرنگوں اور ناز فرماتی ہے موت
گاؤں ویراں ہو گئے ہر جھونپڑا سنسان ہے
خطۂ بنگال ہے یا ایک قبرستان ہے

دھنس گئیں ہیں بھوک سے آنکھیں لٹک آئے ہیں گال　　ہڈیوں پر خشک چمڑے کی طرح لپٹی ہے کھال
ماؤں کے دکھتے ہوئے شانوں پہ بچے ہیں نڈھال　　جانور سے بھی ہے بدتر آج انسانوں کا حال
جھونپڑے جن کے تھے کل تک مرغزاروں کے قریب
آج وہ دم توڑتے ہیں رہگزاروں کے قریب

سیکڑوں سوتی ہوئی لاشوں سے اٹھتا ہے بخار　　میتیں ہیں بے کفن چادر اڑھاتا ہے غبار
چھاتیاں ماؤں کی جن سے دودھ کی بہتی تھی دھار　　بے بسی سے آج ان کو چوستے ہیں شیر خوار
رینگ کر لاشوں سے ہٹ جائیں یہ طاقت بھی نہیں
ان میں انسانوں کی ہلکی سی شباہت بھی نہیں

1

شوق بھی زخمی ہے زخمی ہے دل بیتاب بھی　　ساز بھی ٹوٹا ہوا ٹوٹی ہوئی مضراب بھی
اس بھیانک خامشی کے درمیاں گائے گا کون؟
اس اندھیرے میں چراغ طور دکھلائے گا کون؟

مشعلِ امید سینوں میں جلا سکتے ہو تم　　قحط کی اور موت کی گردن دبا سکتے ہو تم
نیند کے ماتے جوانوں کو جگا سکتے ہو تم　　خود مسیحا بن کے مُردوں کو جلا سکتے ہو تم
زندگی کرتی ہے جب یورش تو گھبراتی ہے موت
زندگی سے بھاگنے والوں پہ چھا جاتی ہے موت

---

1 اس بند کے شروع کے دو مصرعے اصل مجموعے میں نہیں ہیں۔

اک طرف دیوِ حکومت گردنوں پر ہے سوار　　　اک طرف جاپان کا لشکر قطار اندر قطار
اور اس حالت میں ہندوستان فاقوں کا شکار　　　ہوشیار اے مردِ میدانِ سیاست ہوشیار
ایک ہو جاؤ کہ دم سینوں میں گھٹ جانے کو ہے
قوم کا سرمایۂ اخلاق لٹ جانے کو ہے

متحد ہو کر اٹھو جس طرح دریا میں ابال　　　متحد ہو کر بڑھو جس طرح صحرا میں غزال
متحد ہو کر اڑو جس طرح شاعر کا خیال　　　متحد ہو کر چلو مانند بادِ بر شگال !
پھر بہار آجائے شاخِ آرزو پھلنے لگے
کھیتیاں شاداب ہو جائیں ہوا چلنے لگے

(اکتوبر 1943)

لینن

دوستوں کے لیے الفت کی زباں ہے لینن
دشمنوں کے لیے شمشیر سناں ہے لینن
رگِ مزدور میں خوں بن کے رواں ہے لینن
دل پہ سرمائے کے اک سنگِ گراں ہے لینن
کشتِ دہقاں کے لیے بادِ بہاری کا پیام
شہریاری کے لیے برقِ تپاں ہے لینن
سرخ فوجوں کے تجمل میں جھلک ہے اس کی
نوجوانوں کے ارادوں میں جواں ہے لینن
جس نے ہر قوم کو ہر ملک کو سیراب کیا
سرخ میخانے کا وہ پیرِ مغاں ہے لینن
جس کی ہر بات ہے تفسیر حیات ِابدی
جس کو ہر شخص نے سمجھا وہ زباں ہے لینن
جس پہ شاہد ہے سمرقند و بخارا کا شکوہ
وہ ہنر مند وہ معمارِ جہاں ہے لینن
ظلمت آبادِ غلامی کے بیابانوں میں !
مشعلِ راہ یقیں سنگِ نشاں ہے لینن
ہٹلریت کے نشاں جس سے جھکے جاتے ہیں
حریت کا وہ سر افراز نشاں ہے لینن

1943

غالب

آسمانوں کی بلندی کو بلا کا ناز تھا
پست ہمت جس سے ذوقِ رفعتِ پرواز تھا
رہگزار ماہ و انجم تک کوئی جاتا نہ تھا
کوئی شاخِ کہکشاں پر بیٹھ کر گاتا نہ تھا
عرش پر جبریل کا دمساز ہو سکتا تھا کون
طائرِ سدرہ کا ہم آواز ہو سکتا تھا کون
جو لگا دے آگ کوئی نغمہ زن ایسا نہ تھا
تجھ سے پہلے کوئی داوٗدِ سخن ایسا نہ تھا
تو نے چھیڑے ہیں وہ نغمے شاعری کے ساز پر
لحنِ داوٗدی کو رشک آئے تری آواز پر

تیرا بربط کہکشاں، ناہید ہے تیرا رباب
آسماں کیا ہے ترے بحرِ تخیل کا حباب
تیرا نغمہ ساحری، تیرا بیاں پیغمبری
تیرے قبضہ میں ہے اقلیم سخن کی داوری

تیری فکرِ نکتہ رس حسنِ تخیل کا شباب
شعر تیرا معجزہ تیری کتاب ام الکتاب
وہ صداقت ،وہ حقیقت ،وہ جمالِ برق پاش
زندگی جس کے لیے قرنوں سے سرگرم تلاش
وہ صداقت عکس افگن ہے تری تقریر میں
وہ حقیقت جلوہ فرما ہے تری تحریر میں

حسن کے جلووں سے جب محروم ہو جاتے ہیں ہم
کِذب کے ظلمت کدے میں جا کے کھو جاتے ہیں ہم
جب کہ ہوتا ہے 'شب غم' میں 'بلاؤں کا ہجوم'
جب نگاہیں پھیر لیتے ہیں مہ و مہر و نجوم
شعر تیرے جگمگا اٹھتے ہیں اس ظلمات میں
جس طرح جگنو چمکتے ہیں بھری برسات میں

تو نے دل کو گرم سینوں کو فروزاں کر دیا
روح کو روشن ،دماغوں کو چراغاں کر دیا
تو مثالِ شمع ماضی کے سیہ خانے میں ہے
نور تیرا حال و مستقبل کے کاشانے میں ہے
تیرے گلشن کی بدولت گل بداماں ہم بھی ہیں
تیرے نغموں کے اثر سے نغمہ ساماں ہم بھی ہیں

1944

اقبال

زندگی کے نغمہ گر نے آج چھیڑا ہے رباب
حلقۂ ذوقِ سخن سے اٹھ کے جا سکتا ہے کون ؟
حسن نے خود اپنے چہرے سے الٹ دی ہے نقاب
ہم بھی دیکھیں تاب اب محفل میں لا سکتا ہے کون؟
بہہ چلا ہے چشمۂ خورشید سے سیلابِ نور
اس اجالے میں چراغ اپنا جلا سکتا ہے کون ؟
چاند کے ماتھے پہ افشاں چننے والا کون ہے ؟
صبح کے سورج کو آئینہ دکھا سکتا ہے کون ؟
کون دستِ نو عروسِ گل پہ باندھے گا حنا
چشمِ نرگس میں بھلا کاجل لگا سکتا ہے کون ؟
کون دے گا آہوئے تاتار کو درسِ خرام
رقص کرنا ماہ و انجم کو سکھا سکتا ہے کون ؟
گرچہ خالی گردشِ ساغر سے میخانہ نہیں
چشمِ ساقی کا فسوں محتاجِ پیمانہ نہیں

ناتوانوں کو عطا کی قوتِ ضربِ کلیم
تو نے بخشے ملتِ بے پر کو بالِ جبرئیل
رند کیا ساقی بھی جس محفل میں پیاسا تھا وہاں
بھر کے لایا دل کے پیمانے میں موجِ سلسبیل
کچھ نہیں تھا جس بیاباں میں بجز موجِ سراب
آج وہ ہے رہگزار دجلہ ودینوب و نیل
آذرانِ عصرِ حاضر کے صنم خانوں میں آج
گونجتا ہے تیرے دم سے نغمۂ سازِ خلیل
زندگی دشوار تر کر دی غلامی کے لیے
کھینچ دی اس طرح آزادی کی تصویرِ جمیل
خواب کے آغوش سے بیداریاں پیدا ہوئیں
زندگی کی راکھ سے چنگاریاں پیدا ہوئیں

چلمنیں اٹھتی ہیں مشرق کی حریم ناز سے
منتظر تھیں جس کی آنکھیں جلوہ گر ہونے کو ہے
خونِ شب سے گل بداماں ہے شفق زارِ وجود
آسماں پر نور سا پھیلا سحر ہونے کو ہے
کتنے آنسو بہہ چکے ہیں زندگی کی آنکھ سے
آج ان اشکوں کا ہر قطرہ گہر ہونے کو ہے
ارتقا ہے اس کا جادہ اس کی منزل انقلاب
کاروانِ شوق سرگرم سفر ہونے کو ہے

گلشنِ ہندستاں میں لوٹ آئی ہے بہار
آرزو کی شاخِ نازک بارور ہونے کو ہے
سبز پرچم کے افق پر مسکراتا ہے ہلال!
باعثِ صد نازشِ شمس و قمر ہونے کو ہے
کھل گیا در، پڑ گیا دیوارِ زنداں میں شگاف
اب قفس میں جنبشِ صد بال و پر ہونے کو ہے
سرخ شعلہ ہو گیا ہے آسمانوں تک بلند
فاشِ رازِ شوخیٔ برق و شرر ہونے کو ہے
جس کا چہرہ تھا غریبوں کے لہو سے تابناک
وہ نظامِ کہنہ اب زیر و زبر ہونے کو ہے
'آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پر آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی'

1944

خوشی

اجنتا کے پرانے اور پُر اسرار غاروں سے
اندھری رات میں اکثر وہ دوشیزہ نکلتی ہے
مسیح و خضر و گوتم کو رہی ہے جستجو جس کی
زمانے نے ہزاروں سال کی ہے آرزو جس کی
جبیں پر جس کی صبحِ نو کی تابانی مچلتی ہے
ازل کی تابشِ سیمیں ہے ہالہ اس کے چہرے کا
کفِ دستِ حنائی پر ابد کی شمع جلتی ہے
مغنی کے نفس کا زیر و بم ہے سوز و ساز اس کا
نوائے شاعرِ رنگیں کے پردے میں ہے راز اس کا
وہ مے احساس کے گلرنگ پیمانے میں ڈھلتی ہے
شعاعِ نور بن کر مسکراتی ہے فضاؤں میں
وہ چشمہ بن کے کہساروں کے سینے سے ابلتی ہے
ہمالہ کی بلندی میں ہے ہلکا سا نشاں اس کا
فرازِ آسمانِ نیلگوں ہے رازداں اس کا
وہ ماہ و انجم و خورشید کی راہوں پہ چلتی ہے

بکھر جاتی ہے عارض پر تبسم کی کرن بن کر
کسی کی آنکھ سے اشکِ محبت بن کے ڈھلتی ہے
حق و باطل کے پیکاروں میں اس کا بول بالا ہے
مجاہد کی جبیں پر اس کے پرتو سے اجالا ہے
وہ نیزوں اور تلواروں کے سائے میں نکلتی ہے
کبھی آوارہ نکہت بن کے اڑتی ہے ہواؤں میں
کبھی موجِ شرابِ ارغواں بن کر مچلتی ہے
جہاں رہتی ہے نقش و رنگ میں مستور رہتی ہے
بہشت نغمہ و آہنگ میں اک حور رہتی ہے
شبستانِ تخیل میں کنول کی طرح جلتی ہے
عناصر کا توازن ہی تو ہے سازِ بہار اس کا
جہانِ آب و گل میں گنگناتا ہے ستار اس کا
معطر ہے مشامِ روح دامن بھر نہیں سکتا
کوئی اس پھول کو زیبِ گریباں کر نہیں سکتا

1944

حسنِ ناتمام

کس قدر شاداب و دلکش ہے وہ حسنِ ناتمام
جس کی فطرت غنچگی، دوشیزگی ہے جس کا نام
جس طرح پچھلے پہر کا صاف و پاکیزہ افق
جس کے سینے میں ابھی پہلی کرن پھوٹی نہیں
جس طرح اک کھلنے والی ناشگفتہ سی کلی!
جس کے دامن تک ابھی بادِ سحر پہنچی نہیں
برگِ گل پر جس طرح شبنم کی اک ننھی سی بوند
جو شعاعِ مہر تاباں سے ابھی الجھی نہیں
جس طرح ساغر میں صہبا جیسے مینا میں شراب
جو ابھی مچلی نہیں، چھلکی نہیں، ابلی نہیں
جس طرح اک شوخ بجلی بادلوں کی آڑ میں
جو ابھی تڑپی نہیں، چمکی نہیں، ٹوٹی نہیں
جس طرح گیسوئے پیچاں، جیسے زلف خم بہ خم
جو ابھی کھل کر ہوا کے دوش پر مہکی نہیں
جس طرح دریا میں موتی جیسے موجوں میں صدف
چشم انساں نے ابھی جن کی چمک دیکھی نہیں

جیسے ذہنِ پاک شاعر میں تخیل کی پری
جو ابھی تک شیشۂ الفاظ میں اتری نہیں
جس طرح آنکھوں میں ہلکے سے تبسم کی جھلک
جو کرن بن کر لب ورخسار پر بکھری نہیں
اب تلک یوں ہی اچھوتا ہے وہ حسنِ ناتمام
جس کی فطرت غنچگی ، دوشیزگی ہے جس کا نام

1944

جھلک

صرف لہرا کے رہ گیا آنچل — رنگ بن کر بکھر گیا کوئی
گردشِ خوں رگوں میں تیز ہوئی — دل کو چھو کر گزر گیا کوئی
پھول سے کھل گئے تصور میں
دامنِ شوق بھر گیا کوئی

1944

عورت

صدف کو خوبیِ قسمت سے تو جو مل جاتی
صدف کے سینۂ روشن میں اک گہر ہوتی
ترا نزول جو ہوتا سوادِ گلشن میں
نہالِ فصلِ بہاراں کا اک ثمر ہوتی
گر ہواؤں کے آغوش میں جگہ پاتی
تو رقصِ شعلہ و بیباکیِ شرر ہوتی
زمیں پہ ٹوٹ کے گرتی نہ آسماں سے اگر
ندیم چاند کی، تاروں کی ہم سفر ہوتی
اندھیری شب کو میسر نہیں جمال ترا
نہیں تو رات سحر سے حسین تر ہوتی
جو بحر پر ترے آنچل کی چھاؤں پڑ جاتی
تو موجِ بحر کے شانوں پہ زلفِ تر ہوتی
حیات نے تجھے عورت کا مرتبہ بخشا
نہیں تو شمعِ افق مشعلِ سحر ہوتی
عطا کیا ہے محبت کا اک جہاں تجھ کو
بنایا فطرتِ آدم کا رازداں تجھ کو

1944

محبت کا فسوں

شوق ناکام سہی، پھر بھی محبت کا فسوں
زلف بردوش و جنوں خیز و جواں ہے اے دوست
ابرِ غم میں مری خوشیوں کا سفینہ اب بھی
کشتیِ ماہ کی مانند رواں ہے اے دوست
جرأت و شوق کی جس راہ سے ہم گزرے ہیں
اس کا جو ذرہ ہے وہ کاہکشاں ہے اے دوست
دور تک ساحلِ دریا پہ وہ پھیلی ہوئی ریت
اس پر اب تک ترے قدموں کا نشاں ہے اے دوست
سینۂ بحر سے اٹھتے ہوئے طوفانوں پر!
تیری کھلتی ہوئی زلفوں کا گماں ہے اے دوست
میرے جلتے ہوئے پہلو میں تمنا تیری
جانتا ہوں کہ تمنا کا زیاں ہے اے دوست
پھر بھی دل ہے کہ تری سمت کھنچا جاتا ہے
آرزو تیری ہی جانب نگراں ہے اے دوست

1944

ویران مناظر

ہم سفر دیکھ یہ جنگل ہیں ، یہ وادی، یہ پہاڑ
ریل ہر روز ادھر ہو کے گزر جاتی ہے
ریل کے شور سے جاگ اٹھتے ہیں یہ ویرانے
جیسے بیتے ہوئے لمحات کی یاد آتی ہے

کل مرے ساتھ اسی راہ سے گذرا تھا کوئی
دے گیا کوہ و بیاباں کو بہاریں اپنی
ایک مخمور و دلآویز گھٹا آئی تھی
دے گئی وادی و صحرا کو پھواریں اپنی

سر اٹھائے ہوئے خاموش کھڑے ہیں جو پہاڑ
منتظر ہیں وہی خورشید جمال آ جائے
وہ شب و روز یوں ہی راہ تکا کرتے ہیں
کیا عجب ہے کوئی رنگین غزال آ جائے

دیکھ وادی میں لچکتی ہوئی چھوٹی سی ندی
جستجو میں اسی معشوق کی لہراتی ہے
مضطرب رکھتی ہے اس کو اسی آہو کی تلاش
کھا کے بل شوق سے ہر موڑ پہ مڑ جاتی ہے

دیکھ جنگل میں مہکتے ہوئے ہنستے ہوئے پھول
کھل رہے ہیں دلِ بیتاب کے ارماں لے کر
کنج در کنج غزلخواں ہیں ہواؤں کے ستار
نکہتیں اڑتی ہیں پیغامِ بہاراں لے کر

' آ کہ ویران ہیں فطرت کے مناظر تجھ بن
آ کہ سنسان ہیں رنگین مناظر تجھ بن'

1944

تذبذب

آج تو شوق کے ساحل پہ کھڑی ہے خاموش
موج کا رقصِ جنوں پاس بلاتا ہے تجھے
ریت پر گزرے ہوئے عہد کا ہر نقشِ قدم
ایک بھولا ہوا افسانہ سناتا ہے تجھے
تھپکیاں دے کے سلا دیتی ہے ساحل کی ہوا
اور اٹھتا ہوا طوفان جگاتا ہے تجھے
ڈوبتی شام کے ماتھے کا چمکتا تارا
زندگانی کا نیا خواب دکھاتا ہے تجھے
شب کا بڑھتا ہوا پُرہول سیہ رنگ فسوں
اک المناک اندھیرے سے ڈراتا ہے تجھے

بحر کی سطح حسیں رات کی پرچھائیں سے
ایک آئینۂ تاریک ہوئی جاتی ہے
چھپ گیا مہرِ مبیں اور شفق کی قندیل
سرد بے رحم ہواؤں سے بجھی جاتی ہے

ظلمتیں چیر کے دامانِ فلک نکلی ہیں
نور کے ہاتھ کی تصویر مٹی جاتی ہے

اے مرے چاند محبت کے افق سے ہو طلوع
جگمگا آج فروغِ مہ تاباں ہو کر
نور ہی نور سے اطرافِ جہاں کو بھر دے
پھیل جا جلوۂ بے باک فراواں ہو کر
برق کی طرح چمک، شعلے کی مانند لپک
عمر بھر یوں تو نہ جل شمعِ شبستاں ہو کر
موج کی طرح سے وابستۂ ساحل ہی نہ رہ
حسن کی بحر سے اٹھ عشق کا طوفاں ہو کر
قطرۂ اشک لرزتی ہوئی پلکوں پہ نہ بن
جھلملا گوہرِ خوش آب و درخشاں ہو کر
پھول کی طرح سے کھل شوق کے گلزاروں میں
پھیل جا نکہتِ گل رنگِ بہاراں ہو کر
مسکرا دیں خمِ گیسو کی مہکتی کلیاں
دوشِ ہستی پہ بکھر زلفِ پریشاں ہو کر
دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کر دے
تابشِ رخ سے اندھیرے میں چراغاں کر دے

1944

✤✤✤✤✤✤

غم کا ستارہ

میری وادی میں وہ اک دن یوں ہی آ نکلی تھی
حسن اور نور کا بہتا ہوا دھارا بن کر
محفلِ شوق میں اک دھوم مچا دی اس نے
دل کی خلوت میں رہی انجمن آرا بن کر
شعلۂ عشق سرِ عرش کو جب چھونے لگا
اڑ گئی وہ مرے سینے سے شرارہ بن کر

اور اب میرے تصور کا افق روشن ہے
وہ چمکتی ہے جہاں غم کا ستارہ بن کر

1944

تو اور میں

تو یہ کہتا ہے 'خزاں بیٹھی ہوئی ہے گھات میں
اس چمن میں آج فصلِ بہاراں ہے تو کیا
سوزِ غم، شورِ ماتم ہے جلو میں موت کی
زندگی سرمست و رقصاں و غزلخواں ہے تو کیا
تنگیٔ زندان و محبس سے گھٹا جاتا ہے دم
وادیٔ گنگ و جمن وسعت بداماں ہے تو کیا
دشمنوں کی فوج کو پیچھے ہٹا سکتا نہیں
ہم قطار و ہم قدم گبر و مسلماں ہے تو کیا
سیکڑوں ہٹلر اٹھیں گے وقت کے آغوش سے
ہٹلریت چاک داماں و پشیماں ہے تو کیا
ہر طرف سے چل رہی ہے نامرادی کی ہوا
طاقِ دل میں شوق کی شمع فروزاں ہے تو کیا'
میں یہ کہتا ہوں 'کہ اے نا آشنائے زندگی
زندگی ہوتی ہے کیوں کر کامراں یہ بھی تو دیکھ
صرف اک مٹتی ہوئی دنیا کا نظارہ نہ کر
عالمِ تخلیق میں ہے اک جہاں یہ بھی تو دیکھ

موت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ ہی نہ سن
زندگی ہے تیز گام و نوجواں یہ بھی تو دیکھ
خاک پر پھیلے ہوئے دامِ غلامی پر نہ جا
حریت ہے کس قدر اوج آشیاں یہ بھی تو دیکھ
نبضِ گلشن بن کے چلتی ہے رگِ برگِ گلاب
خار وخس سے بن رہے ہیں گلستاں یہ بھی تو دیکھ
کشتیٔ شب غرقِ دریائے شفق ہونے کو ہے
کھلنے والا ہے سحر کا بادباں یہ بھی تو دیکھ
ریزہ ریزہ ذرّہ ذرّہ، خاکدانِ شرق کا
پرتوِ خورشید کا ہے رازداں یہ بھی تو دیکھ
بازوئے صیاد و دستِ باغباں کے جور سے
ٹوٹی جاتی ہیں قفس کی تیلیاں یہ بھی تو دیکھ
آج ہے آباد کتنی شاہ راہِ انقلاب
آ رہے ہیں ہر طرف سے کارواں یہ بھی تو دیکھ
میں نے مانا مرحلے ہیں سخت، راہیں ہیں دراز
مل گیا ہے اپنی منزل کا نشاں یہ بھی تو دیکھ
راستوں کے پیچ وخم سے ہول آتا ہے مگر
آج اسٹالن ہے میرِ کارواں یہ بھی تو دیکھ

1944

حُسنِ سوگوار

کیا کہوں کیا ہے وہ حسنِ سوگوار
جس کو نظریں دور سے کرتی ہیں پیار

خال و خط میں اس نگاہوں میں شراب
ہلکی ہلکی سانس میں روحِ شباب

انکھڑیوں میں خواب و بیداری لیے
زلف کے ہر خم میں دلداری لیے

بات کرتی ہے تو یوں جھڑتے ہیں پھول
جیسے گلشن میں بہاروں کا نزول

ہو کے چپ جب بیٹھ جاتی ہے کبھی
خامشی سے پھوٹتی ہے راگنی

آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی ہے اگر
جم کے رہ جاتی ہے سورج کی نظر

پھر بھی رخ پر ہے اُداسی کا غبار
جس طرح پھولوں پہ شبنم کی پھوار

آسماں پر شام کی پرچھائیاں
آئینے پر ہلکی ہلکی جھائیاں

صبح کے منظر پہ کہرے کا اثر
ابر کی چادر عروسِ ماہ پر
ادھ کھلے مخمور آنکھوں کے کنول
ابروؤں کی نوک پر ہلکا سا بل
قہقہوں میں گریۂ غم کی خراش
انگلیوں میں ایک مبہم ارتعاش
شوق کی برنائیوں سے بیقرار
عشق کی ناکامیوں سے سوگوار
رسم کی زنجیر میں جکڑی ہوئی
حلقۂ تدبیر میں جکڑی ہوئی
لاکھ چاہے پھر بھی خوش رہتی نہیں
دل میں گھٹتی ہے مگر کہتی نہیں
ہنستے ہنستے جیسے کھو جاتی ہے وہ
بات کرتے کرتے سو جاتی ہے وہ
سوچ کر کچھ ڈبڈبا آتی ہے آنکھ
چپکے چپکے اشک برساتی ہے آنکھ
روتے روتے مسکرا دیتی ہے پھر
دل میں شمعیں سی جلا دیتی ہے پھر
اس کی خوشیاں جتنی غم انگیز ہیں
اس کے غم اتنے ہی دلآویز ہیں

1944

انقلابِ رُوس

رخِ حیات کو بخشیں تجلیاں تو نے
بکھیر دی ہیں فضاؤں میں سرخیاں تو نے
جلائی عزم کی مشعل عمل کی راہوں میں
دیا ہے منزلِ مقصود کا نشاں تو نے
شگاف ڈال دیا تاجِ شہریاری میں
گرائیں ظلم کے خرمن پہ بجلیاں تو نے
فریبِ زار بھی توڑا فسونِ قیصر بھی
اجاڑ دی ہیں لٹیروں کی بستیاں تو نے
جو خونِ خلق کی دریا میں ناؤ کھیتے تھے
اتارے ان کے سفینوں کے بادباں تو نے
دکھائی جس نے غلاموں کو راہِ آزادی
دیا زمانے کو وہ میرِ کارواں تو نے
جہانِ پیری کی طرحِ کہن بدل ڈالی
مٹائے فرقہ و طبقات کے نشاں تو نے
عنانِ وقت ہے محنت کشوں کے ہاتھوں میں
یہ راز وہ ہے جسے کر دیا عیاں تو نے

بجھے بجھے سے پڑے تھے جو رہگذاروں میں
بنا دیا انھیں ذروں کو کہکشاں تو نے

جہالتوں کا اندھیرا تھا جن کے ذہنوں پر
دکھائیں علم کی ان کو تجلیاں تو نے

کبھی جو سوت کے کپڑوں کو بھی ترستے تھے
عطا کیا ہے انھیں رختِ پرنیاں تو نے

نکالی سخت چٹانوں سے جوئے آبِ رواں
بنائے ریگ کے دامن میں بوستاں تو نے

دیے ہیں رنگ سمرقند کی بہاروں کو
سجائے پھر سے بخارا کے گلستاں تو نے

بلا کا جوش ہے تیرے سبو کی مستی میں
شرابِ سرخ میں حل کی ہیں بجلیاں تو نے

جہاں میں دھوم ہے جمہور کے ترانوں کی
کچھ ایسے شوق سے چھیڑا ہے سازِ جاں تو نے

مٹا سکیں نہ تجھے سازشیں حریفوں کی
دکھائیں تیغ کے جوہر کی خوبیاں تو نے

گلوں پہ خون شہیداں سے کی حنا بندی
چمن میں لوٹ کے آنے نہ دی خزاں تو نے

تری بہارِ گلستاں بدوش ہے اب بھی
عروسِ لالہ و گل سرخ پوش ہے اب بھی

1944

تعمیرِ نو

انقلاب روس نے مشرق میں چھیڑا ہے رباب
ایشیاء کی روح میں ہے زندگی کا اضطراب
زندہ باد اے انقلاب

رسمِ پرویزی گئی، آئین چنگیزی گیا
اب ہمیشہ کے لیے دستورِ خوں ریزی گیا
زندہ باد اے انقلاب

عارضِ لعل و بدخشاں پر ہے کیسی آب وتاب
سرخ رو خونِ شہیدانِ وطن سے ہے گلاب
زندہ باد اے انقلاب

پھر سے نکھرا ہے سمرقندو بخارا کا جمال
اس افق پر ماہِ کامل بن کے چمکا ہے ہلال
زندہ باد اے انقلاب

ذرہ ذرہ سوزِ آزادی سے دے اٹھا ہے لو
کارخانے گا رہے ہیں نغمۂ تعمیرِ نو
زندہ باد اے انقلاب

جھومتی ہے کشت زاروں پر بہارِ لازوال
ریگ زاروں میں بچھا ہے نقرئی نہروں کا جال
زندہ باد اے انقلاب

سبزۂ نورس کی چادر اوڑھتے ہیں خشت و سنگ
خاک کے سینے سے اُگتا ہے 'طلائے سیم رنگ'[1]
زندہ باد اے انقلاب
کیوں نہ ہو کشت و چمن آسودہ خرمن باغ باغ
خانۂ دہقاں میں روشن ہیں فراغت کے چراغ
زندہ باد اے انقلاب
اہلِ محنت کا نہالِ آرزو ہے بارور
آدمی کے دستِ قدرت میں ہیں فطرت کے ثمر
زندہ باد اے انقلاب
اپنی دولت لے کے حاضر ہو رہے ہیں کوہسار
برق کی جوئے رواں برسا رہے ہیں آبشار
زندہ باد اے انقلاب
بزمِ گیتی کے ہیں خادم عرشِ اعظم کے سفیر
دامِ حکمت میں شعاعِ مہر تاباں ہے اسیر
زندہ باد اے انقلاب
سمٹی جاتی ہیں فضائیں کانپتا ہے آفتاب
مائلِ پرواز ہیں فولاد و آہن کے عقاب
زندہ باد اے انقلاب
عزمِ انسانی عناصر سے ہے سرگرمِ جہاد
دخترِ دہقاں کے ہاتھوں میں ہے سازِ برق و باد
زندہ باد اے انقلاب
آدمِ[2] خاکی کا ہنگامِ نمود آ ہی گیا
اس زمیں پر آسماں بہرِ سجود آ ہی گیا
زندہ باد اے انقلاب

---

1 وسطی ایشیاء میں روئی کو 'سفید سونا' کہتے ہیں۔

2 برخیز کہ آدم را ہنگامِ نمود آمد این مشتِ غبارے را انجم بسجود آمد (اقبال)

آخری خط

(سویت جرمن جنگ کا ابتدائی زمانہ تھا۔ سرخ فوجیں جو آج فاتحانہ شان سے آگے بڑھ رہی ہیں سی لستو پول کے مورچے کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ رہی تھیں۔ اس وقت سی لستو پول جہنم کا نمونہ تھا۔ پیچھے ہٹتی ہوئی فوجوں کو جرمن حملے سے بچانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ کچھ سپاہی آخری وقت تک جرمنوں کے مقابلے پر ڈٹے رہیں اور اپنی جان دے دیں۔ جن سپاہیوں نے یہ فرض انجام دینے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں ان میں سے ایک سپاہی نے اپنی بیوی کو ایک خط لکھا۔

خط ایک نئی ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ ان میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے وہ انسانیت کے لیے باعثِ ناز ہیں۔ اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جرمن درندوں کے خلاف لڑنے والے سرخ سپاہی لوہے اور پتھر کے بنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ وہ ہماری اور آپ کی طرح گوشت اور پوست کے جیتے جاگتے انسان ہیں جو زندگی سے محبت کرتے ہیں اور زندگی کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے بڑی خوشی سے اپنی جان دے رہے ہیں۔ اس خط کو پڑھ کر مرد اور عورت کی محبت کے ایک نئے معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔

میں نے یہ نظم اسی خط سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ سوویت یونین کی آزاد سوسائٹی نے جس نئے انسان کو پیدا کیا ہے اس کو سمجھنے میں یہ نظم شاید مفید ثابت ہو۔)

نظم

(سرخ سپاہی کا خط اپنی بیوی کے نام)

اے پرستانِ محبت کی پری
اے فروغِ شمعِ بزمِ دلبری

اے سمرقند و بخارا کی بہار
اے مری تنہائیوں کی غم گسار

تیرے شوہر کا سلامِ آخری
ہے محبت کا پیامِ آخری

ملک پر اپنے فدا ہوتا ہوں میں
اب ہمیشہ کو جدا ہوتا ہوں میں

گو مرے نے سے تو ہے درد مند
اپنی ہم جنسوں میں ہو گی سربلند

خوش ہے اسٹالین میرے کام پر
حرف آئے گا نہ تیرے نام پر

تیرا شوہر موت سے ڈرتا نہیں
پاؤں پر دشمن کے سر دھرتا نہیں

دشمنوں سے برسرِ پیکار ہوں
لذتِ کردار سے سرشار ہوں

سیلِ حملے کا کبھی تھمتا نہیں
تیغ پر میری لہو جمتا نہیں

ایک لمحہ کو نہیں رکتی ہے جنگ
بس گیا ہے خون کا آنکھوں میں رنگ

زلزلوں کی زد میں ہے ہی بستو پول
بج رہے ہیں کان کے پردوں پہ ڈھول

ڈگمگاتے ہیں پہاڑوں کے قدم
سر پہ اولوں کی طرح گرتے ہیں بم

بحر کے سینے میں پیدا جوش ہے
ساحلِ دریا بھی آہن پوش ہے

دور تک جنگی سفینوں کی قطار
جیسے بہہ کر آ گئے ہوں کوہسار

الاماں پرہول بمباروں کی آگ
اف وہ ہیبت ناک طیاروں کی آگ

الاماں لاشوں پہ لاشے الاماں
موت کے بجتے ہیں تاشے الاماں

پشتِ گیتی پر ہے انگاروں کی ڈھال
ہے ہوا کے دوش پر شعلوں کا جال

شہر سارا آگ کا خرمن ہے آج
ذرہ ذرہ شعلہ پیراہن ہے آج

سرخ ہے شعلوں سے روئے آفتاب
سرخ ہے شعلوں سے دامانِ سحاب

سرخ شعلوں سے سحر ہے سرخ شام
سرخ ہیں شعلوں سے بام و در تمام

سرخ شعلے کھا رہے ہیں پیچ و تاب
تپ رہی ہے ان میں روحِ انقلاب

الغرض ہم بے خطر لڑتے رہے
روز و شب شام و سحر لڑتے رہے

جنگ کا سیلاب چڑھتا ہی گیا
دشمنوں کا زور بڑھتا ہی گیا

ایسے طوفاں میں ابھرنا ہے محال
اب یہاں پر جنگ کرنا ہے محال

بند کر دیں دار یہ ممکن نہیں
ڈال دیں ہتھیار یہ ممکن نہیں

چھوڑ کر یہ مورچہ ہٹ جائیں گے
ہٹ کے پیچھے سورما ڈٹ جائیں گے

ان کی پس قدمی پہ ہم ہوں گے نثار
اپنے جسموں سے بنائیں گے حصار

ہم ہیں کیسے سورما دکھلائیں گے
مرتے مرتے اک سبق دے جائیں گے

ہم جئیں گے بھی تو اپنی آن سے
ہم مریں گے بھی تو اپنی شان سے

زندگی کے راز سے واقف ہیں ہم
موت کے انداز سے واقف ہیں ہم

غول دشمن کا جب آئے گا یہاں
خاک کے سینے سے اٹھے گا دھواں

بام باقی اور نہ در رہ جائے گا
شہر کے بدلے کھنڈر رہ جائے گا

شہر لینن کے سپوتوں کے لیے
اور کھنڈر فاشسٹ بھوتوں کے لیے

نور ہے آئینۂ ایام میں
زندگی کی مے ہے میرے جام میں

دل میں ہے سوز و گدازِ آرزو
ہے رگ و پے میں جوانی کا لہو

عالمِ ہستی کا دلدادہ ہوں میں
پھر یہ کیوں مرنے پہ آمادہ ہوں میں ؟

زندگی میں رنگ بھرنے کے لیے !
موت کو تسخیر کرنے کے لیے !

موت کی جانب بڑھا جاتا ہوں میں
موت کے منہ میں چلا جاتا ہوں میں

کام جب آئے گا لاکھوں کا شباب
سرخ تارا تب بنے گا آفتاب

فرض کی تشکیل ہے تشکیلِ ذات
فرض کی تکمیل ہے تکمیلِ ذات

فرض سوزِ زندگی سازِ حیات
فرض کا احساس ہے رازِ حیات

فرض سے تابندہ قوموں کی جبیں
فرض ہے جوشِ عمل سوزِ یقیں

فرض سے ہے پائے ہمت کو ثبات
فرض کا اک گھونٹ ہے آبِ حیات

فرض ہی سے دولتِ کردار ہے
فرض ہی سے لذتِ پیکار ہے

فرض کیا ہے؟ سرخ فوجوں کا جلال
فرض سے انساں کی جرأت لازوال

آج جو محکوم ہے مظلوم ہے
فرض کے احساس سے محروم ہے

فرض کا احساس ہے ہمت مری
فرض کا احساس ہے قوت مری

جان جائے آبرو جانے نہ پائے
جیتے جی دشمن یہاں آنے نہ پائے

معرکے کا زور گھٹ سکتا نہیں
یہ قدم اب جم کے ہٹ سکتا نہیں

گو نہیں ہے مجھ کو مرنے کا ملال
دل میں رہ رہ کر یہ آتا ہے خیال

ہے جوانی کا چمن بے رنگ و بو
بے ثمر ہے میرا نخلِ آرزو

باغ کے آغوش میں گل چاہیے
زندگانی میں تسلسل چاہیے

ہو اگر دل کو تسلی کا یقیں
موت بن جاتی ہے جامِ انگبیں

سر سے ڈھل جاتی ہے مایوسی کی دھوپ
موت پھر لیتی ہے پیدائش کا روپ

ہاں یہ سچ ہے تو مجھے کرتی ہے پیار
تیرا پیمانِ وفا ہے استوار

عمر بھر اب تجھ کو یاد آؤں گا میں
تیرے دل میں درد بن جاؤں گا میں

ہو گی غم انگیز رعنائی تری
تیری ہمدم ہو گی تنہائی تری

لیکن اے تسکین جانِ بیقرار
عمر بھر یوں ہی نہ رہنا سوگوار

تو ہے جن اچھائیوں کی مایہ دار
دوسروں پر بھی تو ہوں وہ آشکار

گر نہ ہو سطحِ زمیں پر جلوہ تاب
بے حقیقت ہے طلوعِ آفتاب

شمع محفل سے اگر مستور ہے
فائدہ پھر کیا جو اس میں نور ہے

ساز سے پیدا نہ ہوں نغمے اگر
جنبشِ مضراب ہے ناکارگر

اس لیے تنہا نہ رہنا چاہیے
تیرا دل سونا نہ رہنا چاہیے

گر بخارا میں ہو کوئی نوجواں
جو سمجھتا ہو ترے غم کی زباں

ہو جو واقف تیرے دل کے درد سے
جو جھجکتا ہو نہ آہِ سرد سے

سوگ تیرا ہو نہ جس کے دل پہ بار
جس کو کر سکتی ہو تو تھوڑا سا پیار

عشق میں اپنے سمو لینا اسے
ہار میں اپنے پرو لینا اسے

اس ہوا سے کوئی گر غنچہ کھلے
یاد کرنا اس کو میرے نام سے

میرے گلشن کا ثمر کہنا اسے
ہاں مرا نورِ نظر کہنا اسے

اور جب دشمن کو مل جائے شکست
اس کے سارے حوصلے ہو جائیں پست

مجھ سے ملنے کے لیے آنا یہاں
پھول لالے کے چڑھا جانا یہاں

جانتا ہوں وہ گھڑی بھی آئے گی
دشمنوں کی نبض جب چھٹ جائے گی

بحرِ اسود سے اٹھے گی فوج فوج
سرخ طوفاں کی ظفر انجام موج

دامنِ ساحل بھگویا جائے گا
دشمنوں کے خوں سے دھویا جائے گا

سرخ فوجیں لوٹ کر آئیں گی پھر
سرخ پرچم بن کے لہرائیں گی پھر

شہر یہ دل شاد ہو گا ایک دن
یہ کھنڈر آباد ہو گا ایک دن

پھر نسیمِ جانفزا اٹھلائے گی
لالہ و گل پر بہار آ جائے گی

مسکرائے گی تبسم کی کلی
گونج اٹھے گی قہقہوں کی راگنی

ریگِ ساحل پرنیاں ہو جائے گی
یہ زمیں پھر آسماں ہو جائے گی

1944

نئی دنیا کو سلام

ایک تمثیلی نظم

1947

پیش لفظ

'نئی دنیا کو سلام' میری سب سے طویل نظم ہے۔ اردو زبان میں اس طرح کی کوئی چیز اب تک نہیں لکھی گئی ہے۔ اس لیے یہ نظم پیش کرتے ہوئے مجھے تھوڑی سی جھجک ہو رہی ہے۔ جھجک کی وجہ خود اعتمادی کی کمی نہیں بلکہ نظم کا نیا پن ہے۔ کیونکہ اس سماج میں ہر نئی چیز شک کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کا موضوع بھی نیا ہے اور ٹیکنیک بھی نئی۔ زندگی کے متعلق میرا زاویۂ نگاہ بھی دوسرے شعراء سے مختلف ہے۔ اس لیے میں نے اکثر اشاروں کی جگہ تفصیلات سے کام لیا ہے۔ اشاروں اور کنایوں کا وقت بھی کبھی آ جائے گا۔

یہ منظوم تمثیل نہیں بلکہ تمثیلی نظم ہے۔ اس کے کردار کردار نہیں علامتیں ہیں۔ کہانی پلاٹ نہیں بلکہ مبہم سا خاکہ ہے جس کو میں نے رنگ بھرنے کے لیے بنایا ہے۔ واقعات کے بجائے واقعات سے پیدا ہونے والے جذبات، تاثرات اور احساسات پیش کئے ہیں۔ جاوید اور مریم (میاں بیوی) جدوجہد کی علامتیں اور فرنگی ظلم کی علامت ہے۔ نامہ بر ہمارا روایتی کردار ہے جس کے فرائض اس نظم میں بدلے ہوئے نظر آئیں گے۔ سب سے زیادہ اہم کردار وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ ابھی اس کے نقش و نگار بن رہے ہیں۔ وہ نئی دنیا کی علامت ہے۔ اس کی حسین اور معصوم روح پوری نظم پر حاوی ہے۔

میں انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ اس کا ماضی بڑا شاندار ہے اور حال دلکش امکانات سے معمور ہے۔ حالانکہ آج ہندستان خانہ جنگی کے کرب میں مبتلا ہے اور ایسی بہیمانہ حرکتیں ہو رہی ہیں جن سے دورِ وحشت کی درندگی بھی شرمائے گی۔ لیکن یہ بلا بھی ہیضے اور طاعون کی وباؤں کی طرح گزر جائے گی۔ کیونکہ اس کے خلاف بھی وہی قوتیں جدوجہد کر رہی ہیں جو میری نظم میں کارفرما ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جس میں 'انسان' کو شکست ہوئی ہو۔ افراد اور طبقات کو شکست ہوتی رہی ہے اور ہو گی لیکن 'انسان' ناقابلِ شکست ہے۔ کیونکہ اس کی محنت، عمل اور جدوجہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے ماحول کی بھی خالق ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ فتح مند اور کامران رہے گا۔ یہ عقیدہ جو اندھا عقیدہ نہیں ہے، میرا سب سے بڑا انسپریشن ہے۔ میں اس کو ادب اور فن کا ابدی موضوع سمجھتا ہوں۔ سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ عظیم المرتبت، سب سے زیادہ حسین 'انسان' ہے۔

سردار جعفری

بمبئی دسمبر 1946

دیباچہ

جدید شاعری اور نئی دنیا کو سلام

از مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی

سردار جعفری صاحب کی طویل تمثیل اور مثنوی 'جمہور' جو اسی کا ایک حصہ ہے پڑھ کر باغ باغ ہو گیا۔ اسی کے ساتھ میرا یہ خیال راسخ ہو گیا کہ شاعری جدید طرز کی ہو یا قدیم طرز کی اول فن ہے اور ثانیاً اور کچھ ہے، موضوع کے افادی یا جمالیاتی پہلو سے قطع نظر اگر انداز بیان میں تازگی، شگفتگی، ندرت اور فن کارانہ انفرادیت یعنی خود شاعر کے انفعالی اثرات کا پرتو نہ ہو تو شاعری گھٹیا قسم کی نقالی بن کر رہ جاتی ہے۔ لائق مصنف نے یہ گُر سمجھ لیا ہے اور اپنی نظم میں واقعات کے بجائے واقعات سے پیدا ہونے والے جذبات، تاثرات اور احساسات پیش کیے ہیں۔ یہی راز ہے جس سے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا ایک بڑا حصہ یا تو بے گانہ ہے یا اس پر کاربند ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے اس جماعت کے دوسرے شاعر محض واقعات اصلی ہوں یا فرضی پیش کرتے اور ان سے نتیجہ نکالتے یا پڑھنے والوں کے ذہن کے لیے ان کہے چھوڑ دیتے ہیں۔ جعفری صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ایسی اشاراتی شاعری سے اجتناب کیا ہے جس کے ابہام اور مہملیت کا پردہ تحت الشعوری محرکات یا رجحانات کو بنایا جاتا ہے۔ انھوں نے اشاروں کے بدلے تفصیل اور تشریح سے کام لیا ہے اور اپنے نوشتہ 'پیش لفظ' میں اس کا اعلان بھی کر دیا ہے۔

مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے جعفری صاحب نے تمثیل کے افراد کی تعداد قلیل رکھی ہے۔

جاوید اور مریم (میاں بیوی) جہد آزادی کی علامتیں ہیں۔ 'فرنگی' ظلم کی نشانی ہے۔ 'نامہ بر' روایتی نامہ بر ہے۔ بچہ جو ابھی پیدا نہیں ہوا نئی آنے والی نسل کا پیش خیمہ ہے۔ موضوع کے لحاظ سے نظم کو 'اشتراکیت کا رزمیہ' کہنا بے جا نہ ہوگا۔ یہ بجائے خود ایک اہم اضافہ ہے۔ کیونکہ اردو میں اب تک رزمیاتی شاعری یا Epic کے نمونے مراثی تک محدود تھے۔

نظم کے ابواب کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے:۔

حرفِ اوّل : جس میں ہندوستان کے دورِ ابتلا و افلاس و غلامی کو ایک مہیب سیاہ رات یا ڈراؤنی دیوی سے تعبیر کیا ہے۔ اس تاریکی کا پردہ چاک ہونے کو انقلاب ضروری ہے۔ ایسا انقلاب جس کا سرچشمہ ضمیرِ انسان کی نورانیت ہے۔ اس کا منشاء محض مجنونانہ تخریب نہیں ہے بلکہ نظامِ نو کی تعمیر ہے جس کا خاکہ ذہن میں ہے۔ مستقبل کے لیے نہیں اٹھا رکھا گیا ہے۔

پہلی تصویر : تاریکی سے دو شکلیں ابھرتی ہیں، جو انقلاب کی نقیب ہیں۔ ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ اس میں رمز ہے کہ مردوں اور عورتوں کی متفقہ و متحدہ جدوجہد سے ہی مکمل آزادی و فراغت نصیب ہو سکتی ہے۔ عورتوں کی سعیِ عمل کا نمائندہ جھانسی کی رانی کی روح کو بنایا گیا ہے۔ رُندھی ہوئی فضا اور غمگین موضوع میں رنگینی و رعنائی کی ایک جھلک دکھانے کو نیز اس امر پر زور دینے کو کہ انقلاب کے حامیوں کو اخلاقی حیثیت سے بھی تمثالِ آدمیت اور مجسمۂ ایثار ہونا چاہیے۔ جاوید اور مریم کے باہمی ارتباط اور معاشقے کا تذکرہ ہے۔ ان کی محبت میں پاکی ہی پاکی ہے۔ گو عام طور پر ترقی پسند حضرات ایسی محبت کے قائل نہیں بلکہ تند و تیز رومان کی تلاش میں رہتے ہیں۔ چاہے کتنی ہی بے ثبات و گریز پا اور نتائج کے لحاظ سے مہلک ہو۔ مریم عفت و حیا کی پُتلی ہے، جاوید کا عشق ہوس کاری کی بھٹی نہیں بلکہ اس کی جڑیں روح کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہیں سے سرمایۂ نمو حاصل کرتی ہیں۔

دوسری تصویر : مریم اور جاوید میں رشتۂ ازدواج قائم ہو چکا ہے اور مریم 'دو جی' سے ہے۔ اس حالت اور اس سے متعلق جذبات کی مصوری جعفری صاحب نے جس نفاست اور چابک دستی سے کی ہے آپ اپنی مثال ہی نہیں بلکہ اردو میں نئی چیز ہے۔

تیسری تصویر : کوڑی کوڑی کو محتاج مریم اپنے ہونے والے بچے کے لیے کُرتا سی رہی ہے۔ کپڑا میسر نہیں پھٹے پرانے چیتھڑے جوڑے جاتے ہیں مگر ہائے ماں تا کا تقاضا اور چونچلا کہ مختلف رنگ کے ٹکڑوں میں تال میل پیدا کرنے کی دُھن ہے۔

چوتھی تصویر : انقلاب کے آثار نمایاں ہیں۔ جاوید اور مریم اس تحریک میں پیش پیش ہیں۔ حکومت کے خلاف بغاوت کا جرم لگا کر دونوں کو 'فرنگی' عدالت کے سامنے لایا جاتا ہے۔ حاکمِ عدالت کے سوالات، جاوید اور مریم کے جوابات، ان کے تیور اور لب و لہجہ اس حصۂ نظم کی جان ہیں۔ بعض دوسرے 'شاعرانِ انقلاب' کے برخلاف جعفری صاحب نے 'عفریتِ انقلاب' کو خون کی ندیاں بہاتے، بوڑھوں اور بچوں کی ٹانگیں چیرتے، لاشوں کے ڈھیر پر ناچتے، قلقاریاں مارتے، بغلیں بجاتے، شلنگیں بھرتے، انسانوں کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھاتے، ڈکاریں لیتے اور خون آلود ڈاڑھیوں سے گوشت کے ریشے

نکالتے نہیں دکھایا ہے۔ جاوید اور مریم کی تقریر ذاتی نفرت، بغض وعناد اور کینہ پروری کی تلخیوں سے یکسر پاک ہے۔ ان کی جنگ ایک خاص نظامِ حکومت، ایک خاص تمدن سے ہے، جس کی بنیاد جبر وتعدی پر ہے اور جس میں دولت کی تقسیم غیر مساویانہ اور نامنصفانہ ہے، جس میں غریب کچلے جاتے ہیں اور ان کے جائز حقوق پامال کئے جاتے ہیں۔ اس جنگ میں ذاتی پرخاش کو مطلق دخل نہیں۔

جاوید باغی قرار پاتا ہے اور اس کو سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے۔ مریم بظاہر آزاد کردی جاتی ہے مگر اس کی سزا موت سے سخت تر ہے۔ 'عمر بھر صرف رویا کرو'

پانچویں تصویر: پھانسی پانے سے پہلے جاوید طلوعِ صبحِ نو کی پیشین گوئی کرتا بلکہ بشارت دیتا ہے۔ اس حصہ نظم کے اکثر مقامات اہم ہیں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

چھٹی تصویر : مریم پھر بھی عورت ہے۔ نوحہ وزاری کرتی ہے۔ نامہ بر مریم کو جاوید کا آخری پیغام سناتا ہے۔ اس پیغام میں پوری نظم کا نچوڑ ہے۔ جذبات کا سیلاب ہے کہ امڈا آ رہا ہے۔

حرفِ آخر :

نئے افق سے نئے قافلوں کی آمد ہے
چراغِ وقت کی رنگین لو بڑھائے ہوئے
قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدانِ وطن
مجاہدانِ وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے

نظم کی جو ہیئت جعفری صاحب نے قائم کی ہے وہ بھی دلکش اور موسیقیت سے لبریز ہے۔ باوجود یہ کہ معقول حصے کا پیرایۂ بیان نظم آزاد ہے۔ اس سے ان کی عروض سے واقفیت اور زبان پر قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ حرفِ اول کے اشعار قافیہ ردیف کی قید سے کہے گئے ہیں۔ اور قوافی کی تکرار ہے۔ صرف آخری شعر میں جسے پہلی تصویر کی تمہید یا نغمے کی الاپ کہنا چاہئے، قافیہ ردیف بدلے ہوئے ہیں۔

حرفِ آخر بھی اسی بحر اور انھیں قوافی و ردیف میں ہے، جن میں حرفِ اول ہے۔ جیسے گیت میں تال اور سم ہوتے ہیں۔ پہلی تصویر مثنوی کی طرز میں ہے۔ اس کی حیثیت اس ساز کی ہے جسے مغنی مضراب سے چھیڑتا ہے اور گانے میں آس دیتا ہے۔ دوسری تصویر کا جزو اسی بحر اور انھیں قوافی اور ردیف میں ہے، جن میں حرفِ اول اور حرفِ آخر ہیں۔ گویا آغاز نغمہ سے قبل لے اور دھن قائم کی گئی ہے۔ باقی حصہ پہلی تصویر کی طرح مثنوی کی ابیات سے اسی بحر میں مترتب ہے۔ مغنی ساز پر وہی نغمہ دہرا رہا ہے، جو لحن میں ادا کرنے والا ہے یا کر چکا ہے۔ تیسری تصویر، ایک حصہ بطرز مخمس (گیت کی لے اونچی ہوتی) اس میں ایک

ہی شعر کو متواتر تضمین کیا ہے۔ گویا مغنی مختلف راہیں نکال رہا ہے، بول بنا رہا ہے، تان کے دانے رکھ رہا ہے۔ باقی حصے کے پہلے دو شعر مختلف بحر میں ردیف وقافیہ کی پابندی کے ساتھ ہیں۔ جیسے مغنی کن لگاتا ہے۔ بعد ازاں بحر نے آزاد نظم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ موسیقی کی اصطلاح میں 'تان پلٹے' کہہ سکتے ہیں۔ بحر متدارک ہے (وزن فاعلن) مگر کسی مصرعے میں یہ اوزان آٹھ ۸ مرتبہ سے زیادہ نہیں آتے ہیں۔ اور یہ احتیاط جعفری صاحب کے سلیقہ پر دال ہے۔ موسیقی میں بھی اتار چڑھاؤ کے باوصف تان کی حدیں مقرر ہوتی ہیں۔ وہ مطلق العنانی نہیں ہے کہ مصرعے شیطان کی آنت ہو جائیں۔ چونکہ اس تصویر کا بیشتر حصہ مکالمے کی شکل میں ہے۔ بحر کا انتخاب، مصرعوں کی ترتیب، ارکان کی کمی بیشی یہ سب جعفری صاحب کے صناعانہ احساس کی ترجمان ہیں۔ اس کو راگ کی سرگم یا دھرپد کہنا چاہئے۔ چوتھی تصویر ایک حصہ دو دو اشعار کے قطعات کا مجموعہ ہے، اسے موسیقی کی 'ٹھا' کہہ سکتے ہیں۔ باقی حصہ بطرز نظم آزاد، بحر متدارک۔

پانچویں تصویر، بحر متقارب، چار چار مصرعوں کے قطعات جن میں اوّل، دوم و چہارم ہم قافیہ ہیں جسے موسیقی میں ٹنکری اس کے بعد بحر مقدار کی بقیہ پھر اسی بحر میں نظم آزاد بعض بعض جگہ قوانی بھی آ گئے ہیں۔ کہیں بلمپت لے ہے کہیں ذرت لے، کہیں مدھم، کہیں پنچم۔

چھٹی تصویر، بحر متدارک میں بطرز مثنوی۔ ایک حصہ نظم آزاد۔ بعد ازاں پھر بطرز مثنوی، گویا جہاں سے راگ شروع ہوا تھا وہیں بتدریج واپس آ کر خفیف ارتعاش کے ساتھ تاروں کی جھنکار میں ختم ہو گیا۔ گستاخی ضرور ہے مگر مجھے اپنی غزل کا ایک شعر سنانے کی اجازت دیجئے۔

وہ نغمہ تو نے اے مطرب سنایا
کہ اب تک سنسنی ہے تن بدن میں

عجب نہیں کہ نظم کی ترتیب اور اختلاف بحور جیسا ایک عنوان حرف آخر سے مترشح ہوتا ہے، حضرت جوش کی زیر تدوین کتاب حرف آخر سے ذہن میں آئے ہوں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ جوش (جہاں تک مجھے علم ہے) نظم آزاد کے مخالف ہیں۔ یہ کہنے کی بھی جرأت ہوتی ہے کہ تنوع بحر سے ان کا منشاء صرف اس قدر ہے کہ ایک ہی بحر میں ایک طویل نظم پڑھتے پڑھتے طبیعت اوب نہ جائے اور دل اچاٹ نہ ہو جائے۔ جعفری صاحب کے یہاں بحروں کا انتخاب، مصرعوں کی ترتیب اور اوزان میں کمی بیشی، ہیئت کی اندرونی تبدیلیاں ایک خاص مقصد کی طابع ہیں وہ یہ ہے کہ بحور کا تنوع، ارکان کی کمی یا زیادتی، لہجے کے تغیرات نغمے کی لہروں میں ہلچل پیدا کرتے ہوئے طوفانی فضا میں تحلیل ہو جائیں اور طوفان انقلاب کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے انھوں نے دانستہ یا نادانستہ (وجدان وذوق کی رہنمائی میں) ایسی بحروں کا

انتخاب کیا ہے جس میں تنوع ہوتے ہوئے بھی مجانست ہے یعنی

مجتث: جس کا وزن ہے مفاعلن ،فعلاتن ،مفاعلن ،فعلن 'سیاہ عدل سیہ کلغیاں لگائے ہوئے'

ھزج: مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن 'یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے۔'

متقارب: فعولن فعولن فعولن فعولن 'نہاں ابر میں چاند کب تک رہے گا۔'

کہیں زحاف بدلا ہوا ہے۔اور وزن فعلن فعولن فعلن فعولن ہو گیا ہے۔

'دنیا پریشاں خوابوں کی بستی۔'

متدارک: فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن (باختلاف ارکان) کیونکہ آزاد نظم کا بیشتر حصہ اسی بحر میں ہے۔'اور فرق مراتب سے بیزار ہے۔' (باختلاف ارکان)

خفیف: فاعلاتن مفاعلن فعلن 'وادیاں گونجتی ہیں نعروں سے۔'

اس انداز ے کو مزید تقویت قوافی کی پابندی وعدم پابندی، بحور کی الٹ پھیر، کمی بیشی ارکان وغیرہ سے پہنچتی ہے اور زبان موسیقی میں اس مفہوم کو یوں ادا کر سکتے ہیں:۔

راگ شروع ہوا، نغمے کی ہموار لہروں میں تھرتھری پیدا ہوئی۔تھرتھری سے ہلکی ہلکی سلوٹیں پڑنے لگیں جو پھیلتے پھیلتے اور بڑھتے بڑھتے دائرے بنانے اور پھر کروٹیں اور پھر ہلکورے لینے لگیں۔چھوٹی بڑی لہریں ٹکرائیں۔ٹکرا کر جدا ہوئیں اور جدا ہو ہو کر ملیں۔شرابور کیا اور خود شرابور ہوئیں۔اسی کے ساتھ نغمے کی حرکت اور رفتار تیز ہوتی گئی۔تاہم ترتیب و توازن قائم رہے۔تناسب و آہنگ میں فرق نہ آیا۔ خاتمہ اس عروج پر ہوا جس سے آگے بڑھنے پر نغمہ محض چیخ بن کر رہ جاتا ہے،ترتیب ابتری میں مبدل ہو جاتی ہے۔

میں نے نظم کے ہر حصے کی جو مختصر شرح کی ہے اس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔نظم میں تسلسل ہوتا ہے۔ثبوت میں اقتباسات پیش کرنا دشوار ہے۔بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ اتنے طویل ہوں گے کہ مضمون میں سما نہ سکیں گے۔مگر مجھے امید ہے کہ پوری نظم غور سے پڑھنے کے بعد میرا ادّعا غلط ثابت نہ ہوگا۔

تشکیل و ترتیب کے علاوہ یہ نظم شاعرانہ خوبیوں سے بھی مالا مال ہے۔چند مثالوں پر قناعت کروں گا۔یوں تو پوری نظم کافی طویل ہونے کے باوجود از اوّل تا آخر حسین ہے۔

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اٹھائے ہوئے

سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مارِ سیاہ
سیاہ پھن میں سیہ پھول مسکرائے ہوئے

زلف اور سانپ کی تشبیہ ابتذال کی حد تک عام ہے مگر سانپ کے پھن کو سیاہ پھول کہنے میں جدت اور ندرت ہے۔ مسکرانے کا ثبوت ادھر سیاہ بالوں کی چمک۔ ادھر سانپ کے پھن کی چتیاں اور چکر مکر کرتی آنکھیں، بالوں کی طرح سانپ کی کینچلی میں بھی چمک ہوتی ہے۔ چونکہ منظر پر ظلمت چھائی ہوئی ہے۔ بالوں کی چمک دھندلی ہو کر تلملوں کی طرح نظر آ رہی ہے اور سانپ کے پھن کی سفید چتیاں ترمرے ہیں، جنھیں شاعر نے سیاہ پھولوں میں تبسم کی جھلک سے تعبیر کیا ہے۔

(نوٹ تلملے اور ترمرے دونوں الفاظ مرادف ہیں مگر ماخذ الگ الگ ہیں۔ 'تیل' اور 'ملا' سے وہ چمکیلے حلقے یا دائرے جو تیل ملے ہوئے پانی کی سطح پر دکھائی دیتے ہیں۔ ترمرے مرکب ہے۔ 'تر' (تارا) اور 'ملا' سے۔ دونوں کا اطلاق ان چمکدار نقطوں پر ہوتا ہے جو ضعف کی حالت میں یا چکا چوندھ کے وقت آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ میں نے سانپ کی چتیوں کے لیے ترمرا اور زلف کی چمک کے لیے تلملا استعمال کرنا مناسب سمجھا۔ کیونکہ چتیوں اور تاروں میں مشابہت ہوتی ہے اور تیل کو زلف سے رابطہ ہے۔ وضاحت کی ضرورت اس وجہ سے ہوئی کہ ایک مرتبہ ایک مقتدر ادیب اور نقاد نے تلملے کی صحت پر شک ظاہر کیا تھا۔)

نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے
سیہ نشاط کی بدمستیاں چرائے ہوئے

'بدمستیاں چرائے ہوئے' یہ ہے الفاظ کا صناعانہ صرف۔ سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے نیل پڑ گئے ہیں اور نیل میں کلونچ مارتی ہوئی سرخی کا ہونا ضروری ہے۔ کثرتِ مے نوشی اور شدتِ شہوت و بدمستی میں بھی چہرے کی سرخی میں سیاہی دوڑ جاتی ہے۔ سیاہی میں سرخی کی تہہ بے شرمی سے دریوزہ کی ہوئی بھی نہیں بلکہ چرائی ہوئی سرخی کی تہہ، ان ہونٹوں کو جن میں گلبرگ تر کی نزاکت و لطافت ہونا چاہیے تھی کس قدر نفرت انگیز بنا دیتی ہے۔ مجھے مسرت ہے کہ جعفری صاحب اپنے حریفوں کی طرح معصیت اور بدکاری کو عروس پری چہرہ بنا کر پیش نہیں کرتے۔

ہونٹوں پر بوسوں کے نشان رہ جانا اس امر کا غماز ہے کہ ان بوسوں کو محبت کے تقاضوں سے دور کا بھی سروکار نہ تھا۔ ان میں وہ سنسنیاں بند نہیں تھیں۔

'محبت کے بوسوں نے دے کر جو لیں'

بلکہ یہ بوسے محض حظِ نفس کے لیے ہوس کارانہ درشتی اور بے باکی سے لیے گئے ہیں اور بوسے دینے والے کو بھی غلبۂ خواہشات نے ایسا آپے سے باہر کر دیا تھا کہ ان بوسوں کی سخت گیری کو خوشی خوشی گوارا ہی نہیں کیا بلکہ ان کی جھلنے والی بدمستیٔ نشاط کو اپنے ہونٹوں میں جذب کر لیا۔ چرا لیا تا کہ اس کے نقوش عارضی لمحات تلذذ کی یاد تازہ رکھیں، آگ پر تیل چھڑکتے رہیں اور خیالات میں بھی فسق و فجور کا شعلہ فروزاں اور مشتعل رہے۔ نقل کردہ شعر کو اس سے قبل اور مابعد کے شعر سے ملا کر پڑھنے سے مطلب اور واضح ہو جاتا ہے:۔

سیہ دوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں پر
سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے
نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے
سیہ نشاط کی بدمستیاں چرائے ہوئے
سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں
سیاہ بچوں کو آغوش میں سلائے ہوئے

غلامی اور افلاس کی رات معصیت کی بھی مسلسل شبِ تار ہے کیونکہ اس میں پرورش پاتے ہوئے بچے بھی جوان ہو کر اپنے ماں باپ کے ایسے ہوں گے۔ 'سلائے ہوئے' ایک معمولی فقرہ ہے مگر اس موقع پر جولانیٔ خیال کے لیے کس قدر ساماں فراہم کر رہا ہے۔

ایک شبہ یہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ اندھیری رات میں سیاہ چیزیں نظر کیونکر آ رہی ہیں؟ یہ حقیقت ہے کہ شب کی پھیلی ہوئی اور محیط سیاہی ایسی تیرگوں نہیں ہوتی کہ ہر شے کو نگاہ سے یک لخت اوجھل کر دے، نقوش دھندلے ہو جائیں گے مگر نمایاں رہیں گے۔ بسیط سیاہی سرمئی پردہ بن جائے گی جس پر سیاہ چیزیں پرچھائیوں کی طرح دکھائی دیں گی۔ یہ بھی امر واقع ہے کہ آنکھیں تاریکی سے رفتہ رفتہ مانوس ہو جاتی ہیں اور جو چیزیں ابتداً پوشیدہ تھیں نظر آنے لگتی ہیں۔ اس معصیت آلود تیرگی کا سبب کیا ہے۔

ضمیر عہدِ غلامی کی تیرگی ہے یہ رات
جو پھر رہی ہے اجالے سے منہ چھپائے ہوئے

یہ ظلمت دور نہ ہوگی جب تک انقلاب نہ آئے اور انقلاب آ نہیں سکتا جب تک ضمیر نورانیت سے معمور نہ ہو۔ زبانی نعرے لگانے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔

کہاں ہے روشنی صبح انقلاب کہاں
ضمیر حضرت انساں کا آفتاب کہاں

پہلی تصویر پاک اور معصوم محبت کی سنہری جدول ہے۔اس کے چند شعر سنئے:

تو شرمائی جاتی ہے میری نظر سے
حجاب اور گل کو نسیم سحر سے

ادھر حسن میں گل کی نفاست ادھر عشق میں نسیم سحر کی نزہت و دل کشی و جاذبیت، تاہم حسن یکسر حیا و حجاب۔ یہ ہے صحیح نقطۂ اتصال حسن و عشق، دوسرے مصرعے کی نشست الفاظ، معجزانہ لہجہ سب پاک بازی کی قسمیں کھا رہے ہیں حجاب! اور گل کو نسیم سحر سے! ممکن ہے کہ مریم کی خوشی نے اس کے جذبات کی ترجمانی کچھ اس طرح کی ہو۔

حیا پہ حسن کی نہ جا نظر سے آشکار ہے
کہ عشق پاک باز کا اسے بھی اعتبار ہے

(اثر)

'غروبِ آفتاب کی تصویر'

دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا
فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
افق پر کرن خواب سا بُن رہی تھی
دوپٹے کو اپنے شفق چُن رہی تھی

سورج کی کرنوں کے مختصر او دھندلا ہونے کو خواب بُنتا کہنا اور غروبِ آفتاب کے بعد شفق کی سرخی کے آہستہ آہستہ سمٹ کر غائب ہو جانے کو دوپٹہ چُننے سے منسوب کرنا تخیل کی وہ نزاکتیں اور رعنائیاں ہیں جہاں مصور کا قلم قطعاً عاجز ہے اور جن پر اردو زبان جتنا فخر کرے بجا ہے۔

ذیل کے اشعار میں عورت کے ماں بننے سے پہلے کے جذبات کی بے مثل مصوری اور نفسیات کے اس عظیم الشان مسئلے کی طرف اشارہ ہے کہ صرف ماں کے مزاج اور کردار ہی کا نہیں بلکہ ان خیالات اور جذبات کے اثرات کا بھی بچے میں تفویض ہونا کا امکان ہے جو دوران حمل ماں کے دل و دماغ میں چکر کھاتے ہیں:

کوئی پہلوؤں میں پھڑکتا ہے جیسے
مری سانس میں دل دھڑکتا ہے جیسے
بدن میں ستاروں کی ہے سنسناہٹ
رگوں میں ہے ہلکی سی اک گنگناہٹ
نگاہوں پہ نشہ سا چھانے لگا ہے
ہر اک چیز پر پیار آنے لگا ہے

ایسی ہی ماں کی گود کا پالا عصر نو کا علمبردار ہو سکتا ہے۔

منظر نگاری کا ایک اور دل کش مرقع :

ہوائیں مشک بار ہیں فضائیں زر نگار ہیں
افق کے کوہسار میں شفق کے کے آبشار ہیں
نجومِ شاخِ کہکشاں فلک کے برگ و بار ہیں
یہ آب و باد وخاک کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

دوسرا مصرع جتنا نیا اتنا ہی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

افق کے کوہسار میں شفق کے آبشار میں
ہزاروں قوتیں مچل رہی ہیں جوئے بار میں
ہزاروں جلوے مسکرا رہے ہیں اک شرار میں
ازل سے بیقرار ہیں کسی کے انتظار میں
یہ آب و باد وخاک کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

پانی سے طاقت (Hydraulic Power) حاصل کرنے کے جس قدر ذرائع اور امکانات ہیں ، پہلے ہی مصرع میں سما گئے ہیں۔ برقی قوت یا بجلی کا خزانہ بھی یہی پانی ہے۔ جعفری صاحب کی شاعرانہ زبان میں 'ہزاروں جلوے مسکرا رہے ہیں اک شرار میں' موجوں کی بیقراری ایک محرم راز کا بے تابانہ انتظار ہے کہ ان کو خلق خدا کی فائدہ رسانی کے لیے چشمۂ فیض بنا دے۔

نیند کی نقاشی ۔

نیند ہے اک حسینہ
سرمئی آنکھیں ہیں، نیلگوں اس کا سینہ
اس کی پلکوں کے سایے میں خوابوں کی مدہوش پرچھائیاں کھیلتی ہیں
وہ غریبوں کی غم خوار، دکھیوں کی دلدار ہے
اور فرقِ مراتب سے بیزار ہے
رات کو آتی ہے
تھپکیاں دے کے سارے جہاں کو سلا جاتی ہے
بچوں کو لوریاں دیتی ہے
پھولوں کو پیار کرتی ہے اور سارے عالم پہ جادو بھری انگلیوں سے چھڑکتی ہے شبنم
اس طرح بزمِ فطرت کی ہر چیز کو
اک نئی زندگی بخشتی ہے
اک نئی تازگی بخشتی ہے

لفظوں کا دھیما صوتی لہجہ خود ہی نیند کی ترجمانی اور غنودگی طاری کر رہا ہے۔ بعض مصرعوں کے اجزاء کی تقسیم شاید اس سے بہتر ہو سکتی۔ میں اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔

ایک حزنیہ ۔

رخصت اے زندگی کی بہارو
رخصت اے جاودانی شرارو
رخصت اے آسمانی نظارو
رخصت اے چاند، سورج، ستارو
رخصت اے نیلگوں کوہسارو
رخصت اے نقرئی آبشارو
رخصت اے گنگناتی ہواؤ
رخصت اے مسکراتی فضاؤ
رخصت اے صبح اے شام رخصت

رخصت اے حسن گلفام رخصت
رخصت اے انقلابی جوانو
رخصت اے ہند کے باغبانو
جب نئے خاک میں رنگ بھرنا
ہم شہیدوں کو بھی یاد کرنا

مگر اس طرح تو میں پوری کتاب نقل کر جاؤں گا، جو ایک پیکر جمیل اور میرے اس شعر کی مصداق ہے۔

ساری ادائیں مختلف، پھر بھی تناسب آفریں
جیسے کہ ایک گیت میں سُر ہوں کئی ملے جلے

لہٰذا 'اب خموشی سخن سے بہتر ہے'۔ اس کا مصرع اولیٰ ہے ع
اپنی لذت میں گم ہوئے نغمے

اس طویل نظم میں کہیں کہیں خامیاں بھی نظر آئیں جن کی طرف نقاد کی حیثیت سے توجہ دلانا میرا فرض ہے۔

صفحہ 27 زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑتی ہے
اندھیرا سخت خموشی کا بار اٹھائے ہوئے

جعفری صاحب فقط خوش گو شاعر نہیں بلکہ شعر بہت سمجھ کر کہتے ہیں۔ میں نے کافی غور کیا لیکن تشفی نہیں ہوئی کہ انھوں نے 'پلکوں کی چھاؤں کے بدلے'' زلفوں کی چھاؤں' کیوں نہ کہا۔ یہ شعر تمہید ہے اس وقت کی جب زمین پر سے رات کا غلاف یا ٹوپ ہلکے ہلکے سرک رہا ہے۔ اور 'لمحات' جگنوؤں کی طرح ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ جگنوؤں کی جھپکتی روشنی اور پلکوں سے چھن چھن کر نکلنے والی روشنی میں تناسب قائم رکھنے کو غالباً 'پلکوں کی چھاؤں' کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اس کے باوصف میں اپنے خیال پر قائم ہوں کہ زمین پر رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑنا خلاف حقیقت ہے۔ پلکوں کی چھاؤں پڑے گی تو خود رات کے چہرے پر نہ کہ زمین پر۔ اب رہی جگنوؤں کے چمکنے سے مشابہت یا مناسبت، تو جس طرح پلکوں کی چلمن سے نور وظلمت ایک ساتھ چھنتے اور عکس فگن یا سایہ افگن ہو سکتے ہیں یہی کیفیت زلفوں کے حلقوں اور پیچ وخم سے پیدا ہو سکتی ہے بلکہ جہاں تک جگنوؤں کے اڑتے پھرنے اور سہمی سہمی شرمیلی جگمگاہٹ کا تعلق ہے ایسی جھلمل کرتی آنکھ مچولی کھیلتی روشنی مہیا کرنے کی صلاحیت زلفوں کی چھاؤں میں ہے۔ پلکوں کی چھاؤں اس سے قطعاً محروم ہے۔ شطرنجی (Chequered) اور جلد جلد بدلنے والی روشنی گویا درخت کی پتیوں

سے روشنی چھن چھن کرزمین پر سایہ ونور کے جال بن رہی ہے۔ زلفوں کے متحرک سایے میں ہوسکتی ہے نہ کہ پلکوں کے سایے میں۔

اسی طرح خموشی کے ساتھ 'سخت' کا استعمال شاعرانہ نہیں، سخت خموشی سے جعفری صاحب کی مراد گہری خاموشی ہے۔ مگر میرا ذوقِ شعری کہتا ہے کہ منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے 'سرد خموشی' کہنا کہیں زیادہ بہتر ہوتا۔ اس طرح خموشی برف کی طرح خنک اور بے حس لاش بن جاتی ہے جس کا پارہ پلایا ہوا لنگر جسے انگریزی میں (Dead Weight) کہتے ہیں، سنبھالنا سخت خموشی کی گراں باری سے زیادہ دشوار اور ایذا رساں ہے۔

صفحہ 41 'وہ نغمے پختہ ہو رہے ہیں اب تلک جو خام ہیں'۔ 'اب تلک' کے ہوتے زبان کا تقاضا ہے کہ 'خام ہیں' کی جگہ 'خام تھے' یہ الجھن ختم ہو جاتی اور فرقِ زمانی مٹ جاتا۔ اگر مصرع یوں موضوع ہوتا 'وہ نغمے پختہ ہو رہے ہیں جو ہنوز خام ہیں' اس میں ان لوگوں کے لیے درس بھی ہے جو لفظ ہنوز کو متروک سمجھتے ہیں۔

صفحہ 43 'جب وہ دنیا میں آئے گا تو ممتا کی محبت' ممتا کے معنی ہیں ماں کی محبت۔ اس کے ساتھ محبت کا اضافہ یقیناً غلط ہے۔ یہ مصرع آزاد نظم میں واقع ہے۔ اگر 'کی محبت' کا ٹکڑا نکال دیا جائے تو وزن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

صفحہ 48 'چکیاں چپ ہیں، خاموش ہیں گاؤں کی لڑکیاں، چوڑیاں گنگناتی نہیں'

چوڑیوں میں کھنک ہوتی ہے، نہ کہ گنگناہٹ۔ غالباً یہ عیب اس طرح مٹ جاتا۔

گاؤں کی لڑکیاں گنگناتی نہیں
چوڑیاں اب کھنکتی نہیں

اس حصۂ نظم میں قافیہ نہیں ہے ورنہ 'چوڑیاں کھنکھناتی نہیں' بھی کھپ سکتا تھا۔ گو کھنکتی کھنکھناتی سے فصیح تر ہے۔ کھنکھنانا روپے کے لیے زیادہ موزوں ہے۔

ممکن ہے جعفری صاحب کو خیال گزرے کہ چوڑیوں کا 'گنگنانا' صفحہ ۴۷ پر بھی نظم ہوا ہے۔ مگر وہاں اعتراض نہیں کیا گیا۔ میرا جواب یہ ہے کہ صفحہ ۴۷ پر ایک طرب انگیز منظر کی مصوری ہے جس میں آسمان ناچ رہا ہے۔ زمین توڑے لے رہی ہے، کھیت کٹ رہے ہیں، کھلیان لگ رہا ہے، چکیاں گھمر گھمر کر رہی ہیں، لڑکیاں گا رہی ہیں، چوڑیاں گنگنا رہی ہیں، چہرے آگ یا الاؤ کی آنچ میں تمتما رہے ہیں۔ لہٰذا خوشی کی ترنگ قائم رکھنے کو چوڑیوں کے کھنکنے کو گنگنانے سے تعبیر کرنا مناسب تھا۔ صفحہ ۴۸ پر جو

منظر ہے وہ الم ناک ہے، عصمتیں تباہ ہو رہی ہیں، عزتیں بک رہی ہیں، گولیاں چل رہی ہیں، بے گناہوں کے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، چکیاں خاموش ہیں، جو لڑکیاں گاتی تھیں گنگناتی بھی نہیں۔ یہ تغیر جعفری صاحب نے کیا ہے یعنی جو لڑکیاں گاتی تھیں، وہ گنگناتی بھی نہیں، مگر بدلے ہوئے منظر میں جہاں تک چوڑیوں کا تعلق ہے صرف گنگنانے کی نفی پر قانع ہو گئے۔ حالانکہ صناعانہ تقابل متقاضی تھا کہ جس طرح لڑکیوں کے گانے سے ایک درجہ گھٹا کر گنگنانے کی نفی بھی کی تھی، اسی طرح پہلے منظر کے بالعکس چوڑیوں کے گنگنانے کو ایک درجہ گھٹا کر اس کی بھی نفی کر دیتے اور چوڑیوں کے لیے یہ صورت کھنکنے کی نفی تھی۔ یعنی چوڑیوں کا گنگنانا کیسا اب کھنکتی بھی نہیں۔

اس ضمن میں میرے مجوزہ مصرعے میں لفظ 'اب' کی اہمیت بھی نظر انداز نہ ہونا چاہئے

صفحہ 58 'خاک کے بطن میں ان جنی کونپلیں ناچتی ہیں'

لفظ 'ان جنی' نہ صرف غیر شاعرانہ بلکہ فضول ہے کیونکہ جو چیز بطن میں ہے وہ نو زائیدہ ہے۔ یہ حصہ نظم آزاد میں ہے 'ان جنی' کا ٹکڑا نکال دینے سے وزن میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔

'کونپلیں ناچتی ہیں' کو 'کونپلیں اینڈتی ہیں' کہنا بہتر ہوتا۔ اینڈنے میں پھیلنے، بل کھانے کا مفہوم ہے، بانکپن بھی ہے نیز اس کی حرکت ناچنے سے خفیف تر ہے۔ بطن خاک میں کانپلوں کا آینڈنا کونپلوں کے ناچنے سے زیادہ حقیقت سے قریب اور شاعرانہ صداقت سے قریب تر ہوتا۔

صفحہ 58 'گیہوں اور دھان کی نرم ناپیدا شاخیں'

'ناپیدا' کا الف اس بری طرح دبتا ہے کہ روانی اور ترنم کا خون کئے دیتا ہے۔ صرف 'ناپید' میں (بغیر الف) عدم نایابی کا مفہوم ہے، پیدا کی محض نفی نہیں ہے۔ اس کے استعمال سے جعفری صاحب نے بجا طور پر احتراز کیا۔ شاید اس کا بدل 'اٹھلاتی' ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے بعد کا مصرع ہے 'رنگ اور نور میں کھیلنے کے لیے مضطرب ہیں' اٹھلانے میں شوخی و ناز و غمزہ ہے جو رنگ و نور میں کھیلنے پر ابھارتا ہے۔

صفحہ 73

یہ ہیں وہ لال جو نشانی تھے
اپنی ماں باپ کی محبت کی
آج سے یادگار ہیں لیکن
ملک اور قوم کی شجاعت کی

'محبت کے' اور 'شجاعت کے' کہنا چاہئے تھا (یائے مجہول بجائے یائے معروف) اہمیت لال کو

دینا ہے نہ کہ نشانی اور یادگار کو۔ علاوہ بریں فصاحت کا یہ بھی ایک گر ہے کہ جب حرف ربط اپنے متعلق اسم سے دور جا پڑتا ہے تو حرف ربط کی تانیث کو تذکیر سے بدل دیتے ہیں۔ کیونکہ کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ آتش کا مطلع ہے۔

معرفت میں اُس کی ذاتِ پاک کے
اڑتے ہیں ہوش وحواس ادراک کے

(یہ اعتراض صحیح ہے اور میں نے ترمیم قبول کر لی ہے۔ سردار)

نظریں اس طرح کیوں بجھ گئی ہیں
ہاتھ میں چوڑیاں کیوں نہیں ہیں

اس بند کے اشعار ماقبل اور مابعد میں قافیے کی قید ہے۔ مگر نقل کردہ شعر قافیے سے عاری ہے۔ غالبًا قافیے کی بنیاد 'گئی' اور 'نہیں' کے صوتی التباس پر رکھی گئی ہے۔ بعض شاعرانِ حال اسے جائز سمجھتے ہیں۔ مجبوری ہو تو وہ مختار ہیں مگر جب مصرعے میں قافیہ لایا جا سکتا ہے اور مطلب میں فرق نہیں پڑتا تو الزام سے بچ نہیں سکتے۔ مصرع یوں بدلا جا سکتا ہے۔ ع

'کس لیے نظریں سوئے زمیں ہیں'

نظروں کو بجھا ہوا کہنا بھی فصیح نہیں ۔ یہ تیور کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ علاوہ بریں ان کے مصرعے میں اس طرح کا ٹکڑا بھی حشو کی سرحد سے بہت دور نہیں۔

صفحہ 55 'بغل میں کرۂ ارضِ حسیں دبائے ہوئے' نظم بھر میں یہی ایک مصرع عذوبت سے خالی اور سامع خراش ہے۔ صحیح لفظ 'کرہ' بلا تشدید رائے مہملہ نہ کہ (کُرّہ) بروزن 'ذرّہ' جس طرح نظم ہوا ہے مصرع یوں بدلا جا سکتا ہے 'کرہ زمیں کا زیرِ بغل دبائے ہوئے'

صفحہ 164 'یہ چاندی کے پگھلے ہوئے آبشار'

آبشار پگھلے ہوئے نہیں ہیں بلکہ چاندی پگھلی ہوئی ہے۔ لہٰذا مصرع اس طرح موزوں کرنا چاہیے تھا۔ 'یہ پگھلی ہوئی چاندی کے آبشار'

صفحہ 175 گھٹاؤں میں تبدیل ہوگا دھواں
برسنے لگیں گے ستارے یہاں

ستاروں کا برسنا یا ٹوٹنا منحوس نہ سہی خطرناک ضرور ہے۔ بظاہر شاعر کا مافی الضمیر یہ ہے کہ دھواں گھٹا بن جائے گا۔ گھٹا برسے گی اور قطرہ ہائے آب ستاروں کی طرح چمکیں گے۔

گردوپیش کے اشعار سے کچھ واضح نہیں ہوتا کہ دھوئیں سے کیا مراد ہے اور دھواں گھٹا بن کر کیونکر منقل ہوگا۔ اور ستارے برسنے کی توجیہ کیا ہے۔ غالباً مدعا یہ ہے کہ جہاں اس وقت تاریکی چھائی ہوئی ہے اور فضا مکدر ہے وہاں نورانیت پھیل جائے گی۔ اگر میرا قیاس غلط نہیں تو مفہوم اس طرح ادا ہو سکتا تھا۔

جہاں آج کل گھٹ رہا ہے دھواں
چمکنے لگیں گے ستارے وہاں

ان تسامحات سے اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ تسامحات ہیں، نظم کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کیوں کہ مجموعی حیثیت سے یہ نظم قابلِ قدر اور اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ کاش دوسرے ترقی پسند ادیب اور شاعر ایسی ہی راہوں پر گامزن ہوں جو سردار جعفری صاحب نے نکالی بلکہ تراشی ہیں۔ تو میں ان کی تعریف میں بخل نہ کروں بلکہ ان کی ثنا وصفت کے ترانے گاؤں، کچھ اس انداز سے :

بہار ہے ترے عارض سے لو لگائے ہوئے
چراغ لالہ و گل کے ہیں جھلملائے ہوئے

فی الحال اس کے مخاطب صحیح سردار جعفری صاحب ہیں جن کی نظم کے مطالعہ کے دوران میں یہ مطلع بلا تکلف موزوں ہوگیا۔

(ماہنامہ مندر لکھنؤ)

شمارہ اپریل 1949

نوٹ: اس مضمون میں صفحات کے حوالے کتاب کے پہلے ایڈیشن پر نہیں ہیں۔

گریز داز صفِ ماہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست
نظیری

کردار

جاوید مریم

فرنگی نامہ بر

زندگی

تاریخ

وقت

موت

حرفِ اوّل

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اُڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے یہ رات سر اٹھائے ہوئے
سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مار سیاہ
سیاہ پھن ہیں یہ پھول مسکرائے ہوئے
سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہل رہی ہے زمیں
یہ عقاب سیہ آسماں پہ چھائے ہوئے
سیاہ سینوں کو تانے ہوئے سیاہ پہاڑ
سیاہ لوہے کی دیوار سی بنائے ہوئے
سیاہ وادی و صحرا سیاہ دریا ہیں
سیاہ دشت، یہ کھیت لہلہائے ہوئے
سیاہ فیکٹری کی سیاہ چمنی پر
یہ دھوئیں کے سیہ ابر تھرتھرائے ہوئے
یہ چراغ، یہ روشنی، سیاہ لویں
سیاہ گھر میں یہ جال سا بچھائے ہوئے
سیاہ کیڑوں کی مانند رینگتی مخلوق

سیاہ بھوت اندھیرے میں بلبلائے ہوئے
سیہ دوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں پر
سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے
نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے
سیہ نشاط کی بدمستیاں چرائے ہوئے
سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں
سیاہ بچوں کو آغوش میں سلائے ہوئے
سیہ فضا میں سیہ تیر سنسناتے ہیں
سیاہ تیر سیہ زہر میں بجھائے ہوئے
سیاہ دار، سیہ پھانسیاں، سیہ پھندے
سیاہ ہاتھ، سیہ گردنیں دبائے ہوئے
سیہ نشان بدن پر سیاہ کوڑوں کے
سیاہ زخم سیہ درد کو جگائے ہوئے
سیاہ جبر، سیہ عصمتیں، سیہ چیخیں
سیاہ عدل، سیہ کلغیاں لگائے ہوئے
سیاہ رنگ کے ساحر سیہ لبادوں میں
سیہ حصار، سیہ تیوریاں چڑھائے ہوئے
ضمیرِ عہدِ غلامی کی تیرگی ہے یہ رات
جو پھر رہی ہے اجالے سے منہ چھپائے ہوئے

کہاں ہے روشنیٔ صبحِ انقلاب کہاں؟
ضمیرِ حضرتِ انساں کا آفتاب کہاں؟

پہلی تصویر

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

میر

پہلی تصویر

(اندھیرے سے دو شکلیں ابھرتی ہیں۔ جاوید دولہا بنا ہوا اور مریم دلہن۔)

نہاں ابر میں چاند کب تک رہے گا
بھلا عشق سے حُسن کب تک چھپے گا
تو شرمائی جاتی ہے میری نظر سے
حجاب اور گل کو نسیمِ سحر سے
تو کیا میری فطرت کی محرم نہیں ہے؟
تو کیا میرے بچپن کی مریم نہیں ہے؟
گزاریں جو راتیں تری آرزو میں
سمٹ آئی ہیں کاکلِ مشک بو میں
جو پلکیں حیا سے جھکی جا رہی ہیں
وہ کچھ اور دل میں چُبھی جا رہی ہیں
ترے رخ پہ حسن و محبت کا ہالہ
یہی ہے مری زندگی کا اجالا
یہ شفاف آنکھیں یہ آنکھوں کے ڈورے
چھلک جائیں جیسے گلابی کٹورے
جو ہاتھوں کو رنگِ حنا مل گیا ہے
ہتھیلی پہ گویا کنول کھل گیا ہے

محبت کی راتوں کی قندیل تو ہے
جوانی کے خوابوں کی تکمیل تو ہے
یہ اک آنچ سی تیری نیچی نظر میں
ترے حسن سے روشنی میرے گھر میں
تکلم سے نغموں کی دنیا جگا دے
تبسم سے پھولوں کو ہنسنا سکھا دے

(مریم زیرِلب مسکراتی ہے)

تری مسکراہٹ میں کیا دلکشی ہے
یہ پھولوں پہ سوئی ہوئی چاندنی ہے
مگر روح کی پیاس کیوں کر بجھے گی؟
سمندر سے کیا صرف شبنم ملے گی؟
محبت ہے، نغمہ ہے، مے ہے، سبو ہے
مرے واسطے جو بھی کچھ ہے وہ تو ہے
تری خامشی کہہ رہی ہے فسانہ
تجاہل ہے تیرا بڑا عارفانہ
ہمارے دلوں کی ہے حسرت پرانی
ہماری شرابِ محبت پرانی
وہ گزری ہوئی شام ہے یاد اب تک
وہ ہے مرے سینے میں آباد اب تک
دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا
فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
دھندلکے کی پرچھائیاں ناچتی تھیں
ہر اک سمت انگڑائیاں ناچتی تھیں

افق پر کرن خواب سا بن رہی تھی
دوپٹے کو اپنے شفق چن رہی تھی
تری روح و دل پر تھے بادل سے چھائے
کھڑی تھی مرے پاس گردن جھکائے
مگر نکہتیں اپنی برسا رہی تھی
ترے پیرہن سے مہک آ رہی تھی
ترے سر سے آنچل جو ڈھلکا ہوا تھا
مرے خون میں ساز سا بج رہا تھا
اسی رات کی طرح پلکیں جھکی تھیں
دھڑکتا تھا دل اور نبضیں رکی تھیں
کیا پیار سورج نے جھک کر زمیں کو
سجایا ستاروں سے شب نے جبیں کو
پھسل کر سیہ زلف شانوں پر آئی
ترے رخ پہ اک شمع سی جھلملائی
مجھے تو نے دیکھا نگاہیں اٹھا کر
کہا پھر اشاروں میں کچھ مسکرا کر
سمجھ کر نگاہوں کا پیغام ہم نے
محبت کا پہلا پیا جام ہم نے
اسی جام نے ہم کو سرشار رکھا
ہماری تمنا کو بیدار رکھا
جدائی میں بھی صبر کرنا سکھایا
ہمیں آگ پر سے گزرنا سکھایا
مرادوں کی مانگی ہوئی رات ہے یہ
کہ بچھڑے ہوؤں کی ملاقات ہے یہ

(مریم جاوید کی طرف محبت بھری نظروں
سے دیکھتی ہے اور پھر پلکیں جھکا لیتی ہے۔
اس کی آنکھوں سے دو چمکتے ہوئے آنسو
ٹپک پڑتے ہیں اور چمپئی رخساروں پر
چاندی کی دو لکیریں سی کھنچ جاتی ہیں۔)

مریم

مری ساری دولت محبت کے آنسو

جاوید

محبت کے آنسو مسرت کے آنسو
یہ آنسو ہیں ٹوٹے دلوں کے سہارے
یہ تقدیرِ آدم کے روشن ستارے
تری ساری ہستی تری چشمِ نم میں
مرے گھر کی برکت ہے تیرے قدم میں
ہر اک رنج و راحت کی ساتھی ہے عورت
جہنم کو جنت بناتی ہے عورت
جبیں پر تجلی کی انجم فشانی
نظر میں زلیخا کی ہنستی جوانی
وہ مطلوب بھی ہے، طلب گار بھی ہے
وہ غم خوار بھی اور دل دار بھی ہے
وہ ہے ساز بھی، نغمہ بھی، نغمہ گر بھی
گلستاں بھی، گل بھی، نسیمِ سحر بھی

مریم

مجھے بھی تو ہے یاد وہ رات اب تک
ہیں مٹھی میں میری وہ لمحات اب تک
کلی کی طرح جو کھلے جا رہے تھے
جو گھل کر لہو میں ملے جا رہے تھے
تمنائیں لہراتی تھیں خواب بن کر
برستے تھے جگنو اندھیرے سے چھن کر
حجاب اٹھ گئے تھے زمان و مکاں کے
دریچے تھے وا لذت جاوداں کے
رگوں میں مری دوڑتے تھے شرارے
مرے گرد تھے رقص میں چاند تارے
وہ رات آئی تھی ایک طوفان بن کر
سمندر کے سینے کا ہیجان بن کر
محبت کی کیف آفریں رات تھی وہ
جوانی کی سب سے حسیں رات تھی وہ

جاوید

وہ رات آج تک حسن برسا رہی ہے
وہ رات آج کی رات لہرا رہی ہے

دوسری تصویر

باغ کے آغوش میں گل چاہئے
زندگانی میں تسلسل چاہئے

جعفری

دوسری تصویر

جاوید کا گیت

زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑتی ہے
اندھیرا سخت خموشی کا بار اٹھائے ہوئے
ہوا میں اڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح
فضا کے سینے میں اک آگ سی لگائے ہوئے
سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملی پردے
نکل رہا ہے کوئی جسم کو چرائے ہوئے
ابھر رہا ہے کوئی وقت کے تلاطم سے
جبیں پہ قوس قزح کی کماں جھکائے ہوئے
خمار نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل
ہتھیلیوں پر حنا کے کنول جلائے ہوئے
مری جوان تمنا کے شوخ پھولوں سے
سیاہ زلف کو گوندھے ہوئے سجائے ہوئے
وہ دھندلے دھندلے ستاروں کے نرم جھرمٹ میں
کنارے سرخ دوپٹے کے جگمگائے ہوئے
دھڑکتے سینے پہ آنچل کی ریشمی شکنیں
گزشتہ شب کی حسیں چاندنی چھپائے ہوئے

سڈول اور سبک بازوؤں کی لرزش میں
شباب وشعر کی انگڑائیاں دبائے ہوئے
کھڑی ہے خواب وفسانہ کی سرحدوں کے قریب
اندھیری رات کے دل میں چمن کھلائے ہوئے
وفا کے جوش سے چہرے پہ روشنی دل کی
حیا کے رنگ سے رخصار تمتمائے ہوئے
بھنوؤں پہ جتنی ہے انکار کی حسیں شکنیں
لبوں پہ اتنے ہی اقرار مسکرائے ہوئے

مریم

یہ مانا محبت کی منزل ہے عورت
تڑپتا مچلتا ہوا دل ہے عورت
پر اس کے زمان و مکاں اور بھی ہیں
'ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'
ابھرتی ہوئی وقت کے ساحلوں سے
گزرتی ہے وہ کتنی ہی منزلوں سے
کبھی جام بن کر چھلکتی ہے عورت
کبھی اشک بن کر چمکتی ہے عورت
وہ بس چند لمحوں کی ہمدم نہیں ہے
کہ عورت فقط شہد وشبنم نہیں ہے
تبسم نہیں صرف، تلوار بھی ہے
وہ نغمہ نہیں صرف، جھنکار بھی ہے
محبت کی مسند پہ حسن وجوانی
شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی

وہ شمعِ شبستاں ہے نورِ سحر ہے
وہ ہر گام پہ مرد کی ہمسفر ہے
مگر سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ ماں ہے
وہ تخلیق کے دل کا سوزِ نہاں ہے
صدف کی چمک میں ہے موجِ گہر بھی
کلی میں نہاں گل بھی ہے اور ثمر بھی
نگاہوں میں ہے شوخیٔ دلبرانہ
جبیں پر مگر عظمتِ مادرانہ
وہ عورت کی جسمانیت کی چمک ہے
یہ عورت کی روحانیت کی جھلک ہے
جوانی کو شاداب کرتی ہے عورت
محبت کو سیراب کرتی ہے عورت
ہے انسان کی کائنات اس کے دم سے
فروزاں ہے شمعِ حیات اس کے دم سے
جس آنچل کو بچے پہ وہ ڈالتی ہے
جس آغوش میں طفل کو پالتی ہے
اس آنچل میں ہے زندگی کا شرارہ
وہ آغوشِ تہذیب کا گاہوارہ
محبت کی راتوں کی شیرینیوں کو
جوانی کی پر کیف رنگینیوں کو
نگاہوں کے رس کو لبوں کی شکر کو
مہکتے تبسم کے گل ہائے تر کو
نیا رنگ اور روپ دیتی ہے عورت
نئی شکل میں ڈھال لیتی ہے عورت

جاوید

جو کونپل تھی کل اب ہے پھولوں کی ڈالی
تو ہے میرے بچے کی ماں بننے والی

مریم

کوئی پہلوؤں میں پھڑکتا ہے جیسے
مری سانس میں دل دھڑکتا ہے جیسے
رگ و پے میں کوئی سمایا ہوا ہے
مری روح پر رنگ چھایا ہوا ہے
کوئی دل میں انگڑائیاں لے رہا ہے
مرے خون میں کشتیاں کھے رہا ہے
بدن میں ستاروں کی ہے سنسناہٹ
رگوں میں ہے ہلکی سی اک گنگناہٹ
مرے ذہن میں چل رہی ہیں ہوائیں
امنڈتی ہوں جیسے سنہری گھٹائیں
بگڑتی ہیں، بنتی ہیں، شکلیں فضا میں
مہکتے ہیں لاکھوں شگوفے ہوا میں
یہ اک موج طوفاں ہے جو بڑھ رہی ہے
ندی دم بدم دم بدم چڑھ رہی ہے
نگاہوں پہ نشہ سا چھانے لگا ہے
ہر اک چیز پر پیار آنے لگا ہے
زمیں، آسماں، چاند، سورج، ستارے
مجھے دور سے کر رہے ہیں اشارے
بہاریں مری رازداں ہو گئی ہیں
ہوائیں مری ہم زباں ہو گئی ہیں

نسیم سحر گدگداتی ہے مجھ کو
کلی دیکھ کر مسکراتی ہے مجھ کو
اک ارمان آغوش میں پل رہا ہے
تصور مرا گھٹنیوں چل رہا ہے
لہو ناچتا ہے رگیں ٹوٹتی ہیں
مرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں

جاوید

حیاتِ بشر ہے بڑی شاعرانہ
محبت ہے جس کی بقا کا بہانہ
وہ نغمہ جو بنتا ہے سرگوشیوں سے
جو ہوتا ہے پیدا ہم آغوشیوں سے
لرزتی ہیں پلکیں، سمٹتے ہیں ابرو
پھڑکتے ہیں پہلو، مچلتے ہیں بازو
تڑپتے ہیں دل اور دھڑکتے ہیں سینے
جوانی نکلتی ہے لے کر سفینے
چمکتے ہیں ماتھے، دمکتے ہیں چہرے
مہکتے ہیں پھولوں کے شاداب سہرے
نکھرتا ہے صندل، جھلکتی ہے افشاں
لچکتی ہیں شاخیں، چٹکتی ہیں کلیاں
ابھرتے ہیں جلوے بکھرتے ہیں جلوے
نکھرتے ہیں جلوے سنورتے ہیں جلوے
ڈھلکتے ہیں گیسو، سرکتے ہیں آنچل
امنڈتے ہیں بادل، برستے ہیں بادل

یوں ہی اڑ رہا ہے نشاں زندگی کا
تھکتا نہیں کارواں زندگی کا
تسلسل حقیقت، تسلسل فسانہ
تسلسل ہی ہے زندگی کا ترانہ
کرن سے کرن اس طرح پھوٹتی ہے
کہ جس طرح سے پھلجھڑی چھوٹتی ہے۔

تیسری تصویر

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

اقبال

تیسری تصویر

(مریم پھٹے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑوں سے اپنے ہونے والے بچے کے لیے ایک چھوٹا سا کرتا سی رہی ہے۔ کپڑے کے ٹکڑے مختلف رنگوں کے ہیں)

پس منظر سے کورس کی آواز

زندگی کا ترانہ

یہ آب وخاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہوائیں مشک بار ہیں فضائیں زرنگار ہیں
افق کے کوہسار میں شفق کے آبشار ہیں
نجومِ شاخِ کہکشاں فلک کے برگ وبار ہیں
یہ آب وخاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ترانہ ہائے چنگ ہیں سرودِ موج گنگ میں
بتانِ آذری مچل رہے ہیں خشت وسنگ میں

سفینہ آفتاب کا رواں ہے نور و رنگ میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہمالیہ کی چوٹیاں فلک سے ہمکنار ہیں
حقیر جن کے سامنے جہاں کے تاجدار ہیں
یہ ایشیا کی آبرو یہ ہند کا وقار ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

تڑپ رہی ہے موج بحرِ عشق ماہتاب میں
ہمیشہ کشمکش میں ہے ہمیشہ اضطراب میں
ہمیشہ سوز و ساز میں ہمیشہ پیچ و تاب میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

نسیمِ صبح نکہتوں کے کارواں لیے ہوئے
شمیمِ گل سرورِ قلب و کیفِ جاں لیے ہوئے
سرور و کیف میکدے کی مستیاں لیے ہوئے
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

دہکتے عارضوں کا رنگ کاکلوں کی چھاؤں میں
مہکتے آنچلوں کا رقص ریشمی ہواؤں میں
لچکتے قامتوں کی تھرتھراہٹیں فضاؤں میں

یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

لبوں میں شہد انکھڑیوں میں رس شراب ناب کا
رباب زندگی کا پہلا زمزمہ شباب کا
سبق دلوں کے مکتبوں میں عشق کی کتاب کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

جواں لبوں کی مسکراہٹوں میں گل فشانیاں
عرق عرق جبیں کی تابشوں میں کہکشانیاں
شکستِ حسن میں بھی فتحِ حسن کی کہانیاں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

چمن میں گونجتا ہے نغمہ بلبلِ حیات کا
شگفتہ اور رنگ ہو گیا گلِ حیات کا
طفولیت میں معجزہ تسلسلِ حیات کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہزاروں قوتیں مچل رہی ہیں جوئبار میں
ہزاروں جلوے مسکرا رہے ہیں اک شرار میں
ازل سے بیقرار ہیں کسی کے انتظار میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے

اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

ہیں ذرہ ہائے آتشیں سرشتِ کائنات میں
رواں انھیں کا گرم خون ہے رگِ حیات میں
مگر یہ قوتیں ہیں آج آدمی کے ہات میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

شکستہ ہے ہر ایک حلقہ قسمتوں کے دام کا
فضائے نیلگوں پہ سکہ ہے بشر کے نام کا
یہ مہر و ماہ مشتری؟ سفر ہے ایک گام کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

یہ برق و باد و رعد سب اسیر ہیں غلام ہیں
عمل کے میکدے میں کامرانیوں کے جام ہیں
وہ نغمے پختہ ہو رہے ہیں اب تلک جو خام ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

سوار دوشِ کہکشاں پہ ہو رہا ہے آدمی
توہمات کی سیاہی دھو رہا ہے آدمی
خوشی کی مے میں اپنے غم ڈبو رہا ہے آدمی
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

مگر غلام قوم کی گھٹی ہوئی ہے زندگی
مثال شمع مفلسی بجھی ہوئی ہے زندگی
سیاہیوں کے درمیاں گھری ہوئی ہے زندگی

اگرچہ یہ جہانِ آب و گل بہت حسین ہے
مگر غموں سے چور چور سینۂ زمین ہے

(شور نعرے بندوقیں چلنے کی آوازیں)

مریم

ہر طرف شورِ محشر بپا ہے
شہر میں جانے کیا ہو رہا ہے

(داخل ہوتے ہوئے)

جاوید

تو کہ رنگین خوابوں میں کھوئی ہوئی ہے
اتنی غافل ہے گویا کہ سوئی ہوئی ہے
دیکھ اس ننھی منی سی جاں کو
جو ترے دل کے نیچے ترے نرم اور گرم پہلو کے گہوارے میں
بے خبر سو رہی ہے
جس کے جسم اور جاں کی ترے خون سے
پرورش ہو رہی ہے
جب وہ دنیا میں آئے گا تو ماںتا کی محبت
ترے شفاف سینے سے اک دودھ کی نہر بن کر بہے گی
ترے شفاف سینے کی نوخیز کلیاں

جو محبت کی راتوں میں کھل اٹھتی تھیں پھول بن کر
نور سے جن کے دیوار و در جگمگاتے تھے
اور شرما کے چاند ابر میں منہ چھپا لیتا تھا
اب انھیں چھاتیوں میں تری مامتا کلبلائے گی اور تو محبت سے بچے کو آغوش میں بھینچ لے گی
اور وہ فرطِ مسرت سے ننھی سی بانہیں اٹھا کر
ڈال دے گا ترے چاند سے اس گلے میں کہ جس سے مرے گرم بوسے گلوبند کی طرح لپٹے ہوئے ہیں
اور جب اپنے ہونٹوں سے وہ پولے پولے پئے گا ترا دودھ تو نو مہینے کی کاری مشقت کی ساری تھکن
تیری رگ رگ سے کھنچ آئے گی
اور تجھے
اپنی بھرپور اٹھتی جوانی کا احساس ہوگا
جب وہ سوتے میں دیکھے گا، پریوں کے خواب
اور آہستہ سے، زیرِ لب مسکرائے گا، تو تجھ کو معلوم ہوگا، کہ ان ننھے معصوم ہونٹوں میں، دنیا کے سارے خزانے سمٹ آئے ہیں
پھر وہ جب گھٹنیوں چلنا سیکھے گا، اور ٹوٹے ٹوٹے ہوئے لفظ تتلا کے بولے گا تو تجھ کو محسوس ہوگا، کہ تخلیق کا رقص و نغمہ، سمٹ کر تری گود میں آ گیا ہے

یہ خوشی وہ ہے کہ جس کے مقابل، زمانے کی جتنی بھی خوشیاں ہیں سب ہیچ ہیں
لیکن اس ملک میں جس کو ہندوستاں کہتے ہیں
یہ خوشی بھی میسر نہیں
ہر طرف کال کی آندھیاں چل رہی ہیں۔
خاک سے اٹھ رہے ہیں وباؤں کے کالے بگولے

موت کی ڈائنیں چیختی اور چنگھاڑتی پھر رہی ہیں
مائیں بچوں کو آنچل کے نیچے چھپائے خوف سے کانپتی ہیں
ان کے کانوں میں ہر سمت سے یہ بھیانک صدائیں چلی آ رہی ہیں
'سوکھ جائیں گے ماؤں کے شاداب سینے
اور بچوں کے ہونٹوں سے اڑ جائے گی مسکراہٹ
ریگ زاروں میں تبدیل ہو جائے گا یہ چمن
دودھ کی جس سے نہریں رواں ہیں'
اور پھر تو بھی مریم
میری مریم
میرے بچے کی ماں
تو بھی بنگال کی سیکڑوں عورتوں کی طرح اپنے روتے ہوئے لال کو دل کے
ٹکڑے کو سنسان راہوں کی جلتی ہوئی خاک پر ڈال
کر بھاگ جائے گی ان قحبہ خانوں میں، جن میں
روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے کی خاطر جواں
عصمتیں گوشت کے لوتھڑوں کی طرح بک رہی ہیں
تیرے مظلوم بچے کی چیخیں
دور تک تیری پرچھائیوں کا تعاقب کریں گی
خواب میں روح کو تیری آ کر جھنجھوڑیں گی لیکن
تو کسی قحبہ خانے میں روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے کی خاطر
اپنے دل، جسم اور روح کو بیچ دے گی
اپنے ہاتھوں سے خود اپنی ہی مامتا کا گلا گھونٹ دے گی۔

مریم

آہ! ظالم حکومت

جاوید

روٹیاں شاخِ طوبیٰ میں پھلتی نہیں
روٹیاں بادلوں سے برستی نہیں
وحی والہام بن کر اترتی نہیں
روٹیاں، گندمی روٹیاں، سرخ سونے کے ترشے ہوئے گول ٹکڑے
چاند کی طرح گول اور سورج کی مانند گرم
آہ یہ روٹیاں آسمانوں میں پکتی نہیں
یہ ہیں انساں کے ہاتھوں کی تخلیق
اس کی صدیوں کی محنت کا پھل
چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ایک دہقاں
اپنے لکڑی کے ہل اور لوہے کے پھل سے
کھیت کو جوتتا ہے
اپنی آنکھوں میں صدیوں کی بے چارگی، مفلسی اور تھکن لے کے آتا ہے
اور خاک سے پھوٹتی کونپلوں کو بڑے پیار سے دیکھتا ہے
اپنے روتے بلکتے ہوئے شیرخواروں کا دکھ بھول کر
اپنے ہاتھوں سے، بڑھتے ہوئے سبز پودوں کو، اس شوق سے سینچتا ہے
جیسے وہ اس کی گودوں کے پالے ہوئے لال ہیں
اور پھر نرم شاخوں میں گیہوں کے خوشے
موتیوں کی طرح پھلتے ہیں
اور دہقان کی روح بیتاب ہو کر انھیں چومتی ہے ——
آسماں ناچتا ہے زمیں گھومتی ہے
کھیت کٹتے ہیں، کھلیان لگتے ہیں، پھر چکیاں گاتی ہیں، لڑکیاں گاتی ہیں
کتنے ہی ہاتھوں میں لاکھ اور کانچ کی چوڑیاں گنگناتی ہیں
اور آگ کی آنچ میں تمتماتے ہیں رخسار
اس طرح گیہوں کے چاند سورج

گاؤں میں، شہر میں، ہر جگہ جگمگاتے ہوئے چولہوں پر ناچتے ہیں
روٹیاں، گندمی روٹیاں، سرخ سونے کے ترشے ہوئے گول ٹکڑے
چاند کی طرح گول اور سورج کی مانند گرم
روٹیاں شاخ طوبیٰ میں پھلتی نہیں
روٹیاں بادلوں سے برستی نہیں
وحی و الہام بن کر اترتی نہیں
یہ ہیں انسان کے ہاتھوں کی تخلیق
لیکن اس وقت انسان کے ہاتھوں کی پکی ہوئی روٹیوں کے لیے
عصمتیں بک رہی ہیں
عزتیں بک رہی ہیں
گولیاں چل رہی ہیں
خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں
چکیاں چپ ہیں، خاموش ہیں، گاؤں کی لڑکیاں، چوڑیاں گنگناتی نہیں
کھیت کٹتے ہیں اب بھی
اور کھلیان لگتے ہیں اب بھی
لیکن اب گاؤں ویران ہیں
چور بازار کی رونقیں بڑھ رہی ہیں
لڑکیاں چکیاں چھوڑ کر دربدر ٹھوکریں کھا رہی ہیں
اور دہقاں کی آنکھیں جو پتھرا رہی ہیں
اپنی صدیوں کی بیچارگی، مفلسی اور تھکن کو لیے
اپنے بچوں کو فاقوں سے مرتے ہوئے دیکھتی ہیں
دیکھیے تو ظالم انگریز کے راج میں
بھوک اور موت کے سائے میں
کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ ! ظالم حکومت

جاوید

دیکھ اپنے برہنہ بدن کو
نوجوانی کے دلکش چمن کو
جس پر افلاس رنگ خزاں کی طرح چھا گیا ہے
تیرا پیونداور چیتھڑوں کا یہ ملبوس سوکھی ہوئی پتیوں کی طرح ہنس رہا ہے
اور تو مجھ کو ایسی نظر آ رہی ہے
جیسے پت جھڑ کے موسم میں پھولوں کی روتی ہوئی ڈالیاں ہوں
ہم ہیں اس ملک کے رہنے والے
جس کے ڈھاکے کی ململ پہ دھوکا ہو آب رواں کا
ہم وہ تن زیب بنتے ہیں جس سے جواں جسم کی جوت بادل سے
چھنتی ہوئی چاندنی کی طرح پھوٹتی ہے
جامدانی کی نازک سبک چولیاں
جن کے ہر تار میں مسکراتی ہیں بیلے کی کلیاں
اوراس سے زیادہ حسیں کامدانی کے آنچل
چھاؤں میں جن کی سوتے ہیں تارے
اور وہ کشمیر کے ریشمی پیرہن
جن پہ قربان سنجاب و دیبا و اطلس
گرچہ یہ سب ہیں ملبوس ہندوستاں کے مگر ہم غلاموں کو ان کے
پہننے کا حق ہی نہیں
ان کا اب ذکر بے کار ہے
دست کاروں کے زخمی انگوٹھے
ڈیڑھ سو سال سے ظلم کی داستاں سہہ رہے ہیں

ہم کو تو کارخانے کا لٹھا
چھینٹ کا ایک ٹکڑا
موٹے کھدر کا کرتا
اور گاڑھے کا بھدا کفن بھی میسر نہیں
سر کھلی عصمتیں پھر رہی ہیں
بے کفن میتیں سڑ رہی ہیں
ہاں مگر چور بازار میں 'دیش بھگتی' کے بوروں میں لپٹے ہوئے
تھان کے تھان رکھے ہوئے ہیں
دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں
بھوک اور موت کے سائے میں
کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ! ظالم حکومت

جاوید

اپنے آباواجداد کی اس زمیں پر
اس بہشتِ بریں پر
ہم کو اب چین سے سانس لینے کا حق بھی نہیں ہے
دیکھتا ہوں میں جب اپنے گھر کو
اس کے دیوار و در کو
اس کی گرتی ہوئی ٹوٹی چھت کو تو محسوس ہوتا ہے یہ گھر نہیں جیل کی کوٹھری ہے
جس کی دیواروں سے تیرگی رس رہی ہے
یہ مکاں کیا ہے بیماریوں اور وباؤں کا گہوارہ ہے
اس کے کونوں میں ہر طرح کی لعنتیں پل رہی ہیں

لیکن ایسے بھی انسان ہیں جن کو یہ کوٹھری بھی میسر نہیں ہے
ان کے سر پر ہے چھت آسماں کی
اور چاروں طرف دھوپ گرد اور بارش
غصے میں پیچ اور تاب کھاتے عناصر کی دیوار ہیں
کتنی ہی عورتیں کتیوں اور بلیوں کی طرح اپنے بچے گلی کوچوں میں جن رہی ہیں
ہم سے بہتر ہیں کیڑے مکوڑے
ان کے سر پر ہری گھاس کے سائباں ہیں
سبز پیڑوں کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں طائروں کے حسیں آشیاں ہیں
سانپ بچھو بھی آرام سے رہتے ہیں اپنے اپنے بلوں میں
بھیڑیے اور گیدڑ پہاڑوں کے غاروں میں اور جنگلوں کے درختوں کے نیچے
دھوپ گرد اور بارش سے بچ کر بڑے چین سے سوتے ہیں
لیکن انسان، معمار و خلاق انسان
آج انگریز کے راج میں گھر سے بے گھر ہوا ہے
دستِ فطرت نے کہسار و دشت و بیاباں بنائے
آدمی نے گلستاں بنائے
اپنے بازو کی قوت سے قصر اور ایواں بنائے
اس نے پتھر میں محراب کا لوچ مینار کا حسن پیدا کیا
اور دیوار کو استقامت عطا کی
جن کے دروازے آغوشِ محبوب کی طرح وا ہو رہے ہیں
لیکن انگریز کے راج میں
ظالم انگریز کے راج میں
آج معمار و خلاق انساں
گھر سے بے گھر ہوا ہے

مریم

آہ! ظالم حکومت

جاوید

تیری ہم عمر کتنی ہی مائیں
کوئلے اور لوہے کی کانوں میں اپنی شکستہ جوانی سے لپٹی ہوئی رو رہی ہیں
ان کے بچوں کی معصومیت چھن چکی ہے
دیو ہیکل مشینوں نے لوہے کے دانتوں سے ان کی خوشی کو چبا ڈالا ہے
دیو ہیکل مشینوں کو انسان نے سیکڑوں سال کی کشمکش اور مشقت سے پیدا کیا ہے
تب کہیں جاکے لوہے کے یہ ہاتھ حاصل کئے ہیں
جن کی نبضوں میں بجلی کی لہروں کا خوں دوڑتا ہے
وہ اگر چاہیں کوہِ گراں کو اٹھالیں
کہکشاں کو زمیں پر بچھالیں
کام کی لمبی گھڑیوں کو لمحوں میں تبدیل کر کے فراغت کی مدت بڑھا دیں
مفلسی اور بے کاری سب کچھ مٹا دیں
خاک کو سونا پتھر کو پارس بنادیں
لیکن ان آہنی ہاتھوں میں آج 'سرمائے' نے چاندی کی
ہتھکڑی ڈال دی ہے
کارخانوں کے دل سے دھواں اٹھ رہا ہے
اور مشینوں کے اعصاب جکڑے ہوئے ہیں
سخت لوہے کی نبضوں میں بجلی کا خوں جم گیا ہے
اور بیمار 'سرمایہ داری'
خون پی پی کے قے کر رہی ہے

مریم

آہ! ظالم حکومت

جاوید

آج انسان کی ان کنیزوں ——— مشینوں ——— کی طاقت پہ
'سرمایہ داری'

کتنی اترا رہی ہے
وہ مشینوں سے انسان کے دل کو بر مار رہی ہے
اور فراغت نہیں بلکہ بے کاری پھیلا رہی ہے
کالے کالے دھوئیں کے گھنے بادلوں سے وہ دولت کے موتی نہیں
مفلسی کے جراثیم برسا رہی ہے
دیکھ، کس طرح مزدور جو جسم پر پیرہن کی جگہ اپنی ہی کھال پہنے
ہوئے پھر رہے ہیں
صبح سورج کی پہلی کرن پھوٹتے وقت اپنے اندھیرے بلوں
سے نکلتے ہیں اور کارخانوں میں جا کر
اپنا اور اپنے بچوں کے دل کا لہو بادۂ ارغوانی میں تبدیل کر کے
خون آشام سرمائے کے جام میں ڈالتے ہیں
شام کو کارخانے اگل دیتے ہیں ان کو جھلسی ہوئی راکھ کا ڈھیر کر کے
اور پھر رات کے وقت طاعون، دق اور سل کے یہ بھوت
موت کے بھیڑیوں کی طرح آتے ہیں اور بھوکے دلوں اور سوکھی ہوئی
ہڈیوں کو چبا ڈالتے ہیں

دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں
بھوک اور موت کے سائے میں
کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ! ظالم حکومت

جاوید

آج 'سرمایہ داری' وہ چنچل حسینہ نہیں جس کی بنیاد پر بوڑھی
'جاگیرداری' خفا تھی
جو ہواؤں سے لڑتی تھی طوفان سے کھیلتی تھی
جو سمندر میں دھوتی تھی زلفیں
گوندھ کر ان میں سورج کی کرنیں
صبح سے شام تک ناچتی تھیں
اجنبی دیس کے اجنبی ساحلوں پر
قہقہے مارتی تھی
آج 'سرمایہ داری'
بوڑھی قحبہ ہے دلّالی ہے پیشہ اس کا
اب وہ اک سانس لیتی ہوئی لاش ہے
سالہا سال سے سڑ رہی ہے
قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوئی ہے
اس نے اپنی جوانی میں اپنی غلط کاریوں سے
کتنے بچے جنے ہیں
بھوک، بیکاری، افلاس، قحط و وبا، جہل، وہم، آتشک، بینک،
زہریلی گیس اور ایٹم کے بم اس کی گودوں کے پالے ہوئے ہیں
اب یہ بچے جواں ہو گئے ہیں
زندگی کے لیے اک بلا ہو گئے ہیں
اور 'سرمایہ داری' کی بوڑھی چھنال ان کی طاقت سے انسانیت کا
لہو پی رہی ہے

مریم

ظلم اور جبر پہ جی رہی ہے

جاوید

آج ہندوستاں میں کوئی خوش نہیں ہے
پیٹ کو روٹی، ہاتھوں کو کام اور تن ڈھانکنے کے لیے چیتھڑے بھی نہیں ہیں
خالی جو ہاتھ ہوں گے وہ بیکار کب تک رہیں گے؟
اک نہ اک روز تلوار پر جائیں گے
ہونٹ خاموش رہتے نہیں
وہ محبت کے بوسوں اور آسودگی کے ترانوں سے محروم ہوں گے تو مجبور ہو کر
انقلاب اور بغاوت کے چھیڑیں گے نغمے
اور آزادی کے زمزمے گائیں گے
آج ایک ایک دریا میں طوفان ہے
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہے
ذرہ ذرہ بغاوت پہ آمادہ ہے
سیکڑوں اور ہزاروں مجاہد قدم قدم کو ملائے ہوئے بڑھ رہے ہیں
گولیاں سنسناتی ہیں اڑتے ہیں پرچم
بادشاہی کے گھر میں ہے ماتم
موت کی چھاؤں میں زندگی رقص فرما رہی ہے

مریم

مرحبا

جاوید

عہدِ نو آ رہا ہے

دولتیں، برکتیں، راحتیں ملا تمیں لا رہا ہے
خاک کے بطن میں ان جنی کونپلیں ناچتی ہیں
کھیتیاں لہلہانے کو بیتاب ہیں
گیہوں اور دھان کی نرم ناپیدا شاخیں
رنگ اور نور میں کھیلنے کے لیے مضطرب ہیں
خاک چلا رہی ہے کہ 'جاگیردار اور زمیندار نے اپنے ناپاک
قدموں سے مجھ کو نجس کر دیا ہے'
خارزار اور بنجر زمینیں
کہہ رہی ہیں کہ 'گنگا کے پانی سے دھو دو ہمیں
پاک اور صاف کر دو ہمیں
تا کہ ہم اپنے مخمل کے پیراہنوں کو پہن کر
جشنِ صبحِ بہاراں منائیں'
اور دھرتی کے سینے میں کانوں کے اندر
کتنی دھاتیں ہیں جو کروٹیں لے رہی ہیں
ان کے جوہر میں جنبش ہے اور دل میں ارمان یہ ہے
'کوئی آ کر ہمیں قیدِ فطرت سے آزاد کر دے
ہم مشینوں کی صورت میں انسان کی خدمت کریں گے'
ان کی آنکھوں میں اک خواب سا لہرا رہا ہے
ریشم اور سوت کے کارخانے
ابر کی طرح دھنکی ہوئی روئی کے نرم گالے
ناچتی چرخیاں، گنگناتی ہوئی تکلیاں، سیکڑوں رنگ کے تانے بانے
جیسے سورج کی رنگین کرنیں
اپنی لاکھوں لچکتی ہوئی انگلیوں سے
آسمانوں پہ قوسِ قزح کی حسیں چادریں بن رہی ہوں

ملک کے سنگ اور خشت میں
سرخ پتھر کی اونچی چٹانوں کے دل میں
کتنی محرابیں انگڑائیاں لے رہی ہیں
کتنے دیوار و در، کتنے مینار جو سنگ مرمر کے سینے میں سوئے ہوئے ہیں
جو عدم کے اندھیرے میں کھوئے ہوئے ہیں
آج انسان کے دست تعمیر کے منتظر ہیں
کاش صناع و معمار انھیں ان کے خواب گراں سے جگا دیں
سنگ اور خشت کے ڈھیر کو قصر و ایواں بنا دیں
ہم اجنتا کے نقاش، بت گر ایلورا کے معمار ہیں تاج اور سیکری کے
ہم وہ صناع ہیں انگلیاں جن کی پتھر کو بھی موم کر کے سبک اور حسیں
شکل میں ڈھالتی ہیں

لیکن ان انگلیوں کو
ڈیڑھ سو سال کی مفلسی اور غلامی
ڈیڑھ سو سال کی کوڑھ نے کھا لیا ہے

آج ہندوستاں جاگ اٹھا ہے
یہ حسیں بوستاں جاگ اٹھا ہے
اس کی انسانیت اور روحانیت جاگ اٹھی ہے
بچے گہواروں سے رینگ کر آج باہر نکل آئے ہیں
اور انگریز سے اپنا کھویا ہوا بھولا پن مانگتے ہیں
عورتیں اپنی کھوئی ہوئی عصمتیں
مائیں بے آب سینوں کی شادابیاں مانگتی ہیں
دست کار اپنے مضبوط انگوٹھے
اور صناع و معمار اپنی سبک انگلیاں مانگتے ہیں
جنگ آزادی میں لڑنے والے سپاہی

کارخانوں کے مزدور کھیتوں کے دہقاں
اپنے دریا و دشت و جبل اپنا ملک و وطن مانگتے ہیں
یہ حسیں بوستاں ہے ہمارا
سارا ہندوستاں ہے ہمارا
ہم اس اپنے وطن، اپنے گلزار میں، اور کچھ بھی نہیں،
صرف جینے کا حق مانگتے ہیں۔

چوتھی تصویر

آج سے کوچہ و بازار میں مرنا ہے روا
ظلم کی چھاؤں میں چپ بیٹھ کے جینا ہے حرام

جعفری

چوتھی تصویر

تاریخ کا ترانہ

میں نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
آگ کے پھول ، آگ کے گلزار
انکھڑیوں کے دہکتے انگارے
آہ کے شعلے آنسوؤں کے شرار

روم و یونان کے غلام اٹھے
شیر ا پنجروں سے جیسے چھوٹ گئے
ظالموں کے محل لرزنے لگے
ہاتھ تھرّائے ،جام ٹوٹ گئے

آج تک گونجتے ہیں کانوں میں
ہم ہے جاگتے کسانوں کے
روح میں میری زخم ہیں پنہاں
عہد وسطیٰ کے باغبانوں کے

میں نے دیکھیں طلوع ہوتی ہوئی
غازیوں کی حسین تلواریں
میری آنکھوں کے سامنے بیٹھیں
نخسوں کی بلند دیواریں

میری نظروں کے سامنے گزرے
انقلابِ فرانس کے پرچم
میرے سینے پہ ثبت ہیں اب تک
باغیوں کے جوان نقشِ قدم

میری نبضوں میں، میرے خون میں ہے
جوش زن والگا کا سرخ ابال
نور افشاں ہے میرے ماتھے پر
روس کے انقلابیوں کا جلال

میں نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
آگ کے پھول، آگ کے گلزار
انگڑیوں کے دہکتے انگارے
آہ کے شعلے آنسوؤں کے شرار

وقت کا ترانہ

تو نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
اب کی اس ملک کی بہار ہے اور
وادیاں گونجتی ہیں نعروں سے
سازِ و آہنگِ آبشار ہے اور

قافلہ انقلاب کا ہے رواں
بج رہی ہے خوشی کی شہنائی
زلزلوں سے دہل رہی ہے زمیں
لے رہے ہیں پہاڑ انگڑائی

سلگ اٹھی ہے انتقام کی آگ
برف کی چوٹیاں دہکتی ہیں
ظلم کے جبر کے اندھیرے میں
سیکڑوں بجلیاں چمکتی ہیں

جن کو کچلا گیا ہے صدیوں سے
آج تک ان کے دل دھڑکتے ہیں
زندگی کے بجھے ہوئے شعلے
اک نئی شان سے بھڑکتے ہیں

فصل کے ساتھ ساتھ کھیتوں سے
اُگ رہی ہے بغاوتوں کی سپاہ
جگمگاتی ہے عدل کی شمشیر
مل سکے گی نہ ظالموں کو پناہ

کارخانوں کے آہنی دل سے
ایک سیلاب سا ابلتا ہے
سرخ پرچم ہوا کے سینے پر
بن کے رنگِ شفق مچلتا ہے

یہی ہندوستاں کا ساحل ہے
جس پہ ٹوٹا غرورِ سلطانی
آگ سی لگ گئی ہے پانی میں
موجیں کرتی ہیں شعلہ افشانی

بادباں کھل گئے بغاوت کے
بمبئی کے جہازیوں کو سلام
جو شہنشاہیت سے ٹکرائے
ایسے جاں باز غازیوں کو سلام

دیدنی اہلِ شہر کا ہے شکوہ
گولیاں روکتے ہیں سینوں پر
لب پہ نعرے، نگاہ میں عزمِ جہاد
حریت ضو فگن جبینوں پر

ہر سڑک پر سمندروں کا اُبال
ہر گلی میں ہے جوشِ طوفانی
غرق کر دے گی بادشاہی کو
آدمی کے لہو کی طغیانی

خون چہرے پہ مل کے اٹھی ہے
یہ ہے کشمیر کی دلہن کا سہاگ
ہر کلی بن گئی ہے چنگاری
شاخِ گل سے نکل رہی ہے آگ

ان حسیں زعفران زاروں میں
یوں تو ہر سال پھول آتے ہیں
اس برس کاسنی شگوفوں میں
زخم ہی زخم مسکراتے ہیں

جھیل ہے یہ کنول کے پھولوں کی
پاک اور صاف اس کا پانی ہے
مل گیا ہے لہو شہیدوں کا
آج ہر موج ارغوانی ہے

ہے یہ عرصہ گہہ ٹراونکور
ناز کر ناز سرزمینِ دکن
رقص کر رقص موج بحرِ عرب
مسکرا اے بہادروں کے وطن

وہ اٹھیں ایک لاکھ بندوقیں
گولیاں ایک لاکھ چلنے لگیں
جھپٹے وہ ایک لاکھ متوالے
ایک لاکھ آندھیاں مچلنے لگیں

رہ گئیں ایک لاکھ سینوں میں
ٹوٹ کر ایک لاکھ شمشیریں
گر گئیں ایک لاکھ جسموں سے
ٹوٹ کر ایک لاکھ زنجیریں

حیدرآباد کے جوانوں کی
فوج میدان میں اتر آئی
پھر سے ٹیپو کی تیغ جوہر دار
خون میں ڈوب کر اُبھر آئی

بجلیوں کی طرح کڑکتی ہوئی
ٹولیاں آ گئیں کسانوں کی
کیا گھٹا جھوم کر برستی ہے
گونج ہے فتح کے ترانوں کی

شور ہے، جوش ہے، تلاطم ہے
اُڑ گئے ہوش حکمرانوں کے
جاگ اٹھے ہزار جوالہ مکھی
آگ اُبلنے لگی دہانوں سے

اک طرف ظلم اک طرف انصاف
فوج سے فوج آ کے ٹکرائی
جن کے دل میں تھا جوش قربانی
آج ان کی مُراد بر آئی

بہہ رہے ہیں جوان جسموں سے
سرخ اور گرم خون کے دھارے
پھوٹ نکلے افق کے سینے سے
روشنی کے طلسمی فوارے

یہ انھیں عورتوں کی لاشیں ہیں
جن کے چہروں پہ رنگ تھا نہ نکھار
آج دامن میں کھل رہے ہیں چمن
آنچلوں میں لگی ہوئی ہے بہار

خاک پر سو رہے ہیں جو بچے
اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے
'نامیوں' کو شدید نفرت ہے
دیکھتے ہیں نظر جمائے ہوئے

یہ ہیں وہ لال جو نشانی تھے
اپنے ماں باپ کی محبت کے
آج سے یادگار ہیں لیکن
ملک اور قوم کی شجاعت کے

مجھ سے کیا پوچھتی ہے اے 'تاریخ'
کیا ہے ہندوستان کا تحفا؟
اس دہکتے ہوئے گلستاں سے
ایک دو سرخ پھول لیتی جا

فرنگی

تم کو معلوم ہے یہ جگہ کون سی ہے؟

جاوید

نہیں

فرنگی

یہ وہ ایوان ہے جس میں انصاف، عدل اور صداقت کی قندیل
سیکڑوں سال سے جل رہی ہے
یہ وہ ایوان ہے جس کے سائے میں ہندوستاں کی رعایا
امن اور چین سے پل رہی ہے
دیکھو دیوار پر شاہ برطانیہ اور شہنشاہ ہندوستاں کی شبیہ مبارک لگی ہے
جس کی آنکھوں میں رحم اور دل میں محبت بھری ہے
اس کے نزدیک آؤ
ہاتھ اٹھاؤ
اور قسم کھاؤ سچ بولنے کی

مریم

پہلے تم یہ بتاؤ کہ سچائی کی تاب بھی لا سکو گے؟

جاوید

سچ تو یہ ہے کہ انصاف، عدل اور صداقت کی قندیل
ایوانِ شاہی میں روشن نہیں ہے

مریم

سچ تو یہ ہے کہ انگریز کے ہاتھ میں سچ کا دامن نہیں ہے
پتھروں کو پگھلتے ہوئے، ریگزاروں میں پھولوں کو کھلتے ہوئے
ہم نے دیکھا نہیں ہے

جاوید

سچ تو یہ ہے کہ اب کوئی ہندوستانی
شاہِ برطانیہ کی رعایا نہیں ہے

مریم

سچ تو یہ ہے کہ انگریز کے ڈیڑھ سو سال کے راج میں
ایک انساں نے بھی امن اور چین پایا نہیں

جاوید

سچ تو یہ ہے کہ یہ اجنبی شخص جس کی شبیہہ مبارک یہاں
لاش کی طرح لٹکی ہوئی ہے
یہ نہ تو شاہِ برطانیہ ہے، نہ شاہنشہ ملک ہندوستاں ہے
اک فریب ایک دھوکا ہے اک وہم ہے اک گماں ہے

فرنگی

چپ رہو، چپ رہو شاہِ برطانیہ کے غلامو
چپ رہو
اپنا اعمال نامہ سنو
تم نے جاوید و مریم
تم نے جمہور کے ساتھ مل کر
انقلاب اور بغاوت کا فتنہ جگایا
تم نے ایک ایک کونے میں طوفاں اٹھایا
تم یہ کہتے ہو جمہور کا راج ہو
ایک ایک گھر میں سوراج ہو
کھیتیوں میں کسانوں کی ہو حکمرانی
کارخانے ہوں مزدوروں کی راجدھانی
تم پر الزام یہ ہے کہ تم
شاہ برطانیہ اور شہنشاہ ہندوستاں کی حکومت
سلطنت اور قانون ہی کے نہیں
امن و تہذیب و اخلاق کے بیخ کن ہو
مختصر یہ کہ تم بدچلن ہو

جاوید

جانتے ہو ہماری نگاہوں میں تم کون ہو
عصر حاضر کے فرعون ہو!

تم وہ قاتل ہو گردن پہ جن کی
ایک دو کا نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں کا خوں ہے
تم وہ پاپی ہو کہ پاپ بھی شرم سے سرنگوں ہے

جب تم اس ملک میں آئے تھے ہم نے مہماں سمجھ کر
اپنی آنکھوں پہ تم کو بٹھایا
بھائی کہہ کر گلے سے لگایا
تم مگر مکر اور فن میں استاد نکلے
بھیس سوداگروں کا بنایا تھا در اصل جلاّد نکلے
بھائی سے بھائی کو تم نے آ کر لڑایا
خون پانی کی صورت بہایا
اور پھر اپنے آئین وقانون کے نام پر
اونچے قلعے بنائے
فوج لائے
میزبانوں پہ پہرے بٹھائے
ظلم اور جبر کے تازیانے لگائے
اور ہندوستاں کی بھری بستیاں لوٹ لیں
تم وہ ہو جن کے ہاتھ اپنے ہی محسنوں کے لہو میں بھرے ہیں
تم تو خود جانتے ہو کہ جس شے کو آئین وقانون کا نام
تم نے دیا ہے وہ کیا ہے
یہ ہے وہ سانپ جو سیکڑوں سال سے ایشیا اور افریقہ کو ڈس رہا ہے
جس کو لندن کے شاہی مداری
اپنی مکاریوں کی پٹاری میں لے کر
ایک اک ملک میں ایک اک دیس میں پھر رہے ہیں
یہ وہ کوڑا ہے جس کے لگائے ہوئے زخم انسان کے جسم اور روح میں

سڑ رہے ہیں

یہ وہ بجلی ہے جو سالہا سال سے مفلسوں کے گھروں پر گر رہی ہے

یہ وہ تلوار ہے جو نہتوں کی سوکھی ہوئی گردنوں پر

ڈیڑھ سو سال سے پھر رہی ہے

یہ وہ مخمل ہے جس میں تمھارے تشدد کے خونخوار پنجے چھپے ہیں

اپنے قانون کا ڈھونگ اچھا رچایا ہے تم نے

جابرانہ حکومت کا اچھا بہانہ بنایا ہے تم نے

لیکن اس ملک میں ایسے قانون کی دھجیاں اڑ چکی ہیں

ہم نے اپنے تڑپتے ہوئے دل کے جلتے ہوئے خون سے

اپنی بے غیرتی اور محکومیت کی سیاہی کو دھو ڈالا ہے

اب یہاں ایک آئین ہے ایک قانون ہے

جس کو جمہور نے انقلاب اور بغاوت کی بھٹی میں پگھلا کے اپنے

عزم کے سانچے میں ڈھالا ہے

فرنگی

اور جاوید کی بیوی مریم

تم کو کیا کہنا ہے؟

مریم

جب سے تم آئے ہو گھر کی سب برکتیں اٹھ گئی ہیں

تم نے ہندوستاں کی لہکتی ہوئی کھیتیوں سے

ان کی زرخیزیاں چھین لی ہیں

تم نے اس ملک کے سبزہ زاروں کی شادابیاں چھین لی ہیں

تم نے پھولوں کو کھلنے، ہواؤں کو چلنے سے روکا

تم نے چشموں کو بہنے سے، فواروں کو رقص کرنے سے روکا

اور دریاؤں میں زہر گھولا

کل جہاں ناچتی تھیں بہاریں

دودھ اور شہد کی پڑ رہی تھیں پھواریں
آج ان وادیوں اور میدانوں میں قحط و افلاس کے بھوت منڈلا رہے ہیں
اور آئین و قانون کے گدھ ہمارے
جسم کی بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں

تم کو معلوم ہے آج کیوں نوجواں عارضوں کے کنول مسکراتے نہیں ہیں؟
چاند سے ماتھے، سورج سے مکھڑے
کس لیے جگمگاتے نہیں ہیں؟
تم نے بچپن کے پھولوں سے خوشبو چُرا لی
اور جوانی کے آئینے سے اس کی رونق اُڑا لی
تم نے ہنستی ہوئی مانگ اور مسکراتی جبینوں سے افشاں چھڑا لی
صندلی ہاتھوں سے ان کا رنگ حنا لے لیا ہے

جاوید

پھر بھی تم امن و تہذیب و اخلاق کا نام لے کر
اک نیا جال پھیلا رہے ہو
ساری دنیا کو بہکا رہے ہو

مریم

خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
امن و تہذیب کا نام کس نے مٹایا
کس نے دکھیاری ماؤں کے کڑیل جوانوں کو توپوں کا ایندھن بنایا
کس نے شہروں کو اور بستیوں کو جلایا
کس کے بمبار برسوں سے دنیا کے سر پر
موت کی راگنی گا رہے ہیں
کس کے لشکر ہیں جو غیر ملکوں میں طاعون پھیلا رہے ہیں

خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
کس نے قبروں کو کھودا
اور لاشوں کو باہر نکالا
کس نے لاشوں کے ٹکڑے کئے کس نے مردوں کو کوڑے لگائے
کس نے آئین وقانون کے نام پر سولیاں گاڑ دیں
اور پھانسی کے پھندے بنائے
کس نے ماؤں کی گودوں سے بچوں کو چھینا
چیر کر کس نے معصوم بچوں کا سینہ
نرم، نازک، دھڑکتے دلوں کو چبایا

خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
ملک میں انقلاب اور بغاوت کا طوفان کس نے اٹھایا
تم جسے جرم کہتے ہو وہ اصل تہذیب ہے اصل اخلاق ہے
ظالموں کے خلاف انقلاب اور بغاوت
آدمیت کی معراج ہے
آدمیت کی معراج ہے

جاوید

ہم کو اپنی غلامی گوارہ نہیں
ایک بھی ذرّہ اس ملک میں اب تمھارا نہیں
آج پیڑوں کے پیروں میں جنبش ہے کہسار چلنے لگے ہیں
ریگزاروں کے سوکھے ہوئے زرد سینوں کے سیلاب ابلنے لگے ہیں
کھیتیاں خاک کی گود سے اٹھ رہی ہیں
اب کی سال ان کی شاخوں میں ہنسئے پھلے ہیں
کارخانے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں ہتھوڑے
اٹھائے ہوئے آرہے ہیں

اورلو ہے کے پہیئے
وقت و تاریخ کے تیز رفتار پہیوں کے مانند
انقلاب اور بغاوت کے رتھ میں لگے فتح کی راگنی گا رہے ہیں

دیکھو کتنی ہی فوجیں اُفق سے
آندھیوں کی طرح آ رہی ہیں
بجلیاں ظلم کے سر پہ منڈلا رہی ہیں
یہ وہ روحیں ہیں جو رود کاویری کے ساحلوں پر
اور پلاسی کے میدان میں سیکڑوں سال سے سو رہی ہیں
یہ وہ اجسام ہیں غدر کے وقت جن کو
اپنی توپوں سے باندھا تھا تم نے
یہ وہ لاشیں ہیں جن سے ہزاروں کتوں اور گدھوں کو پالا تھا تم نے
یہ وہی سر ہیں تم نے جنھیں گردنوں سے جدا کر دیا تھا
یہ وہی گردنیں ہیں جنھیں تم نے پھانسی کا پھندا دیا تھا
یہ وہی ہاتھ ہیں جن میں اب تک
آہنی ہتھکڑی کے نشاں ہیں
یہ وہی پیر ہیں جن میں اب تک تمھاری پنہائی ہوئی بیڑیاں ہیں
یہ وہی سینے ہیں جن میں دل کی جگہ سیسے کی گولیاں سو رہی ہیں
یہ وہی دل ہیں جن کے ہر اک زخم میں زہر آلود سنگینیوں کی ٹوٹی
نوکیں پڑی رو رہی ہیں

دیکھو کتنی ہی فوجیں اُفق سے
آندھیوں کی طرح آ رہی ہیں
بجلیاں ظلم کے سر پہ منڈلا رہی ہیں

بھاگو بھاگو
اپنا جسم، اپنی جان، اپنا امن، اپنا اخلاق وتہذیب وقانون
سب لے کے بھاگو اس زمیں کے دہکتے ہوئے سینے سے سلطنت کی
پرانی بساط اب اٹھالو
زندگی تم سے تنگ آ چکی ہے
ساری دنیا اب اُکتا چکی ہے
موت کے بادباں کھول دو اور اپنے جہازوں کے لنگر اٹھالو
جاؤ جاؤ ——————!

فرنگی

اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم کو
اپنے سارے جرائم کا اقرار ہے

جاوید

ہم کو انکار ہے

مریم

ہم کو انکار ہے

فرنگی

پر یہ قانون کی منصفانہ نگاہوں میں اقرار ہے

جاوید

انقلاب اور بغاوت کا اقرار لیکن جرائم سے انکار

مریم

انکار ہے

فرنگی

تم اسی طرح انکار کرتے رہو گے
پھر بھی قانون کا فیصلہ، فیصلہ ہے

تم نے —— جاوید و مریم
تم نے جمہور کے ساتھ مل کر
انقلاب اور بغاوت کا فتنہ جگایا
تم نے ایک ایک کونے میں طوفاں اٹھایا
تم یہ کہتے ہو جمہور کا راج ہو
ایک اک گھر میں سوراج ہو
کھیتیوں میں کسانوں کی ہو حکمرانی
کارخانے ہوں مزدور کی راجدھانی
تم پر الزام یہ ہے —— کہ تم
شاہِ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستان کی حکومت
سلطنت اور قانون ہی کے نہیں
امن و تہذیب و اخلاق کے بیخ کن ہو
اس لیے شاہِ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستاں کی عدالت سے تم کو
تم کو جاوید
یہ سزا دی گئی ہے کہ سرکار نے تم سے جینے کا حق لے لیا ہے

جاوید

مجھ سے کیا، سارے ہندوستاں سے یہ حق، جب سے تم آئے ہو چھن چکا ہے

فرنگی

......تم سے جینے کا حق لے لیا ہے
اب تمھارے لیے قید خانے میں ریشم کا پھندا لگا ہے
تا کہ اس میں تمھارا گلا باندھ کر تم کو پھانسی پہ لٹکایا جائے یہاں تک کہ دم توڑ دو
شاہ برطانیہ اور شہنشاہ ہندوستاں کی سلطنت چھوڑ دو

جاوید

اور تم ہم غریبوں کے ہندوستان کی

مملکت چھوڑ دو

فرنگی

اور تم کو
تم کو مریم
یہ سزا دی گئی ہے کہ تم عمر بھر
عمر بھر صرف رویا کرو
اپنے اشکوں سے اپنے گناہوں کو دھویا کرو
یہ وہ ایوان ہے جس میں انصاف عدل اور صداقت کی قندیل
سیکڑوں سال سے جل رہی ہے
یہ وہ ایوان ہے جس کے سائے میں ہندوستاں کی رعایا
امن اور چین سے پل رہی ہے

مریم

ایسے ایوانِ عدل و صداقت پہ لعنت
ایسی ظالم حکومت پہ لعنت

(دیر تک آواز گونجتی رہتی ہے)

لعنت، لعنت، لعنت

پانچویں تصویر

آج کی رات اور باقی ہے

مجاز

پانچویں تصویر

موت کا راگ

ہر چیز آنی، ہر چیز جانی
ہر رنگ فانی، ہر نقش فانی
دنیا پریشاں خوابوں کی بستی
رنگیں فسانہ، غمگیں کہانی

ساز ازل کا نغمہ اجل ہے
شمع جہاں کا جلوہ اجل ہے
رقصاں اجل کی پرچھائیاں ہیں
پنہاں اجل سے پیدا اجل ہے

نکہت گل کی ، تاروں کی ضو ہو
موجِ نظر ہو، بجلی کی رو ہو
چلتا ہے سب پر جادو اجل کا
نقشِ کہن ہو، یا نقشِ نو ہو

ہر پھول بے بس، ہر خار بے بس
ہر ساز بے بس ، ہر تار بے بس
پنجے سے میرے کوئی نہ چھوٹا
تسبیح بے بس، زنّار بے بس

آنکھوں کا کاجل اشکوں سے دھویا
میں نے خوشی کو غم میں بھگویا
بچ کر نہ نکلا کوئی سفینہ
سب کو ڈبویا، سب کو ڈبویا

قیدی ہیں گورے، قیدی ہیں کالے
انسان و حیواں میرے نوالے
محفل میں میری کرتے ہیں گردش
خوں کے پیالے، خوں کے پیالے

چنگیز و تیمور، نشتر ہیں میرے
خاقان و فغفور خنجر ہیں میرے
میرے پھریرے قحط اور وبائیں
ظلم اور افلاس لشکر ہیں میرے

مجھ کو زمانہ کہتا ہے سفاک
میری نگاہیں سرد اور بے باک
ہر وار بھرپور، ہر وار بھرپور
دست اجل ہے چست اور چالاک

لیکن فرنگی میرا بھی استاد
مجھ سے بھی بڑھ کر سفاک و جلاد
سہمی ہوئی ہے دیوارِ زنداں
پھانسی کے پھندے کرتے ہیں فریاد

مریم کی آواز

زندگی ایک بارِ گراں ہے
میرا جاوید آخر کہاں ہے؟

جاوید

آ میرے پاس آ میری مریم
میری غم خوار و دلدار ہمدم
میں سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہوں
راہ کب سے تری تک رہا ہوں

(مریم سامنے آتی ہے)

فرض اپنا ادا کر چکا ہوں
دامنِ شوق کو بھر چکا ہوں
بوجھ کوئی نہیں قلب و جاں پر
فخر کرتا ہوں ہندوستاں پر
میرے دل میں نہ ڈر ہے نہ غم ہے
آنکھ تیری محبت میں نم ہے
دل میں بس ایک ہی آرزو تھی
دیکھ لیتا گھڑی دو گھڑی
(آگے بڑھ کر)

مریم

کوئی دیوارِ زنداں کو ڈھا دے
ان سلاخوں کو پیچھے ہٹا دے
(سلاخوں کو زور سے ہلاتی ہے)

جاوید

کیوں یہ آنکھیں تری لال کیوں ہیں؟
اتنے الجھے ہوئے بال کیوں ہیں؟
کیوں ہے غمگین صورت بنائی؟
رخ پہ کیوں اڑ رہی ہے ہوائی؟
نظریں اس طرح کیوں بجھ گئی ہیں؟
ہاتھ میں چوڑیاں کیوں نہیں ہیں؟
تیرے چہرے پہ افسردگی ہے
تیرے لہجے میں پژمردگی ہے

مریم

میرے دل میں محبت ہے تیری

جاوید

تیرے ہی ہاتھ عزت ہے میری
روک لے آنسوؤں کی روانی
پھیر قربانیوں پر نہ پانی

مریم

تجھ سے کہتی ہوں پھیلا کے آنچل
مجھ کو بھی اپنے ہی ساتھ لے چل

جاوید

مجھ کو مت دیکھ ، دیکھ اس چمن کو
لٹ گئی ہے، جو اس انجمن کو

دیکھ اے جانِ ہندوستاں کو
اپنے اجڑے ہوئے بوستاں کو
جس کے ہر گل پہ رنگ خزاں ہے
جس کا ہر برگ و بر نوحہ خواں ہے
گھر کے آئے اگر ابرِ باراں
خاک سے پھوٹے رنگ بہاراں
آنسوؤں کی نہیں کوئی حاجت
اس کو ہے گرم خوں کی ضرورت

مریم

میرے سر میں بھی آخر جنوں ہے
میری نبضوں میں بھی گرم خوں ہے
موت کا مجھ کو پیغام آتا
کاش میرا لہو کام آتا

جاوید

سرخ رو ہو گی اک روز تو بھی
کام آئے گا تیرا لہو بھی
یوں گزرنا بھی سب کچھ نہیں ہے
صرف مرنا ہی سب کچھ نہیں ہے
اور بھی ہیں بہت سے طریقے
خدمتِ ملک و قوم و وطن کے

مریم

جا کے دوں کس کے در پر دہائی
شاق ہے مجھ کو تیری جدائی
آہ کل تو بہت دور ہوگا
میری نظروں سے مستور ہو گا

سوگ چھا جائے گا زندگی پر
اوس پڑ جائے گی ہر خوشی پر
دکھ اٹھاؤں گی صدمے سہوں گی
عمر بھر اب اکیلی رہوں گی
مجھ کو ہر وقت یاد آئے گا تو
میرے خوابوں میں لہرائے گا تو
آنسوؤں میں چمکتا رہے گا
میرے دل میں دھڑکتا رہے گا
شرم ہے اپنی ناکامیوں پر
فخر ہے تیری قربانیوں پر
لیکن اس دل کو سمجھاؤں کیسے
میں تجھے چھوڑ کر جاؤں کیسے
جشنِ نو آئے گا جب وطن میں
ہوں گی تنہا بھری انجمن میں

جاوید

کل کا انداز کچھ اور ہو گا
بزم میں اک نیا دور ہو گا
جنگ ہوگی نہ پیکار ہو گی
تو مسرت سے سرشار ہو گی
گود میں تیری اک چاند ہو گا
جس سے خورشید بھی ماند ہو گا
جب جوانی کا انعام پاتا
اس کو میری طرح کا بناتا
اس طرح مجھ کو پا جائے گی تو
پھر نہ اک پل بھی گھبرائے گی تو

کتنی دل چسپ ہے یہ کہانی
مٹ کے بنتی ہے پھر زندگانی

ساری انسانیت اک تڑپتا ہوا شعلہ ہے
اور افراد چنگاریاں ہیں
جن کے سینوں میں کتنے ہی بیباک و بے تاب شعلے
پرورش پا رہے ہیں
اس تڑپتے ہوئے شعلے سے
جتنی چنگاریاں ٹوٹتی ہیں
اتنی ہی اور چنگاریاں پھوٹتی ہیں
اس طرح زندگی
گل بہ آغوش چنگاریوں سے
ہر گھڑی
اک نیا اور مہکتا ہوا ہار اپنے لیے گوندھتی ہے

کچھ تو چنگاریاں ایسی ہیں جو بھڑکتی نہیں جو تڑپتی نہیں
صرف اڑتی ہیں اور ناچ کر ایک لمحے میں کھو جاتی ہیں،
موت کی سرد آغوش میں جا کے سو جاتی ہیں
لیکن ایسی بھی کتنی ہی چنگاریاں ہیں
جن کے سینوں میں شعلے بھڑکتے ہیں اور خار و خس پر لپکتے ہیں
اور بجھتے بجھتے بھی دنیا اور انسانیت کو
رنگ اور نور کے ایک طوفان میں غرق کر جاتے ہیں
گرمیِ بزم صرف ایک رقصِ شرر تک نہیں ہے

ہم نسیمِ سحر کی طرح آتے ہیں باغ انسانیت میں

دو گھڑی سبزہ و گل سے اٹھکھیلیاں کرتے ہیں
شاخ پر جھولتے ہیں
کنج کے سائے میں کھیلتے ہیں
اور گلوں کو
رنگ و بو دے کے اس باغ میں رقص کرتے چلے جاتے ہیں

ابر کی طرح چھاتے ہیں دنیا کے سر پر
اور پھر سبز کھیتوں کو سیراب کر کے
وادی و دشت و کوہ و بیاباں کو شاداب کر کے کڑکتے، گرجتے،
برستے، گزر جاتے ہیں

ہم ہمیشہ سے لمحوں کے مانند آتے رہے ہیں
اور آتے رہیں گے
لمحے جو وقت کی وسعتِ بیکراں سے امنڈتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں
پھر وقت کی وسعتِ بیکراں میں
یوں تو سب لمحے ہیں ایک سے
ایک سی ان کی رفتار ہے
ایک سی ان کی جھنکار ہے
پھر بھی یکساں نہیں
جو بھی لمحہ ہے وہ اک نئی آرزو
اک نئی جستجو
اک نیا ساز ہے، اک نیا سوز ہے
اک نئی جوت ہے، اک نئی روشنی

ہم ہیں انسانیت کے زمانے کے موسم

جو بدلتے رہے ہیں
اور بدلتے رہیں گے
جو نئے پھول پھل ساتھ لاتے رہے ہیں
اور لاتے رہیں گے
جو نئے رنگ سے کیاریوں کو سجاتے رہے ہیں
اور سجاتے رہیں گے
جو نئی کونپلوں سے نئے پیرہن
شاخساروں کو ہر سال لا کر پنہاتے رہیں گے

ہم زمانے کے دریا سے موجوں کی صورت ابھرتے رہے ہیں
اور ابھرتے رہیں گے
زندگانی کی کشتی کو ہم اپنے سیّال سینے پہ لے کر
آگے بڑھتے رہے ہیں
اور بڑھتے رہیں گے
اس سفینے کے ملاح روزِ ازل سے بدلتے رہے ہیں
اور بدلتے رہیں گے
بادباں بن کے افراد اٹھتے رہے ہیں
اور اٹھتے رہیں گے
یہ حسیں ناؤ انسانیت کی اسی طرح چلتی رہی ہے
اور چلتی رہے گی

ہم ہیں معمار انسانیت کے
اپنے آبا و اجداد معمار تھے
ہم بھی معمار ہیں
آنے والے زمانے کی نسلیں بھی معمار ہوں گی

زندگی کا فلک بوس ایوان اسی طرح بنتا رہا ہے
اور بنتا رہے گا
ہم جہاں اپنی صناعیاں ختم کر کے چلے جائیں گے
کل وہیں سے نئے عہد کے حوصلہ مند صناع
اپنے فن اور صنعت کا آغاز آ کر کریں گے

ہم اگر کل نہ ہوں گے تو کیا وقت کی تیز رفتار رک جائے گی؟
زندگی کی کمر بوجھ سے غم کے جھک جائے گی؟
گردش ماہ و انجم میں کیا فرق آ جائے گا؟
کیا اندھیرا زمانے پہ چھا جائے گا؟

کل کے دن ہم نہ ہوں گے مگر
زندگی مسکراتی رہے گی
اپنی شمعیں جلاتی رہے گی
آسمانوں کا فیروزئی رنگ اتنا ہی دلکش رہے گا
اور افق کی جبیں روشنی سے چمکتی رہے گی
آج کی طرح کل بھی زمیں
اپنے محور پہ گھوما کرے گی
اور فضاؤں کی لاانتہا نیلی پہنائیوں میں
آج کی طرح کل بھی جھوما کرے گی
آرتی بزم انجم اتارا کرے گی
آج کی طرح کل بھی زمیں
چشمۂ نور میں غسل کر کے
سرخ سورج کے آئینے میں اپنی زلفیں سنوارا کرے گی

ہاں مگر آج اور کل میں اک فرق ہوگا
زندگی کل کی بھرپور ہوگی
کامرانی کا مے پی کے مخمور ہوگی
کل یہ لوہے کی موٹی سلاخیں
جو مرے اور ترے درمیاں ہیں پگھل جائیں گی
ظلم اور جبر کی ساری زنجیریں گل جائیں گی
کل غلامی کی لعنت، غریبی کی ذلت، مصیبت، مشقت،
صعوبت، عداوت، جہالت
وہم کی بادشاہت، بہیمانہ خصلت، درندوں کی سی ظالم عادت، جبلت
خاروخس کی طرح آدمیت کے طوفاں میں بہہ جائے گی
آدمیت کا طوفان روزِ اول سے امنڈ تا رہا ہے
اور ابد تک امنڈ تا رہے گا
یہ طوفان ہے جس کے ریلے میں فطرت کی سفاکیاں بہہ گئی ہیں
یہ وہ طوفان ہے جو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں برس سے گرجتا رہا ہے
اور گرجتا رہے گا

ہم جو برطانوی سلطنت کی
کھوکھلی اور پرانی چٹانوں سے ٹکرا رہے ہیں
ہم بھی انسانیت کے اسی جاودانی سمندر کی اک موج ہیں
زندگی، ارتقاء اور تاریخ کی فوج ہیں
ہم بڑھیں گے تو تاریخ آگے بڑھے گی
ظلم اور جبر کی قوتوں سے لڑے گی
آج جس سمت میں ہم مڑیں گے اسی سمت میں ساری دنیا مڑے گی
زندگی سرخ شہپر لگا کر اڑے گی

ہم ہیں وہ موجِ طوفاں کہ جو بڑھ کے گھٹتی نہیں
لاکھ دشمن ہوں لیکن ہماری سپہ پیچھے ہٹتی نہیں

جب سے انسان نے اپنے نقشِ قدم سے
پشتِ گیتی پہ عظمت کی مہریں لگائی ہیں اس وقت سے
ساری فطرت
آدمیت سے لڑنے پہ آمادہ ہے
اس کا ہمدرد و غم خوار کوئی نہ تھا
اس کا دلدار کوئی نہ تھا
ہر طرف صرف دشمن ہی دشمن نظر آ رہے تھے
وادیاں، دشت، میداں، پہاڑ
اپنے دامن سمیٹے ہوئے تھے
دیو کی طرح سانس لیتے سمندر
اپنے سیال جسموں کی جھاگ اور طوفان کی چادروں میں
لپیٹے ہوئے تھے
اپنے تاریک سینوں کے جنگل
اپنے اسرار اور بھید سب کچھ چھپائے کھڑے تھے
اونچے اونچے درخت اپنے میٹھے پھلوں کو
آدمی کی پہنچ سے بہت دور سر پر اٹھائے ہوئے تھے
کوہساروں کی نیلی چٹانیں
اور زمیں کی سنہری تہیں
اپنی گہرائیوں میں ہزاروں خزانے دبائے ہوئے تھیں
ندیاں غیظ میں پیچ و خم کھا رہی تھیں
سانپ کی طرح لہرا رہی تھیں
بجلیاں کالی کالی گھٹاؤں میں اپنی

آتش افشاں زبانوں سے پھنکارتی تھیں
زلزلے آتے تھے
برف اور آگ کے سخت طوفان چھاتے تھے
اور چاند سورج ستارے
ان میں کھو جاتے تھے
لیکن ان سیکڑوں دشمنوں کی
دشمنی کے اندھیرے میں انساں
اپنے ہاتھوں میں محنت، عمل اور تجسس کی قندیل لے کر
درد، دکھ، شوق، ارماں، مسرت، امنگ، آرزو اور امید
کا بوجھ سر پر اٹھائے
آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا
اور ہر ہر قدم پر
کامرانی کے اور کامیابی کے پرچم
نصب فرما رہا تھا

آخرش وادیاں، دشت، میداں، پہاڑ اس کے قدموں کے نیچے
فرش کی طرح سے بچھ گئے
ندیاں اس کے فاتح قدم چومنے کے لیے رک گئیں
اونچے اونچے درختوں کی اونچی ثمر دار شاخیں
اس کی تسلیم کو جھک گئیں
برف کی چوٹیاں اس کی تعظیم کو جھک گئیں
کوہساروں کی دولت
آبشاروں کی طاقت
اور زمیں کے خزانے
اس کی خدمت میں حاضر ہوئے

اور انساں ہواؤں پہ اڑنے لگا
موج طوفاں پہ چلنے لگا
بجلیاں اس کی آغوش میں آگئیں اور دنیا
ذہن انساں کے انوار سے جگمگانے لگی
ساز لے کر تمدن اٹھا اور تہذیب گانے لگی

سوچ ان مرحلوں کو
سوچ ان راستوں اور ان منزلوں کو
جن سے انسان اب تک گزرتا رہا ہے
اس کی راہوں میں دونوں طرف ڈھیر تھے ہڈیوں کے
اور ہر ہر قدم پر
خوں میں لتھڑے ہوئے بریدہ سروں کے فلک بوس ٹیلے کھڑے تھے
جن کی چوٹی پہ راتوں کو بھوت اور جنات
اپنی محفل سجاتے تھے اور آتشیں حلقوں میں ناچتے تھے
اور تاریخ کے سبزہ زاروں میں بہتے ہوئے خون کی تیز بو سے
ہواؤں کا دم گھٹ رہا تھا

یہ پرانے زمانے کے ان حکمرانوں کے نقش قدم تھے
جن کی سفاکیوں کے فسانے
آج بھی دل کو دہلا رہے ہیں
لیکن انسان ان مرحلوں سے گزر کر
آج ان منزلوں پہ کھڑا ہے جہاں ہر خزاں کے عقب سے بہاریں
گل افشانیاں کر رہی ہیں
اور غم کے اندھیرے افق سے مسرت کی چھنتی ہوئی تیز کرنیں
رنگ اور نور سے دشت و کہسار کی گودیاں بھر رہی ہیں

اپنے اجڑے ہوئے ملک کی کھیتیاں لہلہائیں گی شاداب ہوکر
دھان کی بالیاں مسکرائیں گی گیہوں کے خوشوں میں تارے
پھلیں گے
اور دھرتی کے سینے سے پھولوں کے فوارے اُبلیں گے

مریم

جن میں نہائیں گے ہم

جاوید

آسمانوں سے اتریں گی رنگیں بہاروں کی پریاں
دور ہو جائیں گی قحط کی کالی پرہول پرچھائیاں
ہر طرف نور ہی نور ہوگا
نور ہی نور ہوگا

مریم

میرے جاوید کی تیز آنکھوں کا نور، اس کے سینے سے
بہتے ہوئے خون کا رنگ

جاوید

کارخانوں سے نغموں کے طوفاں اٹھیں گے
اور غریبوں کے سوکھے ہوئے زرد چہروں پہ رنگ آئے گا
زندگی اور آسودگی کا
ان کی مغموم آنکھیں خوشی کی نئی روشنی سے چمکنے لگیں گی

مریم

ہجر کی لمبی راتوں کے آنسو محبت کے ہلکے تبسم میں شہد وشکر
بن کے گھل جائیں گے

جاوید

گرد آلود آئینے دھل جائیں گے

اور ماؤں کی گودوں سے ہنستے ہوئے ننھے ننھے فرشتے
اتر کر زمیں پر چلیں گے
جس طرح باغ میں پھول، آکاش پر چاند تاروں کے جھرمٹ
سبز مخمل کی وادی میں شبنم کے شفاف قطرے
اور چالیس کروڑ آدمی، وہ جو ہلکی سی مسکراہٹ سے محروم تھے
اس طرح کھلکھلا کر ہنسیں گے کہ جس طرح جوالہ مکھی پھوٹتا ہے
اور یہ قہقہہ، ایک آزاد، بیباک، ابھرتی ہوئی قوم کا قہقہہ
آسمان و زمیں پر
نور بن کر بکھر جائے گا

مریم

سارا عالم سنور جائے گا

جاوید

سچ بتا اب بھی غمگین ہے تو

مریم

ہاں میں غمگین ہوں، اب بھی غمگین ہوں، اب بھی غمگین ہوں
آہ یہ غم ہمیشہ میرے دل میں پلتا رہے گا
میری روتی ہوئی آنکھوں سے اشک بن بن کے ڈھلتا رہے گا
کون ہے وہ جو پتھر کے سینے سے وزن اور دہکتے ہوئے سرخ
انگاروں کے دل سے ان کی تپش چھین لے گا؟
کون ہے وہ جو دل کی ہری شاخ سے غم کے چبھتے ہوئے
کانٹوں کو بین لے گا
یہ جدائی نہیں دل کو وہ درد ہے جس کی ٹیسیں
عمر بھر میرے پہلو سے اٹھتی رہیں گی
آہیں سینے میں گھٹتی رہیں گی

جاوید

لیکن انسان کی روح سے غم کے دھبے
وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ دھل جاتے ہیں
کشتیِ زندگانی کے لپٹے ہوئے بادباں
آنے والی مسرت کی ٹھنڈی ہواؤں سے کھل جاتے ہیں

مریم

پھر بھی بچھڑے ہوئے دوست احباب ملتے نہیں
ہاں تسلی سے تھوڑی سی تسکین ہوتی ہے لیکن
قلب اور روح کے زخم سلتے نہیں
رات کی تیرگی میں
پھول شبنم کے بوسوں سے مدہوش ہوتے ہیں کھلتے نہیں ہیں
چاند کی کرنیں جب اپنی نرم اور نازک
سیم گوں انگلیوں سے
رات کے الجھے الجھے ہوئے ریشمی بال سلجھانے لگتی ہیں تو
اس کی نیلی رگوں میں
چاندنی خون کی طرح سے دوڑ جاتی ہے لیکن
پھر بھی اس کی جبیں سے اندھیرے کی پرچھائیں ہٹتی نہیں ہے
ہاں تسلی سے تھوڑی سی تسکین ہو جاتی ہے
لیکن اس کے سہارے
عمر کٹتی نہیں ہے

جاوید

یہ زبانی تسلی نہیں
بلکہ ایسی حقیقت ہے جو تیری آغوش میں پرورش پا رہی ہے
جو تری روح اور دل کو گرما رہی ہے
ہاں یہ سچ ہے کہ میں آج پھانسی کے پھندے کے نیچے کھڑا ہوں

ایک برگ خزاں ہوں
تجھ کو جتنا بھی غم ہو وہ کم ہے
تو مگر ایک کھلا ہوا پھول ہے
ایک پھلتی ہوئی شاخ ہے
جس کے ایک اک رگ و ریشے سے کونپلیں پھوٹتی ہیں
تو مسرت کا پیغام ہے
ملک اور قوم کی آرزو کا چھلکتا ہوا جام ہے
اپنے سینے میں عہدِ نو کی بشارت چھپائے ہوئے ہے
زندگانی کا بارِ امانت اٹھائے ہوئے ہے

... ...

(خاموشی)

(صرف ساز بجنے کی آواز)

رات کو میں نے اک خواب دیکھا
گود میں تیری مہتاب دیکھا
رات تاریک تھی اور سلاخوں سے باہر
آسماں ابر آلود تھا
ہر طرف موت کی سی خموشی
گویا پتھر کی اک سل تھی جو جیل کی رات کے دل پر رکھی ہوئی تھی

میری تنہائی میں میری ہمدم بس اک ٹمٹماتی ہوئی شمع تھی
جس نے چھت اور دیوار پر
ہلکے ہلکے اک نور کا جال پھیلا دیا تھا
جیسے مایوسیوں کے اندھیرے میں امید کی جھلملاتی ہوئی روشنی ہو
میں تھا، یہ کوٹھری اور سلاخیں
جن کی پرچھائیاں صحن کی خاک پر لیٹ کر سو گئی تھیں

اتنے میں نیند آئی
اپنی آنکھوں میں صدیوں کا کاجل لگائے ہوئے
اپنے آنچل میں سکھ کے ستارے چھپائے ہوئے
جیل کے پاسبانوں سے بچتی ہوئی
ہر قدم پر دلہن کی طرح سے ٹھٹھکتی، جھجکتی ہوئی
آہنیں سن کے دیوار کی آڑ لے کر دبکتی ہوئی
چپکے سے کوٹھری میں چلی آئی اور میرے سینے پہ سر رکھ دیا
اپنی کالی گھنی زلف کو میرے شانوں پہ پھیلا دیا
آسماں کی بلندی سے نیلی گھٹائیں اترنے لگیں
اور پرچھائیاں سی بکھرنے لگیں
ہر طرف تیرگی چھا گئی
سنتری، پاسباں، بھوری دیواریں، چھت اور سلاخیں
شمع اور شمع کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی
ایک پُر کیف و مخمور اندھیرے میں گم ہو گئیں
نیند کی مدھ بھری گود میں سو گئیں

نیند ہے اک حسینہ
سرمئی آنکھیں ہیں نیلگوں اس کا سینہ
اس کی پلکوں کے سائے میں خوابوں کی
مدہوش پرچھائیاں کھیلتی ہیں
وہ غریبوں کی غم خوار دکھیوں کی دل دار ہے
اور فرقِ مراتب سے بیزار ہے
رات کو آتی ہے
تھپکیاں دے کے سارے جہاں کو سلا جاتی ہے
بچوں کو لوریاں دیتی ہے، پھولوں کو پیار کرتی ہے اور سارے

عالم پہ جادو بھری انگلیوں سے چھڑکتی ہے شبنم
اس طرح بزمِ فطرت کی ہر چیز کو
اک نئی زندگی بخشتی ہے
اک نئی تازگی بخشتی ہے

رات وہ مجھ کو اپنے سبک بازوؤں میں اٹھا کر
جیل سے لے گئی
دور ــــــ احساس وادراک کی سرحدوں سے بھی دور
ایک افسانوی سرزمیں تھی
ماضی و حال کی سوتی اور جاگتی وادیوں میں
خواب آلود ہلکے دھندلکے کے ایواں
چاندنی کے ستوں اور شفق رنگ محرابیں، پیشانیاں
جن کی عقدِ ثریا سے آراستہ تھیں
واں نہ یہ جیل تھی اور نہ اس جیل کے پاسباں تھے
اور نہ یہ سخت اور سرد دیواریں تھیں
اور نہ پرہول تنہائی تھی
خواب کی خلوتیں انجمن بن گئی تھیں
کتنے بھولے ہوئے چہرے، بسری ہوئی آنکھیں
گزرے ہوئے ماہ وسال کے مسکراتے افق سے ابھر آئی تھیں
کتنی آوازیں خاموشی کے ساز سے پھوٹتی تھیں
اک عجب رقص تھا اک عجب زمزمہ تھا
ساغروں کی کھنک، بانسری کی پگھلتی ہوئی لے، ہواؤں کی سرگوشیاں
دوب کے فرش پر شبنم آلود ملبوس کی سرسراہٹ
چاند تاروں کے گیت اور ستاروں کی گنگناہٹ
وقت کے پاؤں کی نرم آہٹ

قہقہوں کی صدا اور کلیوں کے کھلنے کی آواز
سب کی سب ایک پُر کیف نغمے میں حل ہو گئی تھیں

ناگہاں جنگ کے طبل بجنے لگے
اور کروڑوں قدم ایک آہنگ کے ساتھ اٹھنے لگے
آسماں ہل گیا اور زمیں تھرتھرائی
زندگی تلملائی
اور کوہِ ہمالہ
اپنے ہاتھوں میں ہندوستاں کے علم کو اٹھائے ہوئے بڑھ رہا تھا
اور اس کی جلو میں
ساری انسانیت
ایک غضب ناک سیلاب کی طرح امڈی چلی آ رہی تھی
سارے ہندوستاں کے بہادر مجاہد
اپنے سر کو ہتھیلی پہ رکھے ہوئے
اپنے دشمن سے ٹکرا رہے تھے
سرخ اور سبز پرچم
ترنگے کے پہلو میں لہرا رہے تھے
گولیاں چل رہی تھیں
لاکھوں سینے سے جلتے ہوئے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں
پھر بھی کوہ ہمالہ
اپنے ہاتھوں میں ہندوستاں کے علم کو اٹھائے ہوئے بڑھ رہا تھا
دشمنوں کی صفوں پہ
چڑھ رہا تھا
غم کی ماری ہوئی ماؤں کی ہچکیاں
بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچوں کی سسکیاں

نعروں، جے کاروں، للکاروں میں ڈھل گئی تھیں
ہر طرف سے صدا آ رہی تھی
'عہدِ نو تو کہاں ہے'
اور پھر شور اٹھا
میں جو پلٹا تو اک اور تصویر دیکھی
تیری گودی میں اک چاند تھا جس کے لب ہل رہے تھے

'عہدِ نو آ گیا ہے
میں ہوں گوتم کے سینے کی آواز
میں ہوں تخئیل انساں کی پرواز
میں ہوں ٹیپو کی تلوار
میں ہوں جھانسی کی رانی کے خوابوں کی تعبیر
میں شہیدوں کے ماتھے کی تنویر
میں بھگت سنگھ کی روح ہوں
میں نئے عہد کے سخت طوفان میں
کشتیِ نوح ہوں
میں ہوں چٹاگاؤں کے باغیوں کا ترانہ
میں محمد علی کا فسانہ
میں ہوں اقبال و ٹیگور کا زمزمہ
میں ہوں دہقان و مزدور کا ہمہمہ
میرے خوں میں ہے گنگ و جمن کی روانی
اور رگوں میں ہمالہ کی کڑیل جوانی
عہدِ نو آ گیا ہے
عہدِ نو آ گیا ہے
دور ہوا ے شہنشاہیت کے جذام

جاگ ہندوستاں کے غلام
انتقام، انتقام، انتقام

یہ صدا ان کے افلاک پر بجلیاں کڑکڑانے لگیں
اور میں چونک اٹھا
رات تاریک تھی اور سلاخوں سے باہر
آسماں ابر آلود تھا
جیل کی اونچی دیواروں پر بجلیاں آتشیں راہواروں کو دوڑا رہی تھیں
اپنے کوڑوں کو کڑکا رہی تھیں
ابر آلود اندھیرے کے دل میں سنہرے عقابوں کے شہپر
چمک اٹھے تھے
بجلیوں کی کڑک اور چمک، بادلوں کی گرج
انقلاب اور بغاوت کی الہڑ حسینہ کی پازیب کی تیز جھنکار تھی
یہ اندھیرے اجالے کی پیکار تھی
جس کے ادنیٰ سپاہی ہیں ہم

فرنگی

وقت باقی رہا ہے زیادہ نہ کم
اب جدا تم کو ہونا ہے باچشم نم

جاوید

دیکھ افق پر اندھیرا مچلنے لگا
دن شفق کی سنہری پہاڑی سے ڈھلنے لگا
اب تلک شام کا چمپئی رنگ آنچل فضاؤں میں لہرا رہا تھا
آسماں پھول برسا رہا تھا
لیکن اب یک بیک سرخ پھولوں کی ہر پنکھڑی سرمئی ہو چلی ہے

روشنی تیرگی کے سیہ غار میں کھو چلی ہے
اور فرنگی کے چہرے پہ تاریکیاں ایک بھیانک ہنسی ہنس رہی ہیں
نظر میں غیظ اور نفرت کے شعلوں سے دہکی ہوئی ہیں
اور رعونت سے اینٹھے ہوئے ہونٹ یہ کہہ رہے ہیں
'وقت باقی رہا ہے زیادہ نہ کم'
اب جدا ہم کو ہونا ہے باچشمِ نم
میری مریم
میری مریم

مریم (گھبرا کر)

ہر طرف ہے یہ کیسا اندھیرا؟

جاوید

اس کے پیچھے چھپا ہے سویرا
جا کے کہنا ہے یہ اہلِ وطن سے
روح خوش ہو کے نکلی ہے تن سے
ہاتھ میں جام ہندوستاں کا
لب پہ ہے نام ہندوستاں کا

مریم

جو ہے مرنے پہ باندھے کمر ہے
ملک سارا ترا ہم سفر ہے

جاوید

اور کچھ اور نزدیک آ جا
اک خلش سی ہے دل میں مٹا جا
دیکھ لوں آخری بار تجھ کو
کر لوں اک رخصتی پیار تجھ کو

(مریم کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے)

مریم

رخصت اے میرے جاوید رخصت
ڈوبنے والے خورشید رخصت

(جاتی ہے)

جاوید

رخصت اے مریم، اے 'جان مریم'
رخصت اے آدم، اے نسل آدم

(اس کی آواز مریم کے قدموں کی آواز کا تعاقب کرتی ہے)

رخصت اے زندگی کی بہارو
رخصت اے جاودانی شرارو
رخصت اے آسمانی نظارو
رخصت اے چاند، سورج، ستارو
رخصت اے نیلگوں کوہسارو
رخصت اے نقرئی آبشارو
رخصت اے گنگناتی ہواؤ
رخصت اے مسکراتی فضاؤ
رخصت اے صبح اے شام رخصت
رخصت اے حسنِ گلفام رخصت
رخصت اے انقلابی جوانو
رخصت اے ہند کے باغبانو
جب نئے خاک میں رنگ بھرنا
ہم شہیدوں کو بھی یاد کرنا

چھٹی تصویر

کل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

(اقبال)

چھٹی تصویر

مریم کا نوحہ

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

تیری محبوب مریم بلاتی ہے تجھ کو
کیا کبھی اس کی بھی یاد آتی ہے تجھ کو
اب تو آنکھیں ترستی ہیں صورت کو تیری
ہو گئیں میری تو تیسوں راتیں اندھیری
زہر لگتی ہے اجڑی ہوئی زندگانی
آہ رکتی نہیں آنسوؤں کی روانی
غم کی سل ہوتی جاتی ہے کچھ اور بھاری
بڑھتی جاتی ہے کچھ اور بھی بیقراری
روٹھ کر جانے والے مناتی ہوں تجھ کو
تیری مریم ہوں میں ، میں بلاتی ہوں تجھ کو
ملک تیرا ہے مصروف پیکار اب بھی
خاک ہے سرخ بوندوں سے گلنار اب بھی

خوں بھرے پرچم انگڑائی لیتے ہیں آ جا
جنگ کے طبل آواز دیتے ہیں آ جا
کب تلک، کب تلک کوئی آخر پکارے
آ بھی جا، آ بھی جا آ بھی جا میرے پیارے

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

میری آنکھوں میں پہلی سی اب بھی چمک ہے
میرے ہونٹوں میں پھولوں کی اب بھی مہک ہے
میں تری آرزوؤں کا گلشن ہوں اب بھی
تیرے رنگین خوابوں کا مسکن ہوں اب بھی
میرے سینے میں ہے زندگی کا شرارہ
میرے پہلو میں ہے حریت کا ستارہ
باندھ کر اپنے ماتھے پہ سونے کا سہرا
یاد ہے تو نے الٹا تھا گھونگھٹ کسی کا
بیاہ کی میرے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی
صندلی مانگ تھی اس میں افشاں چنی تھی
اور اب مہندی ہاتھوں میں رچتی نہیں ہے
کوئی چوڑی کلائی میں بجتی نہیں ہے
ہائے کس نے وہ مہندی کی رنگت اڑا لی
کس نے یہ میرے ماتھے سے افشاں چھڑا لی

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

یاد ہو گا تجھے وہ مرا لال جوڑا
تو نے کیا اپنا وہ عہد و پیماں بھی توڑا؟
میرے سنسان دل میں ہے کیسا اندھیرا
کیا کبھی میری دنیامیں ہو گا سویرا؟
تو نہیں ہے تو بھاتا نہیں کچھ بھی مجھ کو
کیا کہوں کس طرح یاد کرتی ہوں تجھ کو
ہار اشکوں کے بیٹھی ہوئی گوندھتی ہوں
میں تجھے رات بھر تاروں میں ڈھونڈتی ہوں
ہوک اٹھتی ہے چڑیوں کی آواز سن کر
پھینک دیتی ہوں رنگیں دوپٹوں کو چن کر

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

ہنستی اور کھیلتی چاندنی رات آئی
گرمیوں بعد بھرپور برسات آئی
چھائیں ساون کی وہ کالی کالی گھٹائیں
اور پھر چیت پھاگن کی سنگیں ہوائیں
آم کے سبز باغوں میں پھر بورآیا
کوئلوں نے محبت بھرا گیت گایا
سب ہی آئے مگر ایک تو ہی نہ آیا
اپنے گھر اپنی مریم کو تونے بھلایا
یوں تو دنیا کی ہر چیز ہے آنی جانی
ہو گئیں کل کی باتیں پرانی کہانی
اس طرح اپنی نظریں پھراتا ہے کوئی

کیا محبت کو بھی بھول جاتا ہے کوئی
شام ہوتی ہے اور ڈوب جاتا ہے سورج
صبح ہوتے ہی پھر لوٹ آتا ہے سورج
میرا سورج مگر جا کے واپس نہ آیا
جانے کیوں میرے پیارے کو پردیس بھایا

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

ندیاں دوڑ کر ملتی ہیں ساگروں میں
بھر کے رس لڑکیاں لاتی ہیں گاگروں میں
رات کی گود میں سوتے ہیں چاند تارے
چومتے ہیں زمیں کو فلک کے کنارے
باغ میں دور سے اڑ کے آتے ہیں بھنورے
پھول کو گیت اپنا سناتے ہیں بھنورے
ساری دنیا پہ چھائی ہوئی ہے محبت
بے محبت کے ممکن نہیں ہے مسرت

(ایک عورت کے ہنسنے کی آواز)

ہنس رہی ہے کہیں کوئی میری سہیلی
اور میں گھر میں بیٹھی ہوئی ہوں اکیلی
دیکھتی ہوں میں جب اپنی ہم جولیوں کو
پیت کے پھولوں سے بھرتی ہیں جھولیوں کو
ان کی آنکھوں کے تارے چمکتے ہیں کیسے
ان کے دوشیزہ آنچل مہکتے ہیں کیسے
مسکراتے ہیں رہ رہ کے ان کے گریباں

ان کی سانسوں میں کھلتی ہیں رنگین کلیاں
جگمگاتا ہے چاند ان کی پیشانیوں پہ
ان کے سینے ہنسی اور خوشی کے سمندر
میرے دل سے نکلتی ہیں کتنی دعائیں
ان کو اپنی بہاروں کے دن راس آئیں
ناچتی آرزو پر نہ پھر جائے پانی
ہو نہ غمگین و افسردہ ان کی جوانی
اور بھی ان کی شاداب کھیتی ہری ہو
مانگ صندل سے بچوں سے گودی بھری ہو

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

وہ مسرت کے بیتے دلوں کی کہانی
میرے حسن و محبت تری نوجوانی
ان کو میں واپس آتے ہوئے دیکھتی ہوں
زیر لب مسکراتے ہوئے دیکھتی ہوں
رنگ ہی رنگ بس تیرتے ہیں فضا میں
سیکڑوں تتلیاں اڑ رہی ہیں ہوا میں
گزری راتوں کے طوفان دل میں چھپائے
لمحے اڑتے ہیں ہاتھوں پہ شمعیں جلائے
دن بنے ہفتے، ہفتے بنے ہیں مہینے
وقت کے چلتے رہتے ہیں یوں ہی سفینے
اک نیا رنگ بھر لیتی ہے زندگانی
بن کے ماں مسکراتی ہے الہڑ جوانی

خواب میں مجھ کو آواز دیتا ہے کوئی
کروٹیں میرے پہلو میں لیتا ہے کوئی
جیسے بجلی سی لہراتی ہو بادلوں میں
جیسے جھنکار ہو نقرئی چھاگلوں میں
یوں مچلتا ہے وہ جیسے سوتوں میں پانی
جیسے بیتاب رگ رگ میں ہو نوجوانی
سنسنی جسم میں، چیونٹیاں جیسے رینگیں
درد پیڑو میں رہ رہ کے لیتا ہے پینگیں
زندگی کا نیا پھول ہے کھلنے والا
ہے مرے صبر کا پھل مجھے ملنے والا
سوچتی ہوں کہ وہ تیری تصویر ہو گا
میرے بچپن کے خوابوں کی تعبیر ہو گا
اس کے چہرے پہ ہو گا محبت کا ہالہ
اس کے ماتھے پہ تیری جبیں کا اُجالا
کھائے جاتی ہے اس وقت تو تیری دوری
ہائے رہ جائے گی یہ خوشی بھی ادھوری
کھول کر اپنی آنکھیں وہ دیکھے گا کس کو
ہائے وہ باپ کہہ کر پکارے گا کس کو
یہ نہیں کہتی ہوں مجھ سے ملنے کو آنا
اپنے بچے کو بس اک نظر دیکھ جانا
وہ مری آنکھ کا تارہ وہ میرا دلبر
باپ کے پیار کو رہ نہ جائے ترس کر

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

کب تلک کب تلک کوئی آخر پکارے
آ بھی جا آ بھی جا آ بھی جا میرے پیارے
آ بھی جا میرے پیارے
میرے دل کے سہارے

(نامہ بر آتا ہے)

کیا یہ جاوید و مریم کا گھر ہے؟

مریم

ہاں مگر یہ بتا کیا خبر ہے؟
تجھ کو اپنا کہوں یا پرایا؟
نامہ بر کس کا خط لے کے آیا؟
موت کا جام یا زندگی کا؟
غم کا پیغام ہے یا خوشی کا؟

نامہ بر

زندگی ہے غموں کی کہانی
موت کا راگ ہے جاودانی
موت کی چھاؤں دیوار و در پر
موت کے پاؤں ہیں بحر و بر پر
موت کا رنگ ہے آب و گل میں
موت سوتی ہے پھولوں کے دل میں
موت سے کس کو ہے رستگاری
آج وہ کل ہماری ہے باری
لیکن ایسے بھی ہیں مرنے والے
اپنی ماؤں کی گودوں کے پالے
جو اندھیرے سے ڈرتے نہیں ہیں
چڑھ کے سولی پہ مرتے نہیں ہیں

وہ ہیں ہمت کے جرأت کے پیکر
چلتے ہیں موت کا سر کچل کر
موت کا دل دہلتا ہے ان سے
موت کا دم نکلتا ہے ان سے
زندگی قوم پر وارتے ہیں
موت پر قہقہے مارتے ہیں
تازہ ہے ان شہیدوں کا گلشن
نام ان کا ہمیشہ ہے روشن

مریم

تو تو آیا ہے لے کر سنانی
لٹ گئی ہائے میری جوانی

نامہ بر

تیرا شوہر جہاں سے سدھارا
اب ہے وہ آسماں کا ستارہ
خوش ہو وہ فخر ہندوستان ہے
آج سے زندۂ جاوداں ہے

مریم

کیا کہا؟ زندۂ جاوداں ہے؟
سچ بتا میرا شوہر کہاں ہے؟
اس نے جام محبت پیا تھا
لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا؟
تیرے ہاتھ اس نے پیغام بھیجا؟
کیاکوئی خط مرے نام بھیجا؟

(خط دکھا کر)

نامہ بر

آخری اس کا پیغام ہے یہ
پر کسی اور کے نام ہے یہ

مریم

اس کا کیا کوئی میرے سوا ہے؟
مجھ کو کیا جانے کیا ہو رہا ہے
میں نے دی اس کو اپنی جوانی
آرزو، دلکشی، شادمانی
اپنے ہونٹوں کی شادابیاں دیں
اپنے سینے کی بیتابیاں دیں
روح کو اس کی میں نے جگایا
اس کے سنسان دل کو بسایا
میں نے مہکا دیا اس کا گلشن
حسن سے بھر دیا اس کا دامن
عشق کی پیاس میں نے بجھائی
شمع تاریک گھر میں جلائی
اس کے جذبات کی ترجماں ہوں
اس کے ننھے سے بچے کی ماں ہوں

نامہ بر

اس کی الفت کا پیغام ہے یہ
تیرے بچے ہی کے نام ہے یہ

مریم

میرا بچہ؟ مگر وہ کہاں ہے؟
میرے پہلو میں اب تک نہاں ہے
کیسے وہ تیری باتیں سنے گا؟

کیسے جاوید کا خط پڑھے گا؟

نامہ بر

وہ جو پہلو میں اب تک نہاں ہے
عہدِ نو کا مبارک نشاں ہے
جوش وہمت کا پیغام یہ خط
ہے نئی نسل کے نام یہ خط
وہ نئی نسل جو آ رہی ہے
وقت کا خون گرما رہی ہے
تیرے شوہر نے مرنے سے پہلے
خط لکھا تھا یہ اپنے لہو سے
وہ اندھیرے سے ڈرتا نہیں ہے
چڑھ کے سولی پہ مرتا نہیں ہے

مریم

خوش ہوں وہ فخر ہندوستاں ہے
آج سے زندۂ جاوداں ہے
زندۂ جاوداں ہے
زندگی جاوداں ہے
آرزو جاوداں ہے
حسن بھی جاوداں، عشق بھی جاوداں
میرا بچہ
میرا بچہ
وہ بھی تو زندۂ جاوداں
میرا شوہر
میرا جاوید
فخرِ ہندوستاں ہے

آسمان و زمیں کو سنا دو
ساری دنیا کو جا کر بتا دو
اس نے مجھ کو بھلایا نہیں ہے
نقشِ الفت مٹایا نہیں ہے
عہدِ نو کو بلانے گیا ہے
چاند سورج کو لانے گیا ہے
آئے گا اور ضرور آئے گا وہ
صبحِ نو بن کے چھا جائے گا وہ
جب گریں گے غلامی کے ڈیرے
جب اڑیں گے خوشی کے پھریرے
راگنی قہقہوں کی چھڑے گی
ایک آزاد دنیا بنے گی
مسکراتا ہوا آئے گا وہ
جگمگاتا ہوا آئے گا وہ
اس نے آنے کا وعدہ کیا ہے
میرا جامِ محبت پیا ہے
آئے گا اور ضرور آئے گا وہ
صبحِ نو بن کے چھا جائے گا وہ

(مبہوت کھڑی رہتی ہے)

نامہ بر نامہ بر——میرا شوہر
کیا کہا اس نے پھانسی پہ چڑھ کر؟
کیا مجھے یاد اس نے کیا تھا؟
کیا مرا نام اس نے لیا تھا؟

نامہ بر

ہاں لیا اور لیا نام تیرا

مرتے مرتے پیا جام تیرا
چوم کر اس نے پھانسی کی رسی
آنے والی سحر کی خبر دی
رنگ سا اس کے چہرے پہ آیا
اور وہ زیر لب مسکرایا
اور پھر یوں گرج کر پکارا
موت سے کیا رکے گا یہ دھارا
بن کے سورج اٹھیں گے ستارے
پھول بن کر کھلیں گے شرارے
موت کے لاکھ طوفان آئیں
ظلم کے ابر کتنے ہی چھائیں
رات کتنی ہی تاریک ہو جائے
آسماں چاہے نظروں سے کھو جائے
پر اندھیرا پگھل کر رہے گا
صبح سورج نکل کر رہے گا
پھول کو کون کھلنے سے روکے؟
کون آتے زمانے کو ٹوکے؟

یہ حکومت، یہ ظلام حکومت کے ظالم شکنجے
کیا یہ ہندوستاں کے غلاموں کے لاکھوں کروڑوں
گلے گھونٹ دیں گے؟
کیا یہ جیلیں، یہ جیلوں کے پاپی ستم گار بدکار جیلر
کیا یہ فوجیں، یہ توپیں، یہ بندوق، سنگین اور بم کے گولے
کیا ہمالہ سے سیلون تک اور بنگال و آسام سے لے کے کشمیر تک
سارے ہندوستاں کو تشدد کے جلتے ہوئے تند اور تیز
دوزخ کی پگھلی ہوئی آگ میں جھونک دیں گے؟

کیا یہ بڑھتی ہوئی نسلِ انساں کو بھی روک دیں گے؟
ہاں کہواں سے سینے میں دل میں کچوکے لگائیں
اور زخموں سے انسان کے جسم و روح میں لاکھ سوراخ کر دیں
لیکن اب وہ گھڑی آ گئی ہے کہ ہر زخم سے ہوں گی پیدا ہزاروں زبانیں
جو دریا کو وادی کو، کہسار کو، دشت کو، در کو، میدان کو، ایک اک
اینٹ ایک ایک پتھر کو ایک ایک ذرہ کو پیغام دیں گی بغاوت
اور ان پھانسیوں اور جیلوں کے پیچھے دہکتے افق پر مچلتے
ہوئے سرخ خوں کے سمندر سے موجوں کے بیتاب سینے کو یوں چیر کر
آسماں پر ابھر آئے گا سرخ آزاد دنیا کا آزاد سورج
جس طرح ماں کی گودی میں بچہ

مریم

جیسے جاوید و مریم کا بچہ
موت کے لاکھ طوفان آئیں
ظلم کے ابر کتنے ہی چھائیں
رات کتنی ہی تاریک ہو جائے
آسماں چاہے نظروں سے کھو جائے
پر اندھیرا پگھل کر رہے گا
میرا بچہ
کیا کہا میں نے؟
میرا بچہ؟
میرا شوہر؟
میرا سورج نکل کر رہے گا
نامہ بر خط کو پڑھ کر سنا دے
سو رہی ہے یہ دنیا جگا دے
بیت جائیں پرانے زمانے

عہدِ نو کے بجیں شادیانے

نامہ بر (خط کو پڑھ کر سناتا ہے)

محبت کے ننھے شرارے سلام
کے روشن ستارے سلام
ابھی ماں کے پہلو میں مستور ہے
ابھی زندگی سے بہت دور ہے
اندھیرے میں گم ہیں ترے فکر و ہوش
ابھی ہیں عدم میں ترے چشم و گوش
تری آنکھ محروم نظارہ ہے
ابھی بطن مادر ہی گہوارہ ہے
ابھی تک ہے ہستی تری بے نمود
فقط گردشِ خوں ہے تیرا وجود

ابھی بن رہے ہیں وہ نقش و نگار
کہ جن کا زمانے کو ہے انتظار

مبارک تجھے گردش ماہ و سال
ابھرنے ہی کو ہیں ترے خط و خال
کلی تیری ہستی کی کھل جائے گی
مسرت تری ماں کو مل جائے گی
ترے نقش کو بخش دے گی ثبات
پلائے گی وہ تجھ کو آب حیات
ترے دل میں ہو گی تمنائے نور
تری سانس میں زندگی کا سرور
کریں گی ہوائیں تجھے آ کے پیار

تجھے لوریاں دیں گے لیل و نہار
تجھے دیکھ کے مسکرائے گا چاند
اشاروں سے تجھ کو بلائے گا چاند
ستاروں کو حیرت سے دیکھے گا تو
انھیں توڑ لینے کو لپکے گا تو

یہی سوچ کر مسکراتا ہوں میں
تجھے زندگی دے کے جاتا ہوں میں

ڈھلا دن مری عمر کا آئی شام
اجل لائی ہے زہر آلود جام
مجھے ڈر نہیں موت کی رات کا
جو غم ہے تو ہے صرف اس بات کا
وہ دنیا وراثت میں پائے گا تو
جسے دیکھ کر تلملائے گا تو
یہ ہے تیرے ماضی کی کل کائنات
حوادث کے طوفاں مصائب کی رات
عداوت کے نغمے، کدورت کے ساز
لہو کے سمندر، ستم کے جہاز

مگر پھر بھی جنس گراں ہے حیات
رواں ہے دواں ہے جواں ہے حیات

نئی تیری صہبا، نئے ہیں سبو
مری شرم کے داغ دھوئے گا تو

بنانا چٹانوں کے سینے پہ راہ
مگر اپنے ماضی پہ رکھنا نگاہ
کہیں ہمتوں کا نفس رک نہ جائے
ترے حوصلوں کی جبیں جھک نہ جائے
جوانی کہ جذبات کی آگ ہے
تمناؤں کا آتشیں راگ ہے
بھلانا نہ اس آتشیں راکھ کو
بجھانا نہ جذبات کی آگ کو
خود اپنے لہو سے جلانا اسے
ہوا و ہوس سے بچانا اسے
جبیں تیری اس سے دمکتی رہے
نظر تیری اس سے چمکتی رہے

اسی آگ میں تپ کے نکھرے گا تو
افق سے زمانے کے ابھرے گا تو

نہ کرنا کبھی چشم حیرت کو بند
نہ ٹوٹے کبھی جستجو کی کمند
بتاتا ہوں میں تجھ کو راز حیات
عمل ہے عمل کارساز حیات
عمل کے لیے ہے فضا سازگار
شکاری ہے انساں زمانہ شکار
جو طوفان آئیں تو ڈرنا نہیں
مصیبت میں بھی آہ بھرنا نہیں
کبھی جذبۂ شوق گھٹنے نہ پائے

نظر آسمانوں سے ہٹنے نہ پائے
گزرنا مصائب سے منہ موڑ کر
حوادث کی زنجیر کو توڑ کر
یہ مانا کہ تاریک ہوتی ہے رات
ستاروں کے موتی پروتی ہے رات
جہانِ کہن کا یہ دستور ہے
سیاہی کے آغوش میں نور ہے

اگر دل میں ہے آرزو کا سرور
تو ہے زندگی نغمہ و رنگ و نور
مسرت نہاں سنگ پاروں میں ہے
فضاؤں میں ہے شاخساروں میں ہے
ہوائیں بجاتی ہیں جس دم ستار
پہاڑوں پہ گاتے ہیں جب آبشار
ہرے ہو کے جب لہلہاتے ہیں کھیت
بھری دھوپ میں جب چمکتی ہے ریت
کرن پھوٹتی ہے جب افلاک سے
نکلتی ہیں جب کونپلیں خاک سے
افق سے ابلتا ہے جب رنگ و نور
ہواؤں میں اڑتے ہیں جس دم طیور
تو بجتا ہے دل میں خوشی کا رباب
مسرت پلاتی ہے آ کر شراب

یہ دریا یہ وادی یہ صحرا یہ پھول
مسرت نے بھیجے ہیں اپنے رسول

کوئی شے نہیں ہے جہاں میں حقیر
لبوں کا تبسم نگاہوں کے تیر
یہ شبنم کے قطرے خس و خار پر
یہ ڈھلتی ہوئی دھوپ دیوار پر
یہ شاخوں میں ہنستی ہوئی پتیاں
یہ پانی کے چشمے یہ پگڈنڈیاں
یہ مکڑی کے جالے یہ چاندی کے تار
یہ پیڑوں کی گردن میں پھولوں کا ہار
یہ آندھی سے طوفان سے کم نہیں
سمندر کے ہیجان سے کم نہیں
انھیں سب سے مل کر بنی ہے حیات
یہ سانچے ہیں جن میں ڈھلی ہے حیات

نہ ہو زندگی سے کبھی دل فگار
عمل سے بنا لے اسے سازگار

شکاری ہے انساں زمانہ شکار

حرفِ آخر

یہ آدمی کی گزرگاہ ——— شاہراہِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
جبیں پہ کاتبِ تقدیر کی جلی تحریر
گلے سے سیکڑوں نقشِ قدم لگائے ہوئے
گزرتے وقت کے گرد و غبار کے نیچے
حسین جسم کی تابندگی چھپائے ہوئے
گزشتہ دور کی تہذیب کی منازل کو
جوان ماں کی طرح گود میں سلائے ہوئے

یہ آدمی کی گزرگاہ ——— شاہراہِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
ادھر سے گزرے ہیں چنگیز و نادر و تیمور
لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں جلائے ہوئے
غلاموں اور کنیزوں کے کارواں آئے
خود اپنے خون میں ڈوبے ہوئے نہائے ہوئے
شکستہ دوش پہ دیوارِ چین کو لادے
سروں پہ مصر کے اہرام کو اٹھائے ہوئے
جلالِ شیخ و شکوہِ برہمنی کے جلوس
ہوس کے سینوں میں آتشکدے چھپائے ہوئے

جہالتوں کی طویل و عریض پرچھائیں
توہمات کی تاریکیاں جگائے ہوئے
سفید قوم کے عیار تاجروں کے گروہ
فریب و مکر سے اپنی دکاں سجائے ہوئے
شکست خوردہ سیاسی گداگروں کے ہجوم
ادب سے ٹوٹی ہوئی گردنیں جھکائے ہوئے
غموں سے چور مسافر، تھکے ہوئے راہی
چراغ روح کے، دل کے کنول بجھائے ہوئے

یہ آدمی کی گزرگاہ ——— شاہراہِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
نئے افق سے نئے قافلوں کی آمد ہے
چراغ وقت کی رنگین لو بڑھائے ہوئے
بغاوتوں کی پہ انقلاب کے لشکر
زمیں پہ پاؤں فلک پہ نظر جمائے ہوئے
غرور فتح کے پرچم ہوا میں لہراتے
ثبات و عزم کے اونچے علم اٹھائے ہوئے
ہتھیلیوں پہ لیے آفتاب اور مہتاب
بغل میں کرۂ ارض حسیں دبائے ہوئے
اٹھو اور اٹھ کے انھیں قافلوں میں مل جاؤ
جو منزلوں کو ہیں گرد سفر بنائے ہوئے
قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدان وطن
مجاہدان وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے

28 دسمبر 1946

2

جمہور

ایک سیاسی مثنوی

طبع اول مارچ 1946
طبع دوم فروری 1647
طبع سوم جون 1972

پیش لفظ

اردو میں سیاسی مثنوی کا رواج نہیں ہے۔ 'جمہور' اس قسم کی پہلی چیز ہے۔

پرانی مثنویوں میں عام طور سے دیو پریوں کے قصے اور شہزادوں کے عشق کی داستانیں ہوتی تھیں۔ عام انسان تو کیا اس کی پرچھائیں بھی کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ مرزا شوق لکھنوی ان روایتی بلندیوں سے صرف اتنے نیچے اتر سکے کہ پری کی جگہ سوداگر کی بیٹی اور شہزادے کی جگہ لکھنؤ کے نواب صاحب نے لے لی۔ اقبال نے پہلی بار مثنوی کو اعلیٰ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ لیکن انھوں نے انسپریشن ایرانی شعراء اور خصوصیت کے ساتھ مولانا روم کی مثنوی سے حاصل کیا تھا۔ حالانکہ اقبال کی مثنوی میں بھی عام انسان کا کردار نہیں ابھرتا۔ صرف 'جاوید نامہ' کے آخری حصہ میں عوام کا ذکر اس طرح آتا ہے کہ 'دیدہ ام صدق و صفا در عوام' پھر بھی انھوں نے آنے والے شعراء کے لیے نئی راہ کھول دی۔

حیرت ہے کہ اس مفید صنف سے ترقی پسند شعراء نے اب تک کوئی کام نہیں لیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے کیفی کے سوا کسی دوسرے شاعر نے مثنوی کی طرف توجہ نہیں کی ہے۔ شاید انھوں نے مثنوی کو پرانی چیز سمجھ کر ترک کر دیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس صنف میں بہت امکانات ہیں میرا تجربہ یہ ہے کہ ہم اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ جب میں ہندستان اور دنیا کے موجودہ حالات قومی اور بین الاقوامی جدوجہد اور کشمکش اور ان سے پیدا ہونے والے انسانی جذبات و احساسات کی وسعت اور پھیلاؤ کو دیکھتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ مثنوی کے سوا اور کوئی صنف شعر انھیں اپنے دامن میں سمیٹ نہیں سکتی۔ فردوسی کے 'شاہنامہ' سے اقبال کے 'ساقی نامہ' تک فارسی اور اردو مثنوی کا ورثہ ہمارا بہت بڑا سرمایہ، بہت بڑی دولت ہے۔ پھر یہ کفران نعمت کیوں؟

ابھی تک عصر حاضر کا شاندار رزمیہ نہیں لکھا گیا ہے جس کا تار و پود وقت نے تیار کر دیا ہے۔ 'جمہور'

ایک حقیر سی کوشش ہے۔ اس کے ہیرو عوام ہیں۔ محنت کش اور باعمل عوام جن کے ہاتھوں میں زندگی کی باگیں ہیں۔ وہ سطح زمین پر کیڑوں کی طرح نہیں رینگ رہے بلکہ کرۂ ارض کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ اسی لیے رجعت پرستوں کا نعرہ یہ ہے کہ عوام آرٹ اور شعر کا موضوع نہیں ہو سکتے۔

عوام سب سے بڑی حقیقت ہیں۔ ان کے خواب سب سے سہانے خواب ہیں۔ ان کا نصب العین سب سے بلند نصب العین ہے۔ وہ سماج اور تاریخ کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ زندگی انھیں سے حرارت حاصل کرتی ہے اور انھیں سے رنگ شعر و ادب انھیں سے حسن و قوت حاصل کر سکیں گے۔

اس درخت کی پتیاں توڑی جا سکتی ہیں۔ شاخیں کاٹی جا سکتی ہیں لیکن اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ انھیں اس وقت تک نہیں اکھاڑا جا سکتا جب تک کرۂ ارض کو پاش پاش نہ کر دیا جائے۔ اس لیے کٹی ہوئی شاخوں سے نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں گی۔ نئی پتیاں نکلتی رہیں گی، نئے پھول کھلتے رہیں گے۔

سردار جعفری

بمبئی دسمبر 1946

حرفِ اول

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو — اٹھو انقلابی جوانو اٹھو
کسانو اٹھو کامگارو[1] اٹھو — نئی زندگی کے شرارو اٹھو
اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے — اٹھو خاکِ بنگال و کشمیر سے
اٹھو وادی و دشت و کہسار سے — اٹھو سندھ و پنجاب وملبار سے
اٹھو مالوے اور میوات سے — مہاراشٹر اور گجرات سے
اودھ کے چمن سے چہکتے اٹھو — گلوں کی طرح سے مہکتے اٹھو
اٹھو کھل گیا پرچمِ انقلاب — نکلتا ہے جس طرح سے آفتاب
اٹھو جیسے دریا میں اٹھتی ہے موج — اٹھو جیسے آندھی کی بڑھتی ہے فوج
اٹھو برق کی طرح ہنستے ہوئے — کڑکتے، گرجتے، برستے ہوئے

غلامی کی زنجیر کو موڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

1۔ کامگار : مزدور

جمہور

یہ ہندوستاں رشکِ خلد بریں — اگلتی ہے سونا وطن کی زمیں
کہیں کوئلے اور لوہے کی کان — کہیں سرخ پتھر کی اونچی چٹان
کہیں سنگ مرمر کی شفاف سِل — پھسلتا ہے جس کی صفائی سے دل
بہت سے خزینے ہیں اس خاک میں — ہزاروں دفینے ہیں اس خاک میں
ہماری گھٹائیں گہر بار ہیں — ہمارے بیاباں بھی گلزار ہیں
بڑے رس بھرے ہیں ہمارے ثمر — بہت ہی گھنے ہیں ہمارے شجر
گل و لالہ و یاسمن کے ایاغ — مہکتے ہوئے آم کے سبز باغ
لٹکتے ہوئے خوشے انگور کے — چھلکتے ہوئے جام بلور کے
ہرے اور بھرے جنگلوں کی بہار — جھلاجھل چمکتے ہوئے ریگزار
یہ سورج کی رنگین کرنوں کا جال — کہ جس طرح فطرت نے کھولے ہوں بال
افق سے ابلتا ہوا رنگ و نور — فضاؤں میں پرواز کرتے طیور
کہستان کے یہ سنہرے عقاب — ہواؤں میں اڑتے ہوئے آفتاب
کنول جھیل میں مسکراتے ہوئے — چراغاں کا منظر دکھاتے ہوئے
یہ پھولوں سے گل پیرہن شاخسار — غزالوں سے معمور یہ مرغزار
تڑپتی مچلتی ہوئی بجلیاں — سمندر میں ملتی ہوئی ندیاں
یہ نیلم اور الماس کے کوہسار — یہ چاندی کے پگھلے ہوئے آبشار

یہ مخمل میں لپٹی ہوئی وادیاں ہمالہ کی گل پوش شہزادیاں
یہ گنگا کا آنچل، یہ جمنا کی ریت یہ دھان اور گیہوں کے شاداب کھیت
مگر یہ خزانے ہمارے نہیں
ہمارے نہیں ہیں تمھارے نہیں
یہاں سے جو اٹھتی ہے لے کے گھر گھٹا وہ برستی ہے انگلینڈ پر
ہمارے مقدر میں افلاس ہے غلامی کی ہر جسم میں باس ہے
ہماری زمیں جتنی زرخیز ہے وبا قحط کی اتنی ہی تیز ہے
جسے دیکھو مفلس ہے کنگال ہے ہر اک شہر ہر گاؤں بنگال ہے
کوئی سسکیاں بھر رہا ہے یہاں کوئی بھوک سے مر رہا ہے یہاں
کہیں ماؤں بہنوں کا ہے مول تول کہیں بے حیائی کے بجتے ہیں ڈھول
نہ کھانے کو روٹی نہ کرنے کو کام اندھیری ہیں صبحیں المناک شام
نہ ہو عمر کیوں جھونپڑوں میں بسر کہ ہے بھیک پر اب ہماری گزر
ہمیں حکم ہے اس طرح سے جئیں
کہ گنگا کے ساحل پہ پیاسے مریں
ہے ٹوٹا ہوا سازِ بزمِ وطن ہے صدیوں سے افسردہ یہ انجمن
نہ رادھا نہ رادھا کے نوخیز گیت کشن کی نہ وہ بانسری اور نہ پیت
نہ وہ رام کی تمکنت اور وقار نہ لچھمن کی الفت نہ سیتا کا پیار
نہ گوتم کے سینے کا صدق و صفا نہ ساوتری کا خلوصِ وفا
نہ برنائیاں اور نہ رعنائیاں نہ وہ ہیر رانجھا کی انگڑائیاں
نہ نانک کی گفتار کی نرمیاں نہ ٹیپو کی پیکار کی گرمیاں
بھگت سنگھ کے خون کا وہ ابال نہ چٹگاؤں کے باغیوں کا جلال
محمد علی کے نہ ہو ہمہمہ نہ اقبال و ٹیگور کے زمزمے
نہ عصمت نہ عفت نہ عزت نہ شان نہ غیرت نہ ہمت نہ وہ آن بان
جو جوہر تھے اخلاق و کردار میں وہ بکتے ہیں اب چور بازار میں
کدورت ہے سینوں میں اور افتراق نگاہوں میں نفرت دلوں میں نفاق

چلاتا ہے خود بھائی بھائی پہ تیر ۔۔۔ غلامی نے بدلا ہمارا ضمیر

بس آپس میں دست وگریباں ہیں ہم

خود اپنے ہی ہاتھوں پریشاں ہیں ہم

مگر پھوٹ کی شاخ پھلتی نہیں ۔۔۔ دعاؤں سے قسمت بدلتی نہیں

سیاست کے ہارے جواری ہیں ہم ۔۔۔ حکومت کے در کے بھکاری ہیں ہم

بچھاتے ہیں جو بادشاہی کا دام ۔۔۔ بناتے ہیں جو آدمی کو غلام

جو چنگیز سے بڑھ کے سفاک ہیں ۔۔۔ جو دجال کی طرح ناپاک ہیں

جو بدکیش و بدذات و بدکار ہیں ۔۔۔ ہم ان سے کرم کے طلب گار ہیں

وہ قاتل فلسطین و یونان کے ۔۔۔ وہ دشمن ہیں جاوا کے ایران کے

وہ سینے پہ ہیں ایشیا کے سوار ۔۔۔ وہ انسان کا کھیلتے ہیں شکار

انھیں ہے شہنشاہیت کا جنوں ۔۔۔ وہ بچوں کا بھی چوس لیتے ہیں خوں

اٹھا ہے گناہوں سے ان کا خمیر ۔۔۔ بنا ہے سیاہی سے ان کا ضمیر

فسوں ان کا بربط جنوں ان کا راگ ۔۔۔ دہکتی ہے ان کے کلیجے میں آگ

نہ بوئے وفا ان میں ہے اور نہ مہر ۔۔۔ رگوں میں ہے ان کی حکومت کا زہر

وہ مظلوم پر رحم کھاتے نہیں ۔۔۔ کبھی بھیڑیے مسکراتے نہیں

ٹپکتا ہے جبڑوں سے جن کے لہو ۔۔۔ بدلتی نہیں ہے کبھی ان کی خو

نہ جانے ہمیں آئے گا کب یقیں ۔۔۔ کہ شعلوں سے شبنم ٹپکتی نہیں

اتارا نہیں توڑا جاتا ہے تاج

کہ مرتا نہیں خود بخود سامراج

ہماری نگاہیں لگی ہیں جہاں ۔۔۔ نئی سازشیں ہو رہی ہیں وہاں

وہ بس وار کرنے کو تیار ہیں ۔۔۔ کہ غافل ہیں ہم اور وہ ہشیار ہیں

غلامی نئے بھیس میں آئے گی ۔۔۔ وہ اک اور سانچے میں ڈھل جائے گی

نیا جال لائے گا صیاد ابھی ۔۔۔ کرے گا ہمیں اور برباد ابھی

حکومت کی اک اور تجویز ہے ۔۔۔ مداری کی جھولی میں ہر چیز ہے

وطن ٹکڑے ٹکڑے کیا جائے گا ۔۔۔ یہاں یونین جیک لہرائے گا

دکھائی نہ دے گا ہلالی نشاں   ترنگے کی اڑ جائیں گی دھجیاں

نحوست یہاں رقص فرمائے گی

غلامی کی زنجیر کس جائے گی

مگر غم نہ کر اے زمینِ وطن   اندھیرے کے سینے سے پھوٹی کرن

اب اٹھتے ہیں ہندوستاں کے سپوت   لرزتا ہے جن سے حکومت کا بھوت

کسان اور مزدور گاتے ہوئے   اٹھے اپنا پرچم اڑاتے ہوئے

یہ ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی   یہ دریا بھی ہیں اور طوفان بھی

ہر اک ان میں کمزور و نادار ہے   مگر اتحاد ان کی تلوار ہے

بڑی سخت راہوں سے گزرے ہیں یہ   بڑے جوش کے ساتھ ابھرے ہیں یہ

وطن کے شہیدوں کی روحیں ہیں ساتھ   سروں پہ ہے جھانسی کی رانی کا ہاتھ

انھوں نے کیا کوہساروں کو پست   حکومت نے مانی ہے ان سے شکست

یہ لڑتے ہیں آندھی سے طوفان سے   یہ ہٹتے نہیں اپنے میدان سے

یہ سولی سے پھانسی سے ڈرتے نہیں   یہ سو بار مر کر بھی مرتے نہیں

یہ جی چھوڑنا جانتے ہی نہیں   یہ منہ موڑنا جانتے ہی نہیں

یہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتے ہیں کام   بدلتے ہیں آ کر پرانا نظام

یہ ذوقِ عمل کے پرستار ہیں   یہی عصر حاضر کے معمار ہیں

انھیں اپنی دولت پہ ہے اعتماد   انھیں اپنی قوت پہ ہے اعتماد

محبت سے دل ان کا معمور ہے   نیا ان کی محفل کا دستور ہے

نیا ان کا ساقی نئے ان کے جام   نئی ان کی مجلس نیا اہتمام

یہ انساں کی وحدت کے پیغامبر

نئے دور کی دے رہے ہیں خبر

جمہور کا اعلان نامہ

زمانے کے انداز بدلے گئے　　نئے راگ ہیں ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا　　تماشا دکھا کر مداری گیا
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے　　گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
اٹھا خاکِ جاوا سے طوفانِ نور　　بغاوت نے پھونکا قیامت کا صور
بھڑکتی ہیں ایراں میں چنگاریاں　　یہ ہیں صبح عشرت کی تیاریاں
اجالا ہے مشرق کے ایوان میں　　سحر ہو گئی شام و لبنان میں
بڑھی لے کے جمہوریت اپنی فوج　　ملی نیل سے جا کے دجلے کی موج
جل اٹھے غلاموں کے سینے کے داغ　　بکنگھم میں گل ہو رہے ہیں چراغ
گرے قصر شاہی جلے تخت و تاج　　نئی کروٹیں لے رہا ہے سماج
ملے زندگی کو نئے بال و پر　　نئی منزلیں ہیں نیا ہے سفر
نئے میکدے مسکرانے لگے　　نئے جام گردش میں آنے لگے

نئی صبح ہے اور نیا آفتاب
مبارک زمانے کو یہ انقلاب

ہمیں صبحِ نو ہیں ہمیں آفتاب　　ہمیں ہیں بغاوت ہمیں انقلاب
اندھیری شبوں کے ستارے ہیں ہم　　جو بجھتے نہیں وہ شرارے ہیں ہم
پہاڑوں کو بڑھتے ہیں ہم ریل کر　　نکلتے ہیں طوفان سے کھیل کر
امیروں نے ہم کو ستایا بہت　　حکومت نے ہم کو دبایا بہت
ہمارے لیے قید خانے بنے　　ہمارے لیے تازیانے بنے
ہمیں پتھروں پر سلایا گیا　　ہمیں سولیوں پر چڑھایا گیا
مگر ہم یہ سب ظلم سہتے رہے　　مصائب کے دریا میں بہتے رہے

طمانچے حوادث کے کھاتے رہے　　مگر اپنا پرچم اڑاتے رہے
غریبی کے ہاتھوں پریشاں رہے　　ہواؤں کی زد پر فروزاں رہے
تڑپتے ، مچلتے، اچھلتے رہے　　چٹانوں کے دل سے ابلتے رہے
شعاعوں کی صورت نکھرتے رہے　　بکھرتے نکھرتے سنورتے رہے
ابھرتے رہے مٹ کے ہم بار بار　　بڑھاتے رہے زندگی کا وقار

کبھی بزدلی ہم پہ چھائی نہیں
ہمیں موت کی نیند آئی نہیں

مگر جو بناتے تھے ہم کو غلام　　جو جیتے تھے پی کر لہو صبح وشام
بڑا ناز تھا جن کو تلوار پر　　جو سوتے تھے لاشوں کے انبار پر
جو کرتے تھے دنیا کو زیروزبر　　وہ جن کی کنیزیں تھیں فتح وظفر
انھیں کھا گئے آسمان و زمیں　　نشاں ان کی قبروں کے ملتے نہیں
کہاں ہیں وہ فرعون و ہامان اب　　کہاں ہیں وہ خونخوار سلطان اب
وہ شاہان نسل کیانی کہاں　　وہ جبر وتشدد کے بانی کہاں
وہ نادر کہاں ہے سکندر کہاں　　کہاں ہے مسولینی ، ہٹلر کہاں
وہ چین اور تاتار کے کج کلاہ　　جو بیٹھے تھے بن بن کے عالم پناہ
درندے جو دشمن تھے انسان کے　　جو پھوڑے تھے طاعون وسرطان کے
وہ سب موت کی گود میں سو گئے　　وہ سب وقت کی گرد میں کھو گئے
نہ چنگیز ہے اور نہ تیمور ہے　　جو باقی ہے کوئی تو جمہور ہے

زمانے کے دریا کی موج رواں
ازل سے ابد تک رواں اور دواں

ہزاروں برس کی کہانی ہیں ہم　　کہ فانی نہیں جاودانی ہیں ہم
ہمیں سے ہیں تہذیب کے نقش ورنگ　　ہمیں سے تمدن کی دل کی امنگ
ہمارے ہی دم سے نشان حیات　　ہمیں دیں گے انسانیت کو نجات
مسیحا کے ہونٹوں کا اعجاز ہم　　محمد کے سینے کی آواز ہم
ہماری جبیں پر ہے محنت کا تاج　　ہمیں نے لیا ہے زمیں سے خراج

ہماری ہی قوت سے چلتے ہیں مِل
دھڑکتے ہیں ہم سے مشینوں کے دل

ہواؤں میں پرواز کرتے ہیں ہم
طرارے سمندر میں بھرتے ہیں ہم

کیا ہم نے فطرت کو زیرِ نگیں
جھکا دی زمیں پر فلک کی جبیں

کیا زندگی سے اندھیرے کو دور
نچوڑا ہے سورج کی کرنوں سے نور

ہمیشہ سے ہم گرمِ پیکار ہیں
تواریخ کی تیز تلوار ہیں

فرانسیس کے سر پہ کڑکے تھے ہم
شکاگو کے پہلو میں بھڑکے تھے ہم

دیا ہے نئے عہد کو ہم نے خون
بنایا تھا پیرس میں ہم نے کمیون

جو لینن کے سینے میں طوفان تھا
ہمارے سمندر کا ہیجان تھا

وہ انساں کی جنت وہ سرخ انجمن
ہماری جبیں کی ہے پہلی کرن

جو یورپ کی راتوں میں ہیں ضوفشاں
ہماری نگاہوں کی ہیں بجلیاں

دلِ ایشیا میں جو ہے اضطراب
ہماری ہی ہے روح کا پیچ و تاب

یہ صدیوں کے انسان کا سوز ہے
یہ جمہور کا جشنِ نو روز ہے

ہماری نگاہوں میں پیغامِ عید
ہمیں سے ہے ہندوستاں کی امید

ہمیں ڈھال ہیں ہم ہی تلوار ہیں
ہمیں فوج ہیں ہم ہی ہتھیار ہیں

زمیندار ہوں یا کہ سرمایہ دار
ولایت کے حاکم ہوں یا شہر یار

وجود ان کا ہندوستاں پر ہے بار
کہ جس طرح سورج کے رخ پر غبار

یہ ہیں فخرِ حیوانیت کے لیے
یہ ہیں کوڑھ انسانیت کے لیے

بلندی سے نیچے گرا دو انھیں
یہ پیغام جا کر سنا دو انھیں

حیات آپ سے آج بیزار ہے
حضور آپ کی قبر تیار ہے

چمن اس کا ہے جو چمن میں رہے
وطن اس کا ہے جو وطن میں رہے

ہر اک قوم آزاد و آباد ہو
ہر اک اپنے گھر رہ کے دلشاد ہو

ہر اک اپنے خطے میں پھولے پھلے
ستاروں سے ہم دوش ہو کر چلے

مٹے اس طرح عمر بھر کا فساد　　وطن میں ہو قائم نیا اتحاد

دھنک میں کئی طرح کے رنگ ہوں
مگر پھر بھی وہ سب ہم آہنگ ہوں

یہ دولت ہے میراث انسان کی　　زمیں پر حکومت ہے دہقان کی
ملوں پر ہے مزدور کا اختیار　　وطن پر ہے جمہور کا اختیار
جو موتی نکالے وہ دامن بھرے　　جو محنت کرے وہ حکومت کرے

ہماری کسوٹی ہے انسانیت
اخوت، مساوات اور حریت

محبت کے جذبے ابھاریں گے ہم　　پریشان زلفیں سنواریں گے ہم
عناصر کے گھوڑوں پہ ہو کے سوار　　کریں گے غریبی کے سینے پہ وار
سمندر سے موتی نکل آئیں گے　　زمیں کے خزانے ابل آئیں گے
گھٹاؤں میں تبدیل ہو گا دھواں　　برسنے لگیں گے ستارے یہاں
نہ پھر خوف ہو گا نہ پھر احتیاج　　نئے سر سے تعمیر ہو گا سماج
یہ افلاس کی رات ڈھل جائے گی　　کسانوں کی دنیا بدل جائے گی
رہے گا نہ کوئی بھی بے روزگار　　مصیبت سے چھوٹ جائیں گے کامگار
نہ ہو گا مشینوں کا انساں غلام　　مشینوں پہ قبضہ کریں گے عوام
سجا دیں گے چیزوں سے بازار ہم　　لگا دیں گے دولت کے انبار ہم
پنھائیں گے بچوں کو رختِ حریر　　ہمالہ سے لائیں گے ہم جوئے شیر
سنہرے دوپٹے اڑھائیں گے ہم　　ستاروں سے آنچل بنائیں گے ہم
پھلے اور پھولے گا بھارت کا باغ　　جلیں گے ہر اک گھر میں گھی کے چراغ
کریں گے یہاں رقص حسن و شباب　　زمیں پر اتر آئے گا آفتاب
وہ شاداب چہروں پہ ہو گا نکھار　　کہ جھینپیں اجنتا کے نقش و نگار

نئی دیں گے ماتھے کو تنویر ہم
بدل دیں گے انساں کی تقدیر ہم

11 دسمبر 1946

خون کی لکیر

1949

سلطانہ کے نام

سردار جعفری نے وعدہ کیا تھا کہ خون کی لکیر کا پیش لفظ وہ خود لکھیں گے لیکن حکومت بمبئی نے پبلک سیفٹی آرڈیننس کے تحت ان کو گرفتار کر لیا مجبوراً یہ کتاب پیش لفظ کے بغیر شائع کی جا رہی ہے۔

ناشر

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

غالبؔ

تمہید

زندگانی کی اندھیری رات میں
درد اور دکھ کی بھری برسات میں
لے کے اک ماہِ تمام آیا ہوں میں
میکشو آتش بجام آیا ہوں میں
میرے پیمانے میں گُم ہے کائنات
میرے میخانے میں صہبائے حیات
میرے آئینے میں عکس صبح نو
آفتابِ عہد آزادی کی ضو
شہسوارِ گردشِ ایّام ہوں
انقلابِ وقت کا پیغام ہوں
ہے مری چشمِ تخیل پر عیاں
اک نئے میلاد آدم کا سماں
تاکہ ہو آسان پیکارِ حیات
کر رہا ہوں فاش اسرارِ حیات

اب جرس کو حکم خاموشی نہیں
کارواں میں خود فراموشی نہیں
حسنِ معنی ہو رہا ہے بے نقاب
اٹھ رہے ہیں استعاروں کے حجاب
آشکارا تیغ کا جوہر ہے آج
کسوتِ مینا سے مے باہر ہے آج
خون پیمانوں میں اب ڈھلتا نہیں
اب امیری کا فسوں چلتا نہیں
زلزلہ ہے ظلم کی بنیاد میں
تہلکہ ہے قصر استبداد میں
دم بخود ہیں قیصر و فغفور آج
تیز تر ہے نغمۂ جمہور آج

حلقۂ زنجیر گلنے ہی کو ہے
زندگی کروٹ بدلنے ہی کو ہے

ایک جھلک

صرف لہرا کے رہ گیا آنچل
رنگ بن کر بکھر گیا کوئی

گردشِ خوں رگوں میں تیز ہوئی
دل کو چھو کر گزر گیا کوئی

پھول سے کھل گئے تصوّر میں
دامنِ شوق بھر گیا کوئی

غم کا ستارہ

میری وادی میں وہ اک دن یوں ہی آ نکلی تھی
حسن اور نور کا بہتا ہوا دھارا بن کر

محفلِ شوق میں اک دھوم مچا دی اس نے
خلوتِ دل میں رہی انجمن آرا بن کر

شعلۂ عشق سرِ عرش کو جب چھونے لگا
اڑ گئی وہ مرے سینے سے شرارا بن کر

اور اب میرے تصور کا افق روشن ہے
وہ چمکتی ہے جہاں غم کا ستارا بن کر

☆☆☆☆

غزل

حسن کی رنگیں ادائیں کارگر ہوتی گئیں
عشق کی بیباکیاں بیباک تر ہوتی گئیں

یاں مری بہکی ہوئی نظریں بہکتی ہی رہیں
واں نگاہیں اور بھی کچھ معتبر ہوتی گئیں

زندگانی اپنے نشتر آزماتی ہی رہی
ان کی نظریں بخیۂ چاکِ جگر ہوتی گئیں

لب پہ ہلکے سے تبسم کی مٹھاس آتی گئی
زندگی کی تلخیاں شیر و شکر ہوتی گئیں

آرزوئیں نارسائی کا گلہ کرتی رہیں
اور وہ زلفیں زینتِ دوش و کمر ہوتی گئیں

حسنِ سوگوار

کیا کہوں کیا ہے وہ حسنِ سوگوار
جس کو نظریں دور سے کرتی ہیں پیار
خال و خد میں رس نگاہوں میں شراب
مہکی مہکی سانس میں روحِ گلاب
انکھڑیوں میں خواب و بیداری لئے
زلف کے ہر خم میں دلداری لئے
بات کرتی ہے تو یوں جھڑتے ہیں پھول
جیسے گلشن میں بہاروں کا نزول
ہو کے چپ جب بیٹھ جاتی ہے کبھی
خامشی سے پھوٹتی ہے راگنی
آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی ہے کبھی
جم کے رہ جاتی ہے سورج کی نظر
پھر بھی رخ پر ہے اداسی کا غبار
جس طرح پھولوں پہ شبنم کی پھوار
آسماں پہ شام کی پرچھائیاں

آئینے پر ہلکی ہلکی جھائیاں
صبح کے منظر پہ کہرے کا اثر
ابر کی چادر عروسِ ماہ پر
ادھ کھلے مخمور آنکھوں کے کنول
ابروؤں کی نوک پر ہلکا سا بل
قہقہوں میں گریۂ غم کی خراش
انگلیوں میں ایک مبہم ارتعاش
شوق کی برنائیوں سے بیقرار
عشق کی ناکامیوں سے سوگوار
رسم کی زنجیر میں جکڑی ہوئی
حلقۂ تقدیر میں جکڑی ہوئی
لاکھ چاہے پھر بھی خوش رہتی نہیں
دل میں کڑھتی ہے مگر کہتی نہیں
ہنستے ہنستے جیسے کھو جاتی ہے وہ
بات کرتے کرتے سو جاتی ہے وہ
سوچ کر کچھ ڈبڈبا آتی ہے آنکھ
چپکے چپکے اشک برساتی ہے آنکھ
روتے روتے مسکرا دیتی ہے پھر
دل میں شمعیں سی جلا دیتی ہے پھر

اس کی خوشیاں جتنی غم انگیز ہیں
اس کے غم اتنے ہی دلآویز ہیں

تذبذب

آج تو شوق کے ساحل پہ کھڑی ہے خاموش
موج کا رقصِ جنوں پاس بلاتا ہے تجھے
ریت پر گزرے ہوئے عہد کا ہر نقش قدم
ایک بھولا ہوا افسانہ سناتا ہے تجھے
تھپکیاں دے کے سلا دیتی ہے ساحل کی ہوا
اور اٹھتا ہوا طوفان جگاتا ہے تجھے
ڈوبتی شام کے ماتھے کا چمکتا تارا
زندگانی کا نیا خواب دکھاتا ہے تجھے
شب کا بڑھتا ہوا پُرہول سیہ رنگ فسوں
اک المناک اندھیرے سے ڈراتا ہے تجھے

بحر کی سطح حسیں رات کی پرچھائیں سے
ایک آئینۂ تاریک ہوئی جاتی ہے
چھپ گیا مہر مبیں اور شفق کی قندیل
سرد بے رحم ہواؤں سے بجھی جاتی ہے
ظلمتیں چیر کے دامانِ فلک نکلی ہیں
نور کے ہاتھ کی تصویر مٹی جاتی ہے

اے "مرے چاند" محبت کے افق سے ہو طلوع
جگمگا آج فروغِ مہِ تاباں ہو کر
نور ہی نور سے اطراف جہاں کو بھر دے
پھیل جا جلوۂ بے باک فروزاں ہو کر
برق کی طرح چمک، شعلے کی مانند لپک
عمر بھر یوں تو نہ جل، شمعِ شبستاں ہو کر
موج کی طرح سے وابستۂ ساحل ہی نہ رہ
حسن کی بحر سے اٹھ عشق کا طوفاں ہو کر
قطرۂ اشک لرزتی ہوئی پلکوں پہ نہ بن
جھلملا گوہرِ خوش آب و درخشاں ہو کر
پھول کی طرح سے کھل شوق کے گلزاروں میں
پھیل جا نکہتِ گل رنگِ بہاراں ہو کر

دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کر دے
تابشِ رخ سے اندھیرے میں چراغاں کر دے

حسن ناتمام

کس قدر شاداب و دلکش ہے وہ حسن ناتمام
جس کی فطرت غنچگی، دوشیزگی ہے جس کا نام

جس طرح پچھلے پہر کا صاف و پاکیزہ افق
جس کے سینے میں ابھی پہلی کرن پھوٹی نہیں
جس طرح اک کھلنے والی ناشگفتہ سی کلی!
جس کے دامن تک ابھی بادِ سحر پہنچی نہیں
برگِ گل پر جس طرح شبنم کی اک ننھی سی بوند
جو شعاعِ مہرِ تاباں سے ابھی الجھی نہیں
جس طرح ساغر میں صہبا جیسے مینا میں شراب
جو ابھی مچلی نہیں ، چھلکی نہیں، اُبلی نہیں
جس طرح اک شوخ بجلی بادلوں کی آڑ میں
جو ابھی تڑپی نہیں، چمکی نہیں، ٹوٹی نہیں
جس طرح گیسوئے پیچاں، جیسے زلفِ خم بہ خم
جو ابھی کھل کر ہوا کے دوش پر مہکی نہیں
جس طرح دریا میں موتی جیسے موجوں میں صدف

چشمِ انساں نے ابھی جن کی چمک دیکھی نہیں
جیسے ذہنِ پاک شاعر میں تخیل کی پری
جو ابھی تک شیشۂ الفاظ میں اتری نہیں
جس طرح آنکھوں میں ہلکے سے تبسم کی جھلک
جو کرن بن کر لب و رخسار پر بکھری نہیں

اب تلک یوں ہی اچھوتا ہے وہ حسنِ ناتمام
جس کی فطرت غنچگی ، دوشیزگی ہے جس کا نام

لکھنؤ کی ایک شام

یہ مال روڈ یہ گرمی کی شام کیا کہنا
وفورِ جلوۂ دیدارِ عام کیا کہنا
بساط ارض پہ عرشِ بریں کے مہ پارے
زمیں کی گود میں ماہِ تمام کیا کہنا
دلہن کی طرح سے آراستہ دکانوں پر
جوانیوں کا حسیں اژدہام کیا کہنا
کشیدہ قامت و گل پیکر وسبک اندام
غزال وحشت وآہو خرا م کیا کہنا
کوئی ہلال، کوئی ماہ، کوئی مہر مبیں
کوئی تمام کوئی ناتمام کیا کہنا
کسی کی شوخیِ انداز لغزشِ پا میں
ہزار ناز و نیاز وپیام کیا کہنا
کسی کی آنکھ کے ہلکے سے اک اشارے میں
شکستِ شیشہ و مینا وجام کیا کہنا
فضا میں رات کی پرچھائیوں کی بیتابی
زمیں پہ رقص کناں روحِ شام کیا کہنا
مچل رہی ہے جوانی ابل رہی ہے شراب
نگاہِ شوق ہے پھر تشنہ کام کیا کہنا

خیر مقدم

مبارک ہو کہ وہ غم خوارِ جانِ بے قرار آیا
سوادِ لکھنؤ میں آہوئے دشتِ تتار آیا
نگارِ نو بہار و نو بہارِ گل عذار آیا
چمن ہے رنگ ساماں رنگ سامانِ بہار آیا
عنا دل سے کہو گائیں ترانے خیر مقدم کے
بہاروں کو خبر دو مطرب سازِ بہار آیا
دلِ بے تاب کی تسکین کو پہلے خبر آئی
بڑی مدت کے بعد آخر وہ جانِ انتظار آیا
جسے سمجھا تھا دل نے دشمنِ تمکیں و ہوش اب تک
سکونِ روح و دل بن کر وہ یارِ غمگسار آیا
ادا کی برق چمکی زلفِ پیچاں کی گھٹا برسی
اودھ کے میکدے پر گھر کے ابرِ کوہسار آیا
ہوائے شوق سے کھلنے لگیں کلیاں تبسم کی
نویدِ موسمِ گل مژدۂ فصلِ بہار آیا
رگوں میں خون بن کر لذتوں کی بجلیاں دوڑیں
نگہ میں لوٹ کر شبہائے عشرت کا خمار آیا
سنا کرتے تھے حسن وینس و ہیلن کے افسانے
جمالِ وینس و ہیلن کا آخر اعتبار آیا

اکیلا ستارہ

افق کے کونے میں اک اکیلا ستارہ یوں جگمگا رہا ہے!
کہ کوئی جیسے غموں کی یورش میں زیرِ لب مسکرا رہا ہے

فضاؤں کے سرمئی دھندلکے میں شام تحلیل ہو رہی ہے
ہوا میں اڑتا ہے شب کا آنچل اندھیرا بڑھتا ہی جا رہا ہے

ٹپک پڑا ہے سیاہ شب کی سیاہ پلکوں سے ایک آنسو
شفق کے رخسار سے ڈھلک کر زمیں کے دامن میں آ رہا ہے

سرمایہ دار لڑکیاں

شہر کے رنگیں شبستانوں کی تنویریں ہیں یہ!
نوجوانی کے حسین خوابوں کی تعبیریں ہیں یہ
ہے انھیں کے دم سے مصنوعی تمدن کی بہار
ہیں یہی تہذیب کے آذرکدے کی شاہکار
دید ہی ان کی بہشتِ کیف و فردوسِ نشاط
خوش رخ و خوش پیرہن، خوش پیکر و خوش اختلاط
محفلوں کی شادمانی رقص گاہوں کا سرور
دل کے کاشانوں کی آبادی طرب گاہوں کا نور
اک لطافت اک نزاکت نطق گوہر بار کی
اک شعاعِ نور شاعر کے تجلی زار کی
اک مغنی کے نفس کا نغمۂ کیف و بہار
اک مصور کے قلم کی جنبشِ بے اختیار
بزم آرائی کی خو ذوقِ کم آمیزی کے ساتھ
جنبشِ مژگان بھی اک شانِ دلآویزی کے ساتھ
گردنوں کا خم، کمر کا لوچ، سینوں کا ابھار
صندلی ہاتھوں سے بت خانوں کی صبحیں آشکار

قہقہے سوئے ہوئے جذبے جگانے کے لئے
گفتگو ہر سننے والے کو لبھانے کے لئے
بیقرار آنکھیں دلوں کو دعوتیں دیتی ہوئی
نوجوانی بار بار انگڑائیاں لیتی ہوئی
ولولے ہر ہر نفس زیروزبر ہوتے ہوئے
دم بدم جھونکے ہوا کے تیز تر ہوتے ہوئے
سامنے اک بار آ جانا ٹھٹکنے کے لئے
نوجوانوں سے الجھ پڑنا جھجکنے کے لئے
اہرمن تو اہرمن ہو جائے یزداں بھی شکار
ان کا ہر انداز تاجر ہر ادا سرمایہ دار
عشق کے ذوقِ نظارہ نے نکھارا ہے انھیں
مرد کی صدیوں کی محنت نے سنوارا ہے انھیں

ڈوب تو سکتی ہیں یہ لیکن ابھر سکتی نہیں
یہ کنارو بوس کی حد سے گزر سکتی نہیں

مزدور لڑکیاں

گردشِ افلاک نے گودی میں پالا ہے انھیں
تلخیِ آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انھیں
گھورتی رہتی ہے گرمی میں نگاہِ آفتاب
آسماں کرتا ہے نازل ان پہ کرنوں کا عتاب
سر سے ساون کی گھٹا جاتی ہے منڈلاتی ہوئی
سرد جاڑوں کی ہوا سینوں کو برماتی ہوئی
بیکسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب
ساز ان کا سوزِ حسرت خامشی ان کا رباب
سر سے پا تک داستانیں حسرتِ ناکام کی
نرم و نازک قہقہوں میں تلخیاں ایام کی
خشک لب، پھیکی نظر، مدقوق چہرے، زرد گال
وہ دھنسی آنکھیں، فسردہ رنگ، گرد آلود بال
پپڑیاں ہونٹوں پہ زخموں کے کناروں کی طرح
گرم ہاتھوں پر عرق مدھم ستاروں کی طرح
بوجھ کا مرہون منت ان کے ابرو کا تناؤ
ان کا حاکم ظلم ان کا پاسباں بے جا دباؤ

ان کے ساتھی پھاوڑے ان کی سہیلی ہے کدال
زندگی پر یہ وبال اور زندگی ان پر وبال
لیکن ان کی پستیوں کو اپنی رفعت سے نہ دیکھ
ان کی غربت پر نہ جا ان کو حقارت سے نہ دیکھ
اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب
ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشمِ انقلاب
ٹھوکروں پر ان کی جھک سکتے ہیں ایوان وقصور
توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹانوں کا غرور
ان کی چوٹوں پر نکلتے ہیں پہاڑوں سے شرار
یہ اگر چاہیں الٹ ڈالیں بساطِ روزگار

بن کے قوت ایک دن ابھرے گی صدیوں کی تھکن!
دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظامِ انجمن

انتظار نہ کر

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

عجب گھڑی ہے میں اس وقت آ نہیں سکتا!
سرورِ عشق کی دنیا بسا نہیں سکتا
میں تیرے سازِ محبت پہ گا نہیں سکتا

میں تیرے پیار کے قابل نہیں ہوں پیار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

خراج اپنی جوانی سے لے رہا ہوں میں
سفینہ خون کے دریا میں کھے رہا ہوں میں
صدا اجل کے فرشتے کو دے رہا ہوں میں

بس اب نوازشِ پیہم سے شرمسار نہ کر
نہ کر خدا کے لیے میرا انتظار نہ کر

عذارِ نرم پہ رنگِ بہار رہنے دے
نگاہِ شوق میں برق و شرار رہنے دے
لبوں پہ خندۂ بے اختیار رہنے دے

متاعِ حسن و جوانی کو سوگوار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

شکستہ ساز کے ٹوٹے ہوئے سبو کی قسم
دھڑکتے دل کی ٹپکتے ہوئے لہو کی قسم
تجھے وطن کے شہیدوں کی آبرو کی قسم

اب اپنے دیدۂ نرگس کو اشکبار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

عہد حاضر

وقت کی پلکوں پہ اک آنسو چمکتا ہے مگر
تھرتھرا سکتا ہے عارض پر ٹپک سکتا نہیں

عمر کی بوڑھی رگوں میں نوجوانی کا لہو
دوڑتا پھرتا ہے چہرے پر جھلک سکتا نہیں

تاج انگریزی میں اک ہیرا ہے مثل آفتاب
ہند کے بے نور ماتھے پر دمک سکتا نہیں

چپکے چپکے کِھل رہا ہے عہدِ نو کا سرخ پھول
مسکرا سکتا ہے زیرِ لب مہک سکتا نہیں

ایک انگارہ چھپا ہے زندگی کی راکھ میں
راکھ کے نیچے سلگتا ہے دہک سکتا نہیں

ایک سوال

معلوم نہیں ذہن کی پرواز کی زد میں
سرسبز امیدوں کا چمن ہے کہ نہیں ہے

لیکن یہ بتا وقت کا بہتا ہوا دھارا
طوفان گر و کوہ شکن ہے کہ نہیں ہے

سرمایے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے

وہ زیرِ افق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے

پیشانیِ افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

نیا زمانہ

اے دوست نیا زمانہ آیا
بہنے لگا زندگی کا دھارا
مشاطۂ عہد نو نے بڑھ کر
فطرت کی عروس کو سنوارا
غنچوں نے نیا لباس پہنا
کلیوں نے بھی پیرہن اتارا
لالے کے جگر کی آگ بھڑکی
نرگس نے نگہ کا تیر مارا
رنگین شفق نے گود کھولی
سورج نے افق سے سر ابھارا

انوارِ سحر میں ہو گیا گم
ڈھلتی ہوئی رات کا ستارا

غزل

گہری بہت شکن ہے جبینِ حیات کی
یہ خط نہیں مصوّرِ رنگیں کمال کا

ابروئے کائنات پہ ہے بجلیوں کی ضو
پرتو نہیں ہے عارضِ آتش جمال کا

یہ وقت کے کھنچے ہوئے خنجر کی دھار ہے
یہ بانکپن نہیں ہے عروسِ ہلال کا

فولاد کی گرج ہے یہ آہن کا شور ہے
نغمہ نہیں ہے شاعرِ نازک خیال کا

1940

اختلافِ رائے

کیوں نہیں تجھ کو گوارا مرا اظہارِ خیال
یہ کوئی زہر بھرا جام نہیں ہے اے دوست

اختلافات سے کھلتی ہے تخیل کی گرہ
یہ بھی اک دائے بہ دشنام نہیں ہے اے دوست

کشمکش عظمتِ کردار عطا کرتی ہے
زندگی عافیت انجام نہیں ہے اے دوست

ٹوٹا ہوا ستارہ

آ رہا ہے اک ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر
دوڑتا اپنے جنوں کی راہ پر دیوانہ وار
اپنے دل کے شعلۂ سوزاں میں خود جلتا ہوا
منتشر کرتا ہوا دامان ظلمت میں شرار
اپنی تنہائی پہ خود ہی ناز فرماتا ہوا
شوق پر کرتا ہوا آئین فطرت کو نثار
کس قدر بیباک، کتنا تیز، کتنا گرم رو
جس سے سیاروں کی آسودہ خرامی شرمسار
موجۂ دریا اشاروں سے بلاتی ہے قریب
اپنی سنگیں گود پھیلائے ہوئے ہے کوہسار
ہے ہوا بے چین آنچل میں چھپانے کے لئے
بڑھ رہا کرۂ گیتی کا شوقِ انتظار

لیکن ایسے انجم روشن جبیں و تابناک
آپ ہو جاتے ہیں اپنی تابناکی کا شکار

وہم وخیال

(زمانہ ماقبل تاریخ کے انسان کا ذہنی تجزیہ)

وقت

مسکراتے ہیں مناظر رقص کرتے ہیں نجوم
گنگناتی ہیں چٹانیں گا رہے ہیں آبشار
چھن رہا ہے ابر کے پردے سے نور آفتاب
اور فضا میں پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی سی پھوار
وقت کے میلے بدن پر دھاریاں ہیں نور کی
تھرتھراتے ہیں ہوا میں سینکڑوں چاندی کے تار
عارضِ گل رنگ پر صبحِ تمدن کی نمود
گود میں تہذیبِ انسانی کا طفلِ شیر خوار
آنکھ میں ماضی کا جادو رخ پہ مستقبل کا نور
انکھڑیوں میں ارتقاء کے جامِ رنگیں کا خمار
اپنے سینے میں لئے انسان کے سینے کا جوش
دوش پر اپنے اٹھائے فکرِ انسانی کا بار

فکرِ انسانی

ٹوٹتی ہے کیوں شعاعِ مہرِ تاباں کی کمند
شب اٹھا لیتی ہے کیوں ناہید و پروین کا ستار
رات کے ڈھلتے ہی پڑ جاتی ہے پھیکی چاندنی
صبح ہوتے کیوں بکھر جاتا ہے تاروں کا غبار
جھوم کر اٹھتی ہے کیوں اودی فضاؤں میں گھٹا
کوہ و صحرا پر برس جاتا ہے کیوں ابرِ بہار
کیوں پلٹ جاتا ہے موسم کیوں بدل جاتی ہے رت
کھیلتی ہے کیوں خزاں کی گود میں فصلِ بہار
موت اڑا لیتی ہے کیوں گل فام رخساروں کا رنگ
ہے اجل کی نیند کا کیوں چشمِ ہستی میں خمار
رات کو ہوتا ہے کیوں گذرے مناظر کا ہجوم
خواب میں رہتی ہے کیوں پیشِ نظر تصویرِ یار
ذہن کی تاریکیوں میں نور پھیلاتا ہے کون
کس کے نغمے ہیں سرودِ زندگی پر بے قرار
زیرِ دامانِ افق سے پھول برساتا ہے کون
کون ہوتا ہے شفق کے رنگ میں آئینہ کار
کون سوتا ہے ردائے برف میں لپٹا ہوا

کوہ کی چوٹی ہے کس دوشیزہ سینے کا ابھار
آندھیوں سے اس طرح سرگوشیاں کرتا ہے کون
گونجتی ہے وادئی کہسار میں کس کی پکار
کس کی ہیبت ہے کہ گیتی کا دہل جاتا ہے دل
''کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار''
آسمان پر ہے یہ کس کے تازیانوں کی صدا
آرہا ہے کون یہ بادل کے گھوڑے پر سوار

اٹھ رہا ہے کیوں پہاڑی کے کلیجے سے دھواں
ناچتا ہے کون یہ پہنے ہوئے شعلوں کے ہار

الاماں اے عالم فطرت کی ارواح عظیم
ہے حد ادراک سے باہر تمہارا اقتدار
ہے عناصر میں تمہارے حسن و ہیبت کی نمود
آتش و آب و ہوا پر ہے تمہارا اختیار
تم وہاں رہتی ہو انسانی تخیل سے پرے
جس جگہ جھک کر زمیں کو آسماں کرتا ہے پیار
اور لائے ہیں تمہاری بارگاہِ ناز میں
خوف کے مارے ہوئے مجبور انسانوں کی ہار

دیکھ کر انساں کی پستی وقت بھی تھرا گیا
ارتقاء کے نرم ماتھے پر پسینہ آگیا

ارتقا

آہ اے ناداں خیالی دیوتاؤں کو نہ پوج
ذہن میں بنتے ہیں جو ایسے خداؤں کو نہ پوج
جو برستے ہیں یہاں بھی اور وہاں بھی ہم نشیں
ایسے آوارہ طبیعت بے وفاؤں کو نہ پوج
ہاں مرادیں اپنی ان گونگی چٹانوں سے نہ مانگ
قدر کر اپنے ارادوں کی دعاؤں کو نہ پوج
پوجنا ہے پوج اپنی فطرتِ آزاد کو
مشرق و مغرب کی آوارہ ہواؤں کو نہ پوج
گود میں سمٹی ہوئی رعنائیوں کو چھوڑ کر
وادیٔ و کہسار کے رنگیں اداؤں کو نہ پوج
بھول کر اپنے سرود لذتِ گفتار کو
آسماں میں گونجنے والی صداؤں کو نہ پوج

یہ خدا یہ دیوتا دو روز ہی رہ پائیں گے
جہل سے پیدا ہوئے ہیں علم سے مر جائیں گے

غالب

آسمانوں کی بلندی کو بڑا کا ناز تھا
پست ہمت جس سے ذوقِ رفعتِ پرواز تھا
رہگزارِ ماہ و انجم تک کوئی جاتا نہ تھا
کوئی شاخِ کہکشاں پر بیٹھ کر گاتا نہ تھا
عرش پر جبریل کا دمساز ہو سکتا تھا کون
طائرِ سدرہ کا ہم آواز ہو سکتا تھا کون
جو لگا دے آگ کوئی نغمہ زن ایسا نہ تھا
تجھ سے پہلے کوئی داؤدِ سخن ایسا نہ تھا
تو نے چھیڑے ہیں وہ نغمے شاعری کے ساز پر
لحنِ داؤدی کو رشک آئے تری آواز پر
تیرا بربط کہکشاں، ناہید ہے تیرا رباب
آسماں کیا ہے ترے بحرِ تخیل کا حباب
تیرا نغمہ ساحری، تیرا بیاں پیغمبری
تیرے قبضہ میں ہے اقلیمِ سخن کی داوری
تیری فکرِ نکتہ رس حسنِ تخیل کا شباب
شعر تیرا معجزہ تیری کتاب ام الکتاب

وہ صداقت ، وہ حقیقت ، وہ جمالِ برق پاش
زندگی جس کے لیئے قرنوں سے سرگرمِ تلاش
وہ صداقت عکس افگن ہے تری تقریر میں
وہ حقیقت جلوہ فرما ہے تری تحریر میں
حسن کے جلووں سے جب محروم ہو جاتے ہیں ہم
کذب کے ظلمت کدے میں جا کے کھو جاتے ہیں ہم
جب کہ ہوتا ہے شبِ غم میں بلاؤں کا نزول
جب نگاہیں پھیر لیتے ہیں مہ و مہر و نجوم

شعر تیرے جگمگا اٹھے ہیں اس ظلمات میں
جس طرح جگنو چمکتے ہیں بھری برسات میں
تو نے دل کو گرم سینوں کو فروزاں کر دیا
روح کو روشن ، دماغوں کو چراغاں کر دیا
تو مثالِ شمع ماضی کے سیہ خانے میں ہے
نور تیرا حال و مستقبل کے کاشانے میں ہے

تیرے گلشن کی بدولت گل بداماں ہم بھی ہیں
تیرے نغموں کے اثر سے نغمہ ساماں ہم بھی ہیں

موت اور زندگی

وہ جبیں جس پہ چمکتا تھا دمکتا ہوا چاند
سرد ہے اوس میں بھیگے ہوئے پھولوں کی طرح
جسم لکڑی کی طرح سخت ہوا جاتا ہے
ہاتھ ہیں خشک بیاباں کے ببولوں کی طرح

آنکھ ہے بند لب نغمہ فشاں ہے خاموش
موت کی برف جمی جاتی ہے رخساروں پر
مردنی چہرے پہ یوں چھائی ہوئی ہے جیسے
راکھ کا ڈھیر ہے بجھتے ہوئے انگاروں پر

اب نہ دوڑے گا لہو اب نہ چلیں گی نبضیں
اب نہ مہکیں گے ترے عارضِ رنگیں کے گلاب
اب تنیں گی نہ بھویں اب نہ جھکیں گی پلکیں
اب نہ ٹپکے گی نگاہوں سے محبت کی شراب

اب نہ پھیلے گی تری زلفِ پریشاں کی شمیم
عکس تیرا نہ نظر آئے گا آئینے میں
اب نہ چونکائیں گی قدموں کی صدائیں تجھ کو
کوئی طوفان اٹھے گا نہ تیرے سینے میں

چوڑیاں تیری کلائی کے لئے روئیں گی
کنگھیاں ترسیں گی الجھے ہوئے بالوں کے لیئے
ہوگی سرمے کو ترے دیدۂ و مژگاں کی تلاش
غازہ رکھا ہی رہے گا ترے گالوں کے لئے

کونلیں کوکیں گی، گائیں گے پپیہے لیکن
آہ تو پیار بھرے گیت سنے گی نہ کبھی
گھر کے آکاش پہ ساون کی گھٹا آئے گی!
تو مگر اپنے دوپٹے کو چنے گی نہ کبھی

رات ڈھونڈھے گی تجھے لیکے ستاروں کے چراغ
شمعیں بھٹکیں گی بیاباں میں کہستانوں میں
جا کے ہر سمت پکاریں گی ہوائیں تجھکو
پھول دیکھیں گے تری راہ گلستانوں میں

ڈھونڈ ھنے والے تجھے ڈھونڈ کے تھک جائیں گے
بزمِ فطرت کی کسی شے میں نہ پائیں گے سراغ
صبر کر لیں گے تری موت پہ رونے والے
جھلملا جاتے ہیں انسان کی یادوں کے چراغ

کیا بس اتنا ہی ہے اس پیکرِ خاکی کا مآل؟
سیلِ بیباکِ حوادث میں بشر کچھ بھی نہیں؟
یک نفس بیش نہیں فرصتِ ہستی یہ کیا؟
گرمیِ بزم بجز رقصِ شرر کچھ بھی نہیں؟

(ماخوذ از غالب)

اپنی گڑیا سے مگر کھیل رہا ہے یہ کون؟
مجھ کو جیسے تری تصویر نظر آتی ہے
اس کی ننھی سی دمکتی ہوئی پیشانی پر
ایک کھوئی ہوئی تنویر نظر آتی ہے

اس کے چہرے پہ ترے حسن کی تابانی ہے
اس کی آنکھوں میں چھلکتی ہے جوانی تیری
نرم سینے میں تری موجِ نفس ہے بیتاب
لبِ معصوم پہ ہے نغمہ فشانی تیری

موت جب آ کے کوئی شمع بجھا دیتی ہے
زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے

نئی شاعری

آگ محفل میں غلاموں کی لگا دیں اے دوست
دل کی بجھتی ہوئی شمعوں کو فروزاں کر دیں
گائیں ٹوٹے ہوئے بربط پہ ترانے دل کے
بزم کو اپنی نواؤں سے غزل خواں کر دیں
کعبہ و دیر و کلیسا کی بجھا دیں قندیل
ہر طرف مشرق و مغرب میں چراغاں کر دیں
توڑ دیں وہم نے پہنائی تھیں جو زنجیریں
آ گیا وقت کہ اب وا درِ زنداں کر دیں
ڈال دیں وقت کی افسردہ نگاہوں میں نگاہ
عہد پارینہ کو اک خواب پریشاں کر دیں
رنگِ خوں بھر کے بنائیں وہ نئی تصویریں!
کاوشِ مانی و بہزاد کو حیراں کر دیں
چھین لیں ہاتھ بڑھا کر مہ و پروین سے چمک
ہند کی خاک کے ذرّوں کو درخشاں کر دیں
مسند عیش سے شاہوں کو اٹھا دیں چل کر
''مور بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کر دیں''

کب تلک راہ کے کانٹوں سے بچائیں گے قدم
ان کو تھوڑا سا لہو دے کے گلستاں کر دیں
اب نظر پھیر لیں ایران کے گلزاروں سے
نگہ شوق کو کشمیر بداماں کر دیں
دے کے احساس نیا ہند کے مہ پاروں کو
حسن یوسف کو چراغ تہ داماں کر دیں
عام ہو غالب و اقبال کی رعنائی فکر
بے زبانوں کو زباں دے کے زباں داں کر دیں
کھول دیں سب کے لئے قفل در میخانہ
حضرت جوش کو سر حلقہ زنداں کر دیں

بغاوت

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر بغاوت ہے خدا میرا

بغاوت رسم چنگیزی سے تہذیب تاری سے
بغاوت جبر واستبداد سے سرمایہ داری سے
بغاوت سرسوتی سے لکشمی سے بھیم وارجن سے
بغاوت دیویوں سے دیوتاؤں کے تمدن سے
بغاوت اہم کی پابندیوں سے قید ملت سے
بغاوت آدمی کو پینے والی مشیت سے
بغاوت عزت و پندار ونخوت کی اداؤں سے
بغاوت بوالہوس ابلیس سیرت پارساؤں سے
بغاوت زرگری کے مسخ مذہب کے ترانوں سے
بغاوت عہد پارینہ کی مردہ داستانوں سے
بغاوت اپنی آزادی کی نعمت کھونے والوں سے

بغاوت عظمتِ رفتہ کے اوپر رونے والوں سے
بغاوت دورِ حاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے
بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بد دعاؤں سے
بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے
بغاوت ایک انسان کے سوا سارے زمانے سے

بغاوت آدمیت کے دیوتا کا آستانہ ہے
بغاوت عصرِ حاضر کے پیمبر کا ترانہ ہے

1937

٭٭٭٭٭٭٭٭

جوانی

نہ چھیڑ اے ہم نفس ٹوٹے ہوئے بربط کے تاروں کو
جگایا یوں نہیں کرتے ہیں خوابیدہ شراروں کو
مری آشفتہ حالی دیکھ کر تو مسکراتا ہے
مرے بوسیدہ پیراہن سے تو نظریں چراتا ہے
مری آواز تیرے نرم کانوں پر گراں کیوں ہے؟
مری افسردگی سے اس قدر تو بدگماں کیوں ہے؟
زمانے کا ستم ہر دم رہا ہے رازداں میرا
بھرا ہے ایسے ہی کانٹو ں سے سارا گلستاں میرا
غموں کو روند کر ہنستا ہوا پھرتا ہوں دنیا میں
طمانچے موج کے کھاتا ہوا جاتا ہوں دریا میں
زمانے بھر میں تنہا رازداں ہوں لذتِ غم کا
سراپا درد ہو کر بھی ہوں درماں سارے عالم کا
مری فطرت زمیں کی وسعتوں کو تنگ کہتی ہے
مری عزت اضافی عزتوں کو ننگ کہتی ہے

امنگوں نے مجھے دودھ اپنے سینے سے پلایا ہے
ہزاروں ولولوں نے میرا گہوارہ ہلایا ہے
کھلایا ہے مجھے گودوں میں جرأت نے حمیت نے
سلایا لوریاں دے کر مجھے ہمت نے عزت نے
جہاں کی گردشوں نے دردوغم کی راحتیں بخشیں
مری خودداریوں نے زندگی کی لذتیں بخشیں
میرے نعروں میں ہے جاہ و جلالِ جوشِ طوفانی
میری آہوں پہ بل کھاتی ہوئی موجوں کی طغیانی
مری آواز میں لاکھوں یتیموں کی دعائیں ہیں
مرے نغموں میں زنجیروں کے بجنے کی صدائیں ہیں
مرے زخموں میں حدت زندگی کے آفتابوں کی
مری ٹھوکر میں پنہاں داستانیں انقلابوں کی
نیا نغمہ کوئی جب سانس لے لیتا ہے سینے میں
ہزاروں داغ پڑ جاتے ہیں پتھر کے کلیجے میں
چٹانوں کا جگر پھٹتا ہے اس نغمہ سرائی سے
پگھل جاتا ہے دل آہن کا اس آتش نوائی سے
گرج گولوں کی اکثر بے اثر ہوتی ہے کانوں پر
کبھی جب نیند آ جاتی ہے توپوں کے دہانوں پر
گزر جاتا ہوں طوفاں بن کے دریا کے کناروں سے
پہاڑوں کو ہٹا دیتا ہوں آنکھوں کے اشاروں سے
زمانے بھر پہ چھا جاتا ہوں شفقِ آسماں ہو کر
اچھل جاتا ہوں جب ساحل سے موج بیکراں ہو کر
میں چشمہ بن کے پتھر کے شگافوں سے ابلتا ہوں
تڑپ موجوں کی بن کر سنگ ریزوں پر مچلتا ہوں

سکوں کو لا کے ہنگاموں کے پہلو میں سلاتا ہوں
نوائے تلخ سے میں سارے عالم کو جگاتا ہوں
پکڑ کر ہاتھ مسند سے اٹھا دیتا ہوں سلطاں کو
بٹھا دیتا ہوں لا کر تخت پر قیصر کے دہقاں کو
مرا جی لگ نہیں سکتا ہے شاہوں کی شبستاں میں
بنایا ہے نشیمن میں نے زخموں کے گلستاں میں
مرے ہونٹوں پہ نغمے کانپتے ہیں دل کے تاروں کے
میں ہولی کھیلتا ہوں خون سے سرمایہ داروں کے

حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مسلک میرا مذہب نوجوانی ہے

1936

☆☆☆☆☆☆☆☆

سماج

چھپی بیٹھی ہے مکاری حریم زہد وتقویٰ میں
گناہوں کی جھلک ہے حسنِ معصومِ کلیسا میں
عیاں سفاکیاں پرہیزگاروں کی جبینوں سے
ٹپکتا ہے لہو پیر حرم کی آستینوں سے
ریاکاری اشارے کر رہی ہے چشم پرفن سے
تعصب کی صدا آتی ہے ناقوس برہمن سے
اخوت کی زباں محروم انداز تکلم ہے
بتانِ رنگ وخوں کے لب پہ زہریلا تبسم ہے
نہ جانے کیوں یہ دنیا قومیت کے راگ گاتی ہے
یہ وہ چکی ہے جس میں آدمیت پیسی جاتی ہے
نظام کہنہ کے کندھوں پہ اصلاحوں کے لاشے ہیں
بہت سے بت ملوکیت کے آذر نے تراشے ہیں
دھمک پیروں کے نیچے ہے گرج توپوں کی کانوں پہ
گھٹائیں جنگ کی منڈلا رہی ہیں آسمانوں پہ

فضا بگڑی ہوئی ہے زہر پھیلا ہے ہواؤں میں
نئی پرخاش ہے جھوٹی سیاست کے خداؤں میں
بیابانوں پہ حملہ ہے پہاڑوں پر چڑھائی ہے
سمندر پر چھڑی ہے جنگ شہروں پر لڑائی ہے
قیامت کب تلک ڈھائیں گے یہ آفت کے پرکالے
یہ جمہوری کمیں گاہوں میں چھپ کر بیٹھنے والے
تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو
زمانہ کس قدر بیتاب ہے کروٹ بدلنے کو

1937

سالِ نو

یہ ٹیلی فون پہ دی سالِ نو کی تہنیت کس نے
تمنّا رقص کرتی ہے تخیّل گنگناتا ہے

تصور اک نئے احساس کی جنت میں لے آیا
نگاہوں میں کوئی رنگین چہرہ مسکراتا ہے

جبیں کا عکس پڑتا ہے فلک کے ماہ پاروں پر
ضیاء پھیلی ہوئی ہے سارا عالم جگمگاتا ہے

شفق کے نور سے روشن ہیں محرابیں فضاؤں کی
ثریّا کی جبیں زہرہ کا عارض تمتماتا ہے

پرانے سال کی ٹھٹھری ہوئی پرچھائیاں سمٹیں
نئے دن کا نیا سورج افق پر اٹھتا آتا ہے

زمیں نے پھر نئے سر سے نیا رختِ سفر باندھا
خوشی میں ہر قدم پر آفتاب آنکھیں بچھاتا ہے

ہزاروں خواہشیں انگڑائیاں لیتی ہیں سینے میں
جہانِ آرزو کا ذرہ ذرہ گیت گاتا ہے

امیدیں ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں مسکراتی ہیں
زمانہ جنبشِ مژگاں سے افسانے سناتا ہے

مسرت کے جوں ملاح کشتی لے کے نکلے ہیں
غموں کے ناخداؤں کا سفینہ ڈگمگاتا ہے

خوشی مجھ کو بھی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں
مسرت کے اس آئینے میں غم بھی جھلملاتا ہے

ہمارے دور محکومی کی مدت بڑھتی جاتی ہے
غلامی کے زمانے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے

یہی انداز گر باقی ہیں اپنی ست گامی کے
نہ جانے اور کتنے سال آئیں گے غلامی کے

آتشیں ستارہ

(ہندستانی طلبا کے نام جن کے سرخ رنگ کے جھنڈے پر ایک چمکتے ہوئے
ستارے کے نیچے لکھا ہے۔ ''آزادی۔ امن۔ اتحاد۔'')

دوشیزہ ایک آئی نظر رہگزار میں
گویا اُگی ہوئی تھی شفق کے غبار میں
نورِ سحر سے لوحِ جبیں تھی دھلی ہوئی
چہرے کی آب و تاب میں شبنم گھلی ہوئی
پارہ بدن میں برق کی لہریں نگاہ میں
اک ''آتشیں ستارہ'' تھا زلفِ سیاہ میں
پوچھا یہ میں نے ''آئی ہے تو کس جہان سے؟
کس طرح پھول توڑ لیا آسمان سے؟
یوں مسکرائی وہ کہ کرن سی بکھر گئی
اک موجِ نور تھی کہ افق سے گزر گئی

کہنے لگی کہ دخترِ ہندوستاں ہوں میں
خود کارواں نہیں، جرس کارواں ہوں میں
بالوں میں آسماں کا ستارہ نہیں ہے یہ
سورج کے جلتے دل کا شرارہ نہیں ہے یہ
اس کی جبیں پہ نقش ہیں عزم ثبات کے
ابھرا ہے یہ حسین افق سے حیات کے
اس کی چمک نہیں ہے خوشی کا شگون ہے
اس کی رگوں میں صرف جوانی کا خون ہے
سینے میں سرخ آگ دبی ہے شباب کی
شعلے میں روح کے ہے تڑپ انقلاب کی
یہ اتحادِ قوم و وطن کا رسول ہے
آزادی، امن اور ترقی کا پھول ہے"

جنگ اور انقلاب

رقص کر اے روحِ آزادی کہ رقصاں ہے حیات
گھومتی ہے وقت کے محور پہ ساری کائنات
زندگی مینا و ساغر سے ابل جانے کو ہے
کامرانی کے نئے سانچے میں ڈھل جانے کو ہے
اڑ رہا ہے ظلم و استبداد کے چہرے سے رنگ
چھٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے سے زنگ
ہے فضاؤں میں نویدِ شادمانی کا سرور
پڑ رہا ہے عشرتِ فردا کی پیشانی پہ نور
موت ہنس کر دیکھتی ہے آئینہ تلوار میں
زر پرستی کا سفینہ آ گیا منجدھار میں
خون کی بو سے مشامِ زندگی مخمور ہے
گولیوں کی سنسناہٹ سے فضا معمور ہے
یہ ہے وہ زنجیر خود ہاتھوں سے ڈھالا تھا جسے
یہ ہے وہ بجلی کہ خود خرمن نے پالا تھا جسے

تیر جو چٹکی میں تھا پیوست اب بازو میں ہے
آستیں میں تھا جو خنجر آج وہ پہلو میں ہے
آ گیا ہے وقت وہ جو آ کے ٹلتا ہی نہیں
اپنا لنگر آج اپنے سے سنبھلتا ہی نہیں
ہل چکا ہے تخت شاہی، گر چلا ہے سر سے تاج
ہر قدم پر ڈگمگایا جا رہا ہے سامراج
ڈھل رہی ہے زرگری کی رات کے تاروں کی چھاؤں
مفلسی پھیلا رہی ہے وقت کی چادر میں پاؤں
انقلابِ دہر کا چڑھتا ہوا پارہ ہے جنگ
وقت کی رفتار کا مڑتا ہوا دھارا ہے جنگ
ہم سے خودداروں کا اس دم گیت گانا خوب ہے
سر پھرے باغی جوانوں کا ترانا خوب ہے
غم کے سینے میں خوشی کی آگ بھرنے دو ہمیں
خوں بھرے پرچم کے نیچے رقص کرنے دو ہمیں
رقص کے پہیئے کی گردش رک نہیں سکتی کبھی
عمر کی نبضوں کی جنبش رک نہیں سکتی کبھی
روحِ آزادی کو سینے میں جکڑ سکتا ہے کون
ناچتے سورج کی کرنوں کو پکڑ سکتا ہے کون

ستمبر 1949

سامراجی لڑائی

مے خانے کی رسم و راہ بدلی — ساقی کی حسیں نگاہ بدلی
بدلے ارض و سماں کے تیور — ہیں شعلہ فشاں فضا میں خنجر
طیارے ہیں پرفشاں ہوا میں — بمبار گرجتے ہیں فضا میں
توپوں سے دہل رہی ہے دنیا — اک آگ میں جل رہی ہے دنیا
شائستگی حسن کھو رہی ہے — تہذیب آنکھ رو رہی ہے
بندوقوں کے شور سے ہیں پھیکے — طاؤس ورباب کے بھی نغمے
بارود کی بو میں غرق یکسر — پھولوں کی شمیم روح پرور
فرصت نہیں جام اور سبو کی — قیمت نہیں موج رنگ و بو کی
ویران ہیں ساری رقص گاہیں — چوروں سے بھری ہوئی ہیں راہیں
بے رنگ حیات زندگانی — بے کیف شباب ہے جوانی
میدا ہے جنگ ہے جدل ہے — سرمائے کے پیڑ کا یہ پھل ہے
شرمندہ ہیں دیکھ کر یہ لشکر! — چنگیز و ہلاکو وسکندر
دنیا ہے کہ تاجروں کی بستی — مہنگی ہے حیات موت سستی
جان بیچ کے لڑتے ہیں سپاہی — انسان پہ آ گئی تباہی

یہ ظلم وستم کا راج کب تک
یہ تخت شہی یہ تاج کب تک

1940

ایک خط

(جیل سے ایک دوست کے پہلے خط کا جواب)

یہ ترا چھوٹا سا خط تیری محبت کا پیام
کر رہا ہے دل سے سرگوشی نگاہوں سے کلام
اس کی خاموشی میں ہے تیرے تکلم کی نمود
توڑ ڈالا اس نے آ کر قید خانے کا سکوت
آرزوئیں ناچ اٹھی ہیں دلِ بیتاب میں
کتنی قندیلیں ہیں روشن وقت کی محراب میں
جھلملاتے ہیں پرانی زندگی کے ماہ و سال
مسکراتی ہے تمنا رقص کرتا ہے خیال

آج روحِ شادمانی کس قدر مخمور ہے
آج دل احساسِ ناکامی سے کوسوں دور ہے

جنوری 1941

موت

(جیل میں ایک دوست کے مرنے کی خبر سن کر)

اک شرر کی طرح گزرا عمر کی منزل سے تو
ہم نشیں کیا بات تھی کیوں اٹھ گیا محفل سے تو؟
ہم سنوں کی انجمن کس واسطے بھائی نہیں
راس کیوں آب و ہوائے زندگی آئی نہیں
دل کی جمعیت ترے جانے سے برہم ہوگئی
دم کے دم میں بزمِ عشرت بزمِ ماتم ہوگئی
تو نے سازِ دل پہ نغمے شوق کے گائے نہ تھے
مر گیا تو اور ابھی مرنے کے دن آئے نہ تھے
بجلیوں کی طرح لہرا کر فضا میں کھو گیا
ایک ہلکی سی جھلک دکھلا کے غائب ہو گیا
جس قدر سیماب پا تھا اس قدر پیارا تھا تو
قطرۂ شبنم تھا تو یا صبح کا تارا تھا تو
مسکرایا تھا مگر آنسو بہانے کے لئے
تو وہ تارا تھا جو چمکا ٹوٹ جانے کے لئے

اے انیسِ برقِ فطرت اے رفیقِ تیز گام
مڑ کے لیتا جا اسیرانِ محبت کا سلام
میرے طاقِ دل میں اک رنگین گلدستہ ہے تو
بچپنے کی سیکڑوں یادوں سے وابستہ ہے تو
زندگی کا مکتبہ دل میں سبق لیتے تھے ہم
ناؤ طفلی کی ،جوانی کی طرف کھیتے تھے ہم
چاہے جب مکتب سے اٹھ کر بھاگ آنا یاد ہے
پھر خوشی میں ہنستے ہنستے لوٹ جانا یاد ہے
آپ لڑتے آپ ہی جھگڑا چکا لیتے تھے ہم
اس طرح اپنی محبت آزما لیتے تھے ہم
تھی کسی کو بھی نہ ہم دونوں میں فکر روزگار
آہ ہم دونوں ہی تھے دلدادۂ سیر و شکار
تیز دوڑاتے ہوئے گھوڑوں کو اتراتے تھے کیا
باغ وصحرا کی ہوا کھا کھا کے لہراتے تھے کیا
زندگی بے فکریوں کی راگنی گاتی رہی
باغِ طفلی میں جوانی کی ہوا آتی رہی
ہائے وہ خلدِ علی گڈھ کی پرانی صحبتیں
کھو گئیں ماضی کے ویرانے میں کتنی جنتیں

قید کی تنہائیوں میں یاد آتی ہے تری
بجلیاں سی کوند جاتی ہیں نگاہوں میں مری
دل دعائیں دے رہا ہے جیل کی دیوار کو
رہ گئیں آنکھیں ترس کر آخری دیدار کو

یوں تو ہے بزم جہاں میں موت قانونِ حیات
ہے تغیر ہی سے روح زندگانی کو ثبات
موت ہی سے زندگی کا رقص دنیا کا وجود
موت کیا ہے ایک تغیرِ عناصر کی نمود
یہ وہ کہنہ مے ہے جو ہستی کے پیمانے میں ہے
موت عکس افگن جہاں کے آئینہ خانے میں ہے
موت کا غم کر کے کوئی شخص جی سکتا نہیں
موت سے گھبرا کے کوئی زہر پی سکتا نہیں
دل مگر ٹکڑے ترے ناوقت مر جانے سے ہے
غم یہ نو آراستہ زلفیں بکھر جانے سے ہے

''پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے''

اپریل 1941

رہائی

اس نظارے کے تصور ہی سے ہے دل پاش پاش
اک پھٹے کمبل کے ٹکڑے پر ہے اک قیدی کی لاش
کھنچ کے آیا دل سے پتھرائی ہوئی آنکھوں میں درد
اینٹھتے ہونٹوں پہ جم کے رہ گئی اک آہ سرد
نزع کے عالم میں یوں رگڑیں زمیں پر ایڑیاں
گر گئیں کٹ کر غلامی کی پرانی بیڑیاں
چھٹ گئی قید حوادث سے وہ جان بے قرار
موت نے سینے پہ اپنے لے لیا دھرتی کا بار

تھا غلام آباد میں تجھ کو نہ جینے کا دماغ
نصف شب آئی نہ تھی اور بجھ گیا تیرا چراغ
زندگی کی مٹ گئی دھندلی سی اک تصویر آج
ڈھونڈتی ہے تجھ کو اک ٹوٹی ہوئی زنجیر آج
گھر پہ تڑپاتا ہے سب کو تیرا دردِ انتظار
رو رہی ہے جیل اس پر چھن گیا منہ سے شکار
کوئی تجھ سے جبر یہ اب کام لے سکتا نہیں
کوئی رو کھے بین سے اب آواز دے سکتا نہیں

زندگانی تھی تری بے منتِ مینا و جام
عمر کی راہوں میں بے آواز پا تیرا خرام
تیری جانب اٹھ نہ سکتی تھی زمانے کی نظر
تو تھا اک آنسو کا قطرہ وقت کے رخسار پر
گو ترا دل شوق کی لذت سے بیگانہ نہ تھا
تو جہاں میں شہرت وعزت کا دیوانہ نہ تھا
کام تھا تجھ کو اگر کوئی تو اپنے کام سے
کوئی بھی واقف نہ تھا دنیا میں تیرے نام سے
تیرے رخ پر تربیت کی آئینہ کاری نہ تھی
تیرے لب پر علم کی سنجیدہ گفتاری نہ تھی
تو تھا دنیا کے سمندر میں وہ موج بے خروش
جس کے بل بوتے پہ اتراتا ہے طوفانوں کا جوش
تیری محنت پر ہمیشہ دوسروں کی تھی نگاہ
تیرا خرمن تھا ہزاروں بجلیوں کی رزم گاہ
سر سے لے کر پاؤں تک اک حسرتِ ناکام تھا
تیرے آئینے میں عکسِ گردشِ ایام تھا

تو نے آخر ختم کر دی داستانِ زندگی
تنگ ہے محکوم قوموں پر جہانِ زندگی
مر کے بھی گو زندگی کی طرح تو مجبور ہے
لیکن انگریزی حکومت کی حدوں سے دور ہے

بنارس سنٹرل جیل
1941

انقلابِ روس

(سرخ انقلاب کی 27ویں سالگرہ کے موقع پر)

رخِ حیات کو بخشیں تجلیاں تو نے
بکھیر دی ہیں فضاؤں میں سُرخیاں تو نے
جلائی عزم کی مشعل عمل کی راہوں میں
دیا ہے منزلِ مقصود کا نشاں تو نے
شگاف ڈال دیا تاجِ شہریاری میں
گرائیں ظلم کے خرمن پہ بجلیاں تو نے
فریبِ زار بھی توڑا فسونِ قیصر بھی
اجاڑ دی ہیں لٹیروں کی بستیاں تو نے
جو خونِ خلق کے دریا میں ناؤ کھیتے تھے
اتارے ان کے سفینوں کے بادباں تو نے
دکھائی جس نے غلاموں کو راہِ آزادی
دیا زمانے کو وہ میرِ کارواں تو نے
جہانِ پیر کی طرحِ کہن بدل ڈالی
مٹائے فرقہ و طبقات کے نشاں تو نے

عنانِ وقت ہے محنت کشوں کے ہاتھوں میں
یہ راز وہ ہے جسے کر دیا عیاں تو نے
بجھے بجھے سے پڑے تھے جو رہگذاروں میں
بنا دیا انھیں ذرّوں کو کہکشاں تو نے
جہالتوں کا اندھیرا تھا جن کے ذہنوں پر
دکھائیں علم کی ان کو تجلیاں تو نے
کبھی جو سوت کے کپڑوں کو بھی ترستے تھے
عطا کیا ہے انھیں رختِ پرنیاں تو نے
نکالی سخت چٹانوں سے جوئے آبِ رواں
بنائے ریگ کے دامن میں بوستاں تو نے
دئے ہیں رنگ سمرقند کی بہاروں کو
سجائے پھر سے بخارا کے گلستاں تو نے
بلا کا جوش ہے تیرے سبو کی مستی میں
شرابِ سرخ میں حل کی ہیں بجلیاں تو نے
جہاں میں دھوم ہے جمہور کے ترانوں کی
کچھ ایسے شوق سے چھیڑا ہے سازِ جاں تو نے
مٹا سکیں نہ تجھے سازشیں حریفوں کی
دکھائیں تیغ کے جوہر کی خوبیاں تو نے
گلوں نے خونِ شہیداں سے کی حنا بندی
پلٹ کے باغ میں آنے نہ دی خزاں تو نے
تری بہار گلستاں بدوش ہے اب بھی
عروسِ لالہ و گل سرخ پوش ہے اب بھی

تاجکستان کا ایک گیت

اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا
راہ میں تیرے لئے سنگِ گراں ہیں لاکھوں
تاجکستان کے پیڑوں کی گھنی چھاؤں میں
نیزہ و خنجر و شمشیر و سناں ہیں لاکھوں

اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا
بیلیں انگوروں کی زنجیر لئے بیٹھی ہیں
مرد شمشیر بہ کف تیری پذیرائی کو
عورتیں جذبۂ تحقیر لئے بیٹھی ہیں

اے امیر اب نہ بدخشاں کی طرف رخ کرنا
کوہساروں کی بلندی کو جلال آئے گا
سنگریزوں کے کلیجے سے دھواں اٹھے گا
اور دریاؤں کے سینے میں ابال آئے گا

(ترجمہ)

تعمیرِ نو

انقلاب روس نے مشرق میں چھیڑا ہے رباب
ایشیاء کی روح میں ہے زندگی کا اضطراب
زندہ باد اے انقلاب
رسم پرویزی گئی، آئین چنگیزی گیا
اب ہمیشہ کے لئے دستور خوں ریزی گیا
زندہ باد اے انقلاب
عارضِ لعل بدخشاں پر ہے کیسی آب وتاب
سرخ رو خونِ شہیدانِ وطن سے ہے گلاب
زندہ باد اے انقلاب
پھر سے نکھرا ہے سمرقند و بخارا کا جمال
اس افق پر ماہ کامل بن کے چمکا ہے ہلال
زندہ باد اے انقلاب
ذرہ ذرہ سوزِ آزادی سے دے اٹھا ہے لو
کارخانے گا رہے ہیں نغمۂ تعمیرِ نو
زندہ باد اے انقلاب
جھومتی ہے کشت زاروں پر بہار لازوال
ریگ زاروں میں بچھا ہے نقرئی نہروں کا جال

زندہ باد اے انقلاب

کیوں نہ ہو کشت و چمن آسودہ خرمن باغ باغ
خانۂ دہقاں میں روشن ہیں فراغت کے چراغ

زندہ باد اے انقلاب

اہل محنت کا نہالِ آرزو ہے بارور
آدمی کے دستِ قدرت میں ہیں فطرت کے ثمر

زندہ باد اے انقلاب

اپنی دولت لے کے حاضر ہو رہے ہیں کوہسار
برق کی جوئے رواں برسا رہے ہیں آبشار

زندہ باد اے انقلاب

بزمِ گیتی کے ہیں خادم عرشِ اعظم کے سفیر
دامِ حکمت میں شعاعِ مہرِ تاباں ہے اسیر

زندہ باد اے انقلاب

سمٹی جاتی ہیں فضائیں کانپتا ہے آفتاب
مائلِ پرواز ہیں فولاد و آہن کے عقاب

زندہ باد اے انقلاب

عزمِ انسانی عناصر سے ہے سرگرمِ جہاد
دخترِ دہقاں کے ہاتھوں میں ہے سازِ برق و باد

زندہ باد اے انقلاب

آدمِ خاکی کا ہنگامِ نمود آ ہی گیا
اس زمیں پر آسماں بہرِ سجود آ ہی گیا

زندہ باد اے انقلاب

لینن

دوستوں کے لئے الفت کی زباں ہے لینن
دشمنوں کے لئے شمشیر و سناں ہے لینن
رگِ مزدور میں خوں بن کے رواں ہے لینن
دل پہ سرمائے کے اک سنگ گراں ہے لینن
کشتِ دہقاں کے لئے بادِ بہاری کا پیام
شہر یاری کے لئے برقِ تپاں ہے لینن
سرخ فوجوں کے تجمل میں جھلک ہے اس کی
نوجوانوں کے ارادوں میں جواں ہے لینن
جس نے ہر قوم کو ہر ملک کو سیراب کیا
سرخ میخانے کا وہ پیرِ مغاں ہے لینن
جس کی ہر بات ہے تفسیر حیاتِ ابدی
جس کو ہر شخص نے سمجھا وہ زباں ہے لینن
جس پہ شاہد ہے سمرقند و بخارا کا شکوہ
وہ ہنر مند وہ معمارِ جہاں ہے لینن
ظلمت آباد غلامی کے بیابانوں میں
مشعلِ راہِ یقیں سنگِ نشاں ہے لینن
ہٹلریت کے نشاں جس سے جھکے جاتے ہیں
حریت کا وہ سر افراز نشاں ہے لینن

آخری خط

(جوایک سرخ سپاہی نے اپنی بیوی کولکھا تھا)

اے پرستانِ محبت کی پری
اے فروغِ شمعِ بزمِ دلبری
اے سمرقند و بخارا کی بہار
اے مری تنہائیوں کی غم گسار
تیرے شوہر کا سلامِ آخری
ہے محبت کا پیامِ آخری
ملک پر اپنے فدا ہوتا ہوں میں
اب ہمیشہ کو جدا ہوتا ہوں میں
گو مرے مرنے سے تو ہے درد مند
اپنی ہم جنسوں میں ہو گی سربلند
خوش ہے استالین میرے کام پر
حرف آئے گا نہ تیرے نام پر
تیرا شوہر موت سے ڈرتا نہیں
پاؤں پر دشمن کے سر دھرتا نہیں

دشمنوں سے برسر پیکار ہوں
لذتِ کردار سے سرشار ہوں
سیل حملے کا کبھی تھمتا نہیں
تیغ پر میری لہو جمتا نہیں
ایک لمحے کو نہیں رکتی ہے جنگ
رچ گیا ہے خون کا آنکھوں میں رنگ
زلزلوں کی زد میں ہے ہستی پول
بج رہے ہیں کان کے پردوں پہ ڈھول
ڈگمگاتے ہیں پہاڑوں کے قدم
سر پہ اولوں کی طرح گرتے ہیں بم
بحر کے سینے میں پیدا جوش ہے
ساحلِ دریا بھی آہن پوش ہے
دور جنگی کے سفینوں کی قطار
جیسے بہہ کر آ گئے ہوں کوہسار
الاماں پرہول بمباروں کی آگ
اف وہ ہیبت ناک طیاروں کی آگ
الاماں لاشوں پہ لاشے الاماں
موت کے بجتے ہیں تاشے الاماں
پشتِ گیتی پر ہے انگاروں کی ڈھال
ہے ہوا کے دوش پر شعلوں کا جال
شہر سارا آگ کا خرمن ہے آج
ذرہ ذرہ شعلہ پیراہن ہے آج
سرخ ہے شعلوں سے روئے آفتاب
سرخ ہے شعلوں سے دامانِ سحاب

سرخ شعلوں سے سحر ہے سرخ شام
سرخ ہیں شعلوں سے بام و در تمام
سرخ شعلے کھا رہے ہیں پیچ و تاب
تپ رہی ہے ان میں روحِ انقلاب

الغرض ہم بے خطر لڑتے رہے
روز و شب شام و سحر لڑتے رہے
جنگ کا سیلاب چڑھتا ہی گیا
دشمنوں کا زور بڑھتا ہی گیا
ایسے طوفاں میں ابھرنا ہے محال
اب یہاں پر جنگ کرنا ہے محال
بند کر دیں وار یہ ممکن نہیں
ڈال دیں ہتھیار یہ ممکن نہیں
چھوڑ کر یہ مورچہ ہٹ جائیں گے
ہٹ کے پیچھے سورما ڈٹ جائیں گے
ان کی پس قدمی پہ ہم ہوں گے نثار
اپنے جسموں سے بنائیں گے حصار
ہم ہیں کیسے سورما دکھلائیں گے
مرتے مرتے اک سبق دے جائیں گے
ہم جئیں گے بھی تو اپنی آن سے
ہم مریں گے بھی تو اپنی شان سے
زندگی کے راز سے واقف ہیں ہم
موت کے انداز سے واقف ہیں ہم
غول دشمن کا جب آئے گا یہاں
خاک کے سینے سے اٹھے گا دھواں

بام باقی اور نہ در رہ جائے گا
شہر کے بدلے کھنڈر رہ جائے گا
شہر لینن کے سپوتوں کے لئے
اور کھنڈر فاشسٹ بھوتو ں کے لئے

نور ہے آئینۂ ایام میں
زندگی کی مے ہے میرے جام میں
دل میں ہے سوز و گدازِ آرزو
ہے رگ و پے میں جوانی کا لہو
عالمِ ہستی کا دلدادہ ہوں میں
پھر یہ کیوں مرنے پہ آمادہ ہوں میں
زندگی میں رنگ بھرنے کے لئے
موت کو تسخیر کرنے کے لئے
موت کی جانب بڑھا جاتا ہوں میں
موت کے منہ میں چلا جاتا ہوں میں
کام جب آئے گا لاکھوں کا شباب
سرخ تارہ تب بنے گا آفتاب
جان جائے آبرو جانے نہ پائے
جیتے جی دشمن یہاں آنے نہ پائے
معرکے کا زور گھٹ سکتا نہیں
یہ قدم اب جم کے ہٹ سکتا نہیں

گو نہیں ہے مجھ کو مرنے کا ملال
دل میں رہ رہ کر یہ آتا ہے خیال
ہے جوانی کا چمن بے رنگ بو

بے ثمر ہے میرا نخلِ آرزو
باغ کے آغوش میں گُل چاہئے
زندگانی میں تسلسل چاہئے
ہو اگر دل کو تسلسل کا یقیں
موت بن جاتی ہے جامِ انگبیں
سر سے ڈھل جاتی ہے مایوسی کی دھوپ
موت بھر لیتی ہے پیدائش کا روپ

ہاں یہ سچ ہے تو مجھے کرتی ہے پیار
تیرا پیمانِ وفا ہے استوار
عمر بھر اب تجھ کو یاد آؤں گا میں
تیرے دل میں درد بن جاؤں گا میں
ہو گی غم انگیز رعنائی تری
تیری ہمدم ہو گی تنہائی تری
لیکن اے تسکین جانِ بیقرار
عمر بھر یوں ہی نہ رہنا سوگوار
تو ہے جن اچھائیوں کی مایہ دار
دوسروں پر بھی تو ہوں وہ آشکار
گر نہ ہو سطحِ زمیں پر جلوہ تاب
بے حقیقت ہے طلوعِ آفتاب
شمعِ محفل سے اگر مستور ہے
فائدہ پھر کیا جو اس میں نور ہے
ساز سے پیدا نہ ہوں نغمے اگر
جنبشِ مضراب ہے نا کارگر

اس لئے تنہا نہ رہنا چاہئے
تیرا دل سونا نہ رہنا چاہئے
گر بخارا میں ہو کوئی نوجوان
جو سمجھتا ہو ترے غم کی زبان
ہو جو واقف تیرے دل کے درد سے
جو جھجکتا ہو نہ آہ سرد سے
سوگ تیرا ہو نہ جس کے دل پہ بار
جس کو کر سکتی ہو تو تھوڑا سا پیار
عشق میں اپنے سمو لینا اسے
ہار میں اپنے پرو لینا اسے
اس ہوا سے گر کوئی غنچہ کھلے
یاد کرنا ۔ اس کو میرے نام سے
میرے گلشن کا ثمر کہنا اسے
ہاں مرا نورِ نظر کہنا اسے
اور جب دشمن کو مل جائے شکست
اس کے سارے حوصلے ہو جائیں پست
مجھ سے ملنے کے لئے آنا یہاں
پھول لالے کے چڑھا جانا یہاں

جانتا ہوں وہ گھڑی بھی آئے گی
دشمنوں کی نبض جب چھٹ جائے گی
بحر اسود سے اٹھے گی فوج فوج
سرخ طوفاں کی ظفر انجام موج
دامنِ ساحل بھگویا جائے گا
دشمنوں کے خوں سے دھویا جائے گا

سرخ فوجیں لوٹ کر آئیں گی پھر
سرخ پرچم بن کے لہرائیں گی پھر
شہر یہ دلشاد ہو گا ایک دن
یہ کھنڈر آباد ہو گا ایک دن
پھر نسیمِ جانفزا اٹھلائے گی
لالہ و گل پر بہار آ جائے گی
مسکرائے گی تبسم کی کلی
گونج اٹھے گی قہقہوں کی راگنی

ریگِ ساحل پرنیاں ہو جائے گی
یہ زمیں پھر آسماں ہو جائے گی

1944

جبر

نیلگوں آسماں، سبز زمین
شب کے بستر پہ سوئے جاتے ہیں
شام کے نرم قرمزی سائے
اس اندھیرے میں کھوئے جاتے ہیں

ایک بے گھر کسان دوشیزہ
کھوئی کھوئی ہوئی اداس اداس
چیتھڑوں میں بدن چھپائے ہوئے
چپ کھڑی ہے سڑک کے موڑ کے پاس

سوچتی ہے کہ میں کدھر جاؤں
اے خدا جلد رات کٹ جائے
گر پڑے کاش آسماں سر پر
ہو سکے تو زمین پھٹ جائے

ایک بدرنگ جیپ آ کے رکی
سانپ کی طرح ایک ہاتھ بڑھا
اور پھر گرد کے پھریروں نے
اس کی بے چارگی کو ڈھانپ لیا

اب بھی اس راستے میں راتوں کو
زخمی چیخیں سنائی دیتی ہیں
تیرگی کے سیاہ دامن پر
خوں کی بوندیں دکھائی دیتی ہیں

اپنے بیٹوں کی بے حیائی پر
مائیں ہندوستاں کی روتی ہیں
بیٹیوں کے لہو کے دھبّوں کو
خون کے آنسوؤں سے دھوتی ہیں

عظمت انساں

(مئی 1945ء میں فتح برلن کے موقع پر لکھی گئی۔)

دل غلامی میں سکوں کا لطف پاتا ہی نہیں
کوئی غنچہ آرزو کا مسکراتا ہی نہیں
ہے کچھ ایسا درد پہلو میں کہ جاتا ہی نہیں
اب خوشی کا سانس سینے میں سماتا ہی نہیں
کیا کشش ہے فتح برلن کے سنہرے راگ میں
غم کا خرمن جل رہا ہے اس خوشی کی آگ میں

سرخ پرچم کی ہوا سے شوق لہرانے لگا
دست استالن میں ٹوٹا ساز بھی گانے لگا
ذرّہ آغوش ہوا میں جا کے اترانے لگا
پست ہمت ولولوں کو بھی جلال آنے لگا
ڈوبتی کشتی کو. بھی آخر کنارا مل گیا
ظلم کے مارے ہوئے دل کو سہارا مل گیا

پار لگ جائے گی اب مظلوم انسانوں کی ناؤ
حریت کی سمت ہے دنیا کے دھارے کا بہاؤ

وقت کی نازک ترازو میں ہے جمہوری جھکاؤ
پڑ رہا ہے آج کے مقیاس پر کل کا دباؤ
شمع جو لینن نے روشن کی تھی بزمِ روس میں
جل رہی ہے ارتقا کے احمریں فانوس میں

موت کے مسکن پہ جھپٹے زندگی کے پاسبان
شب کے سینے میں ورائے صبحِ نو کے ترجمان
گر گئی کٹ کر شہیدوں کے گلے سے ریسمان
لے کے انگڑائی اٹھی مرقد میں روحِ تھالمان
گلشن ویمر میں گلہائے طرب کھلنے لگے
سینہ چاکانِ چمن اٹھ کر گلے ملنے لگے

سرخ توپوں سے شرر نکلے، ستارے بن گئے
بم کے گولے آسماں پر ماہ پارے بن گئے
جب غبار اٹھا تو کچھ رنگیں غبارے بن گئے
نعرے شیروں کے موسیقی کے دھارے بن گئے
بربریت کے دل وحشی کو دہلاتے ہوئے
آ گئے علم و ہنر کے پھول برساتے ہوئے

ختم آخر ہو گیا فاشزم کا پر حول خواب
چونک اٹھی نیند سے پیرس کی ارضِ انقلاب
رومتہ الکبریٰ پہ چمکا حریت کا آفتاب
آج ہے یونان کے ہاتھوں میں ہومر کا رباب
روس کے محنت کشوں نے کام پورا کر دیا
فتح کے پھولوں سے اک دنیا کا دامن بھر دیا

اب نہ آئیں گے بھری محفل میں زہر آلود جام
صبح کے زرّیں سر پہ اب نہ منڈلائے گی شام
اب نہ دھوکا کھائیں گے سرمایہ داری کا عوام
تیرگی اب اٹھ کے جا سکتی نہیں بالائے بام
کوئی اب اڑتے شرارے کو دبا سکتا نہیں
کوئی بادل سرخ تارے کو چھپا سکتا نہیں

جاگ اٹھے کوہ و صحرا ناچ اٹھے آبشار
ہو گئے بیدار شام و نجد وایران و تتار
چین کا خونیں افق بھی بن گیا ہے لالہ زار
کیوں نہیں ہے ہند کے اجڑے گلستاں میں بہار؟
سازشیں کرتے ہیں گل چیں سر سے سر جوڑے ہوئے
باغباں بیٹھے ہیں اک مدت سے منہ موڑے ہوئے

مژدہ اے جوشِ ہمت تہنیت اے ذوقِ جنگ
اور بھی اونچی ہو اے بیتاب سینے کی امنگ
موجۂ راوی ہے ہم آہنگ ہوائے موجِ گنگ
ہو گیا ہے عرصۂ ہستی ملوکیت پہ تنگ
اب نہیں ہے کوئی گہرا رنگ اس تصویر میں
چند کڑیاں رہ گئی ہیں ظلم کی زنجیر میں

اٹھ گیا ہٹلر کے ساتھ اہلِ ضرر کا اقتدار
آج سے چنگیزیت کا نخل ہے بے برگ و بار
ہو گیا ہے سرد شعلہ، بجھتے جاتے ہیں شرار
ہند کی گردن پہ ہے شاہی کا "دستِ رعشہ دار"

ایک ہی ہلکے سے جھٹکے میں کلائی موڑ دے
اے مجاہد سامراجی انگلیوں کو توڑ دے

مٹ چکی ہے اسکی طاقت اڑ چکے ہیں اس کے ہوش
ہو چکا ہے بند اس منحوس سینے کا خروش
اب سمندر میں نہ لہریں ہیں، نہ طوفاں ہے، نہ جوش
اب ابد تک اس کے ہنگاموں کی دنیا ہے خموش
دور خاص آخر ہوا اب دورِ عام آنے کو ہے
جس سے سب سیراب ہو جائیں وہ جام آنے کو ہے

اے زمیں، اے آسماں، اے آفتاب، اے ماہتاب
اے جلال عصر حاضر، اے ہوائے انقلاب
اے مقدس وید، اے انجیل، اے ام الکتاب
آج پورا ہو رہا ہے عظمتِ انساں کا خواب
اک نئی جنت میں اب آدم کو گھر مل جائے گا
سیکڑوں صدیوں کی محنت کا ثمر مل جائے گا

شاعر

لے کے آیا ہوں زمانے کے لئے پیغامِ گل
میں ہوں خوشبوئے چمن ، پیغمبرِ فصلِ بہار

میں غلامی کے اندھیرے میں ہوں آزادی کا نور
میں حق و باطل کی پیکاروں میں تیغِ آب دار

کذب کی تاریک راتوں میں صداقت کا ظہور
وقت کے سادہ افق پر رنگِ صبحِ زرنگار

موت کی پرہول وادی میں ہوں طوفانِ حیات
غم کے سینے پر مسرت کا سنہرا آبشار

یوں میری آغوش میں سمٹی ہوئی ہے زندگی
جس طرح قوسِ قزح میں سات رنگوں کا نکھار

میں انیسِ شامِ ہجراں ، میں ندیمِ صبحِ وصل
میں شریکِ بزمِ عشرت ، میں رفیقِ کارزار

ہم نشین لالہ و گل، ہمنوائے عندلیب
ہم رکابِ رنگ نکہت ہم دم باد بہار

میں ہوں صدیوں کا تفکر، میں ہوں قرنوں کا خیال
میں ہوں ہم آغوش ازل سے، میں ابد سے ہم کنار

میرے نغمے قید ماہ و سال سے آزاد ہیں!
میرے ہاتھوں میں ہے لافانی تمنا کا ستار

گاہ تبلیغ محبت، گاہ کی تبلیغ حسن
بے حسوں کے دل کو بخشا سوز شام انتظار

نقش مایوسی میں بھر دیتا ہوں امیدوں کا رنگ
میں عطا کرتا ہوں شاخ آرزو کو برگ و بار

چن لئے ہیں باغ انسانی سے ارمانوں کے پھول
جو مہکتے ہی رہیں گے، میں نے گوندھے ہیں وہ ہار

عارضی جلووں کو دی ہے تابش حسن دوام
میری نظروں سے ہے روشن آدمی کی رہگذار

گوالیار

(ایک گیارہ برس کے بچے کے نام جس نے پہلی گولی اپنے سینے پر کھائی)

یہ دیسی حکمراں جو نسلِ انسانی سے خارج ہیں
وہ کہتے ہیں جنھیں انگریز آقاؤں نے پالا ہے
بھیانک انکی روحیں ہیں تو مردہ ہے خمیران کا
سفیدان کی رگوں کا خون ہے دل ان کا کالا ہے
کروڑوں مفلسوں کا خون جلتا ہے چراغوں میں
جواں منحوس رجواڑوں کے محلوں کا اجالا ہے
یہ سب بے آسرا مظلوم بیواؤں کے آنسو ہیں
چمکتے موتیوں کی ان کی گردن میں جو مالا ہے
یہ بچوں کے دلوں کی سسکیاں ماؤں کی چیخیں ہیں
انھوں نے جن کوساز ورنگ کے سانچے میں ڈھالا ہے
برہنہ ہو گئی ہوں گی نہ جانے عصمتیں کتنی
کہ ان کی رانیوں کے سر پہ کشمیری دوشالہ ہے
خدا معلوم کتنے پیٹ بھو کے رہ گئے ہوں گے
کہ ان کے خوں بھرے جبڑوں میں سونے کا نوالہ ہے
یہ سب برطانیہ کے تاج شاہی کے نگینے ہیں
ہر اک ان میں سے بھارت ورش کے سینے کا چھالا ہے

جو ہو ویران اس بستی میں الو شور کرتے ہیں
غلام آباد ہندستاں میں ان کا بول بالا ہے
یہ کشتی بچ نہیں سکتی ہے آخر ڈوب جائے گی
شکستہ ناؤ کو منجدھار میں کس نے سنبھالا ہے

بغاوت کے جنوں کا تند دریا چڑھتا جاتا ہے
لہو بہتا ہے جتنا، اتنا طوفاں بڑھتا جاتا ہے
یہ کس نے بڑھ کے گولی روک لی معصوم سینے پر
یہ کس کے دل کا ٹکڑا کس کی آنکھوں کا ستارا ہے
یہ کیسی عورتیں ہیں جن سے سنگینیں جھجکتی ہیں
انھیں میدان میں جوشِ شجاعت نے پکارا ہے
یہ مزدوروں کی طوفاں خیز موجوں کا طلاطم ہے
بہالے جائے گا جو ظلم و نخوت کو، وہ دھارا ہے
ڈھلے ہیں ان کے بازو کارخانوں میں بغاوت کے
تپا کر زندگی کی آگ نے ان کو نکھارا ہے
وہ کچلا جا نہیں سکتا تشدد کے ہتھوڑوں سے
ہمارے جوشِ آزادی نے جو جذبہ ابھارا ہے
ابھی ہندوستاں میں اور انگارے دہکتے ہیں
گو اب تک میں جو بھڑکا ہے وہ پہلا شرارہ ہے

غلامی کی اندھیری رات میں شعلہ لپکتا ہے
شہیدوں کا لہو رنگِ شفق بن کر جھلکتا ہے

(جنوری 1946)

ملّاحوں کی بغاوت

بمبئی تیرے شہیدانِ محبت پر سلام
مر کے جو دے گئے ہم سب کو بغاوت کا پیام

دیکھنا ہند کی تقدیر بدل جائے گی
سر بکف اترے ہیں میدانِ سیاست میں عوام

زخم کھائے ہوئے سینوں میں ہیں خورشید نہاں
خون آلودہ جبینیں ہیں کہ ہیں ماہِ تمام

آج تلوار کی محراب ہے محرابِ حرم
آج کے روز ہے سجدے سے کہیں بڑھ کے پیام

آج سے کوچہ و بازار میں مرنا ہے روا
ظلم کی چھاؤں میں چپ بیٹھ کے جینا ہے حرام

جاگ اے روحِ عمل، جوشِ حمیّت بیدار
رہبرِ قوم بناتا ہے فرنگی کو امام

کوہساروں کی چٹانوں سے کہو ہٹ جائیں
تم سے رکنے کا نہیں موجۂ دریا کا خرام

مردِ آزاد کو ہے جامِ شہادت کی تلاش
اور غلاموں کے مقدر میں فقط مرگِ دوام

خوف سے خود تو دبک جاتے ہیں ہنگامِ جہاد
اور دیتے ہیں شہیدانِ وطن کو الزام

یہ سپوتوں کو بتاتے ہیں ذلیل اور اوباش!
ڈالدو بڑھ کے کوئی ان کے دہانوں میں لگام

ہم نشیں ان سے نہ رکھ کوئی عمل کی امید
کھا گیا روح کو رہبر کی غلامی کا جذام

اب وہ سنتے نہیں مجروح وطن کی فریاد
منتظر بیٹھے ہیں آئے گا بکنگھم سے پیام

کر رہے ہیں وہ فرنگی سے طلب آزادی
موت سے مانگتے ہیں بادۂ جاں بخش کا جام

کل تلک راگ بغاوت کے الاپے لیکن
اب وہ دن رات جپا کرتے ہیں انگریز کا نام

صرف بکھرے ہوئے دانوں پہ نظر ہے ان کی
اور پوشیدہ نگاہوں سے ہے صیّاد کا دام

جنگ میں قوم کے سرداروں سے بن آئے گا کیا
تیغ کے بدلے لئے پھرتے ہیں ہاتھوں میں نیام

جن میں لڑنے کی سکت ہے نہ ہے مرنے کی امنگ
وہ یہ کہتے ہیں کہ کافی ہے فقط زورِ کلام

رہبرِ قوم کی ناکارہ سیاست کے طفیل
آج بھی ہم ہیں فرنگی کی حکومت کے غلام

مل کے چہرے پہ اٹھو خون شہیدانِ وطن
توڑ دو بڑھ کے شہنشاہ پرستی کا نظام

فروری1946

گردِ کارواں

(قومی حکمرانوں کے نام!)

یہ مانا آج سرافراز مثلِ آسماں تم ہو
یہ مانا حریت کی منزلوں کے رازداں تم ہو
یہ مانا فخرِ عالم، نازشِ ہندوستاں تم ہو
مگر گذرے ہوئے عہدِ طرب کی داستاں تم ہو

تمھیں نے ہند کے دریاؤں سے طوفاں اٹھایا تھا
تمھیں نے راگ آزادی کا ہم سب کو سکھایا تھا
تمھیں نے ساز چھیڑا تھا، تمھیں نے گیت گایا تھا
بھری محفل میں لیکن آج اپنے نوحہ خواں تم ہو

تمھیں میدان میں انگڑائی پر انگڑائی آئی تھی
تمہارے حوصلوں پر خود شجاعت مسکرائی تھی
تمھیں نے اپنے خوں سے شمعِ آزادی جلائی تھی
مگر اب شمعِ آزادی کے سینے کا دھواں تم ہو

تمھیں آگے بڑھے تھے زندگی کا جام لینے کو
تمھیں اٹھے تھے سوزِ عشق کا پیغام دینے کو
تمھیں نکلے تھے کل جمہوریت کی ناؤ کھینے کو
اسی جمہوریت سے آج لیکن بدگماں تم ہو

کسانوں سے پریشاں ہو تو مزدوروں سے نالاں ہو
بغاوت سے ہو خائف اشتراکیت سے لرزاں ہو
عدو کو چھوڑ کر اپنوں ہی سے دست و گریباں ہو
خفا ہو دوستوں سے دشمنوں پر مہرباں تم ہو

جنھوں نے اپنے سکے چور بازاروں میں ڈھالے تھے
جنھوں نے اپنی ماں بہنوں کے سینے چیر ڈالے تھے
ابھی کل تک جنھیں تم خود ہی سولی دینے والے تھے
یہ کیا ہے آج ان سرمایہ داروں کی زباں تم ہو

جھلس کر رہ گئے تہذیب انسانی کے باغ اس میں
چمن بن کر کھلے ہیں سینۂ مفلس کے داغ اس میں
جلے ہیں کتنی بیواؤں کے اشکوں سے چراغ اس میں
نکل کر جیل سے جس انجمن میں میہماں تم ہو

برا لگتا ہے سازِ زندگی کا زیر و بم تم کو
نظر آتا ہے سیدھا آج ہر ٹیڑھا قدم تم کو
ڈسے لیتے ہیں قومی راستوں کے پیچ و خم تم کو
جرس کل تک تھے لیکن آج گردِ کارواں تم ہو

نہ تم ٹوٹے ہوئے دل جوڑ سکتے ہو محبت سے
نہ تم شاہی کا جادو توڑ سکتے ہو سیاست سے
نہ تم طوفان کا رخ موڑ سکتے ہو فراست سے
نہ جانے کس لئے آخر امیرِ کارواں تم ہو

خود پرستی

میں نے پوچھا رات اک ٹوٹے ہوئے تارے سے یہ
''اے سراپا روشنی اے بزم انجم کے سفیر
مٹ گئی کیوں آسماں سے ایک ہی لمحے کے بعد
تو نے کھینچی تھی جو اک ہلکی سی سونے کی لکیر''
وہ ستارہ بجھتے بجھتے مجھ سے اتنا کہہ گیا
''خود پرستی کے غلط جذبے کی بیداری تھی وہ
جس کو سمجھا تو نے اک ہلکی سی سونے کی لکیر
میری آوارہ تمنّا کی فسوں کاری تھی وہ''

چلمنیں اٹھتی ہیں مشرق کی حریمِ ناز سے
منتظر تھیں جس کی آنکھیں جلوہ گر ہونے کو ہے
خونِ شب سے گل بداماں ہے شفق زارِ وجود
آسماں پر نور سا پھیلا سحر ہونے کو ہے
کتنے آنسو بہہ چکے ہیں زندگی کی آنکھ سے
آج ان اشکوں کا ہر قطرہ گہر ہونے کو ہے
ارتقا ہے اسکا جادہ، اس کی منزل انقلاب
کاروانِ شوق سرگرمِ سفر ہونے کو ہے
گلشنِ ہندوستاں میں لوٹ آئی ہے بہار
آرزو کی شاخِ نازک بارور ہونے کو ہے
کھل گیا در، پڑ گیا دیوارِ زنداں میں شگاف
اب قفس میں جنبشِ صد بال و پر ہونے کو ہے
جس کا چہرہ تھا غریبوں کے لہو سے تابناک
وہ نظامِ کہنہ اب زیر و زبر ہونے کو ہے
خواب کے آغوش سے بیداریاں پیدا ہوئیں
زندگی کی راکھ سے چنگاریاں پیدا ہوئیں

قطعات

1

آزمائش ہے تری جرأت رندانہ کی
آب ہے موجِ مئے ناب میں تلواروں کی
چشمِ ساقی میں ہے اب ہوش و خرد کا پیغام
آج پرسش نہیں بہکے ہوئے میخانوں کی

2

جنت و کوثر و افرشتہ و حور و جبریل
مانتا ہوں تری تخئیل کی رعنائی کو
لیکن اک عمر سے اجڑی ہوئی دنیا کی زمیں
ڈھونڈتی ہے ترے ذوقِ چمن آرائی کو

3

چشمِ بینا میں ستاروں کی حقیقت کیا ہے
عالمِ خاک کا جو ذرہ ہے مہ پارہ ہے
آسمانوں میں بھٹکتی ہوئی روحوں سے کہو
یہ زمیں خود بھی چمکتا ہوا سیارہ ہے

(ماخوذ از گورکی)

4

تو حقیقت کو سمجھتا ہے طلسمی تصویر
تیرے نزدیک یہ احساس کی رعنائی ہے
تو یہ کہتا ہے "مرے دل میں ہے ہیجانِ بہار"
میں یہ کہتا ہوں "گلستاں میں بہار آئی ہے"

5

موت کو جانتے ہیں اصلِ حیاتِ ابدی
زندگی کو مگر خوار و زبوں کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو زمانے کو تصور کا فسوں کہتے ہیں

6

ان کو ملتا ہی نہیں ہے دُرِ مقصود کہیں
جو صدف ہے وہی خالی نظر آتا ہے انھیں
حلقۂ زلف ہو یا سرمۂ چشمِ خوباں
حلقۂ دامِ خیالی نظر آتا ہے انھیں

7

یہ حکومت کے پجاری ہیں یہ دولت کے غلام
جو جہنم کی مصیبت سے ڈراتے ہیں مجھے
خود تو دنیا میں بنا لیتے ہیں جنت اپنی
خواب کھوئی ہوئی جنت کے دکھاتے ہیں مجھے

8

ظلم اور جہل پر اصرار کروگے کب تک
عقل اور فہم سے پیکار کروگے کب تک
کب تلک عظمت افلاک کے گن گاؤ گے
عظمت ''خاک'' سے انکار کروگے کب تک

9

گر چہ ہے مشت غبار آدم و حوا کا وجود
ان کی رفعت پہ برستے ہیں ستاروں کے سجود
لالہ و گل تو فقط نقش قدم ہیں اس کے
اصل میں ''خاک'' کی معراج ہے انساں کی نمود

10

سالہا سال فضاؤں میں شرربار رہی
ایک پر سوز ہیولی میں گرفتار رہی
''خاک'' ہر چند کہ تھی پست وحقیر و نادار
اپنی فطرت سے مگر بر سر پیکار رہی

11

منتشر ہوگئی وسعت میں ستاروں کی طرح
تلملاتی رہی بیتاب شراروں کی طرح
''خاک'' صدیوں کی مگر جنبش پیہم کے طفیل
متحد ہوگئی گوندھے ہوئے ہاروں کی طرح

12

کہیں دریا کہیں وادی، کہیں کہسار بنی
کہیں شعلہ، کہیں شبنم ، کہیں گلزار بنی
''خاک'' اک شکل سے سو شکل میں تبدیل ہوئی
کہیں الماس، کہیں گوہر شہوار بنی

13

ذہن و جذبات و اشارات و کنایات بنی
صوت و الفاظ و حکایات و روایات بنی
''خاک'' جب صورت انساں میں نمودار ہوئی
زمزمے وید کے قرآن کی آیات بنی

14

چھلکی ساغر میں مے ناب و گوارہ بن کر
چمکی آنکھوں میں محبت کا ستارہ بن کر
"خاک" سے زیست بنی زیست سے احساسِ نشاط
اور پھر ناچ اٹھی حسنِ دل آرا بن کر

15

اک کرن ٹوٹ کے سو رنگ بکھر جاتے ہیں
بکھرے جلوے بصد انداز سنور جاتے ہیں
جاودانی ہے یہ دنیا کا تماشا جس میں
نقش مٹتے ہیں تو مٹتے ہی ابھر آتے ہیں

16

کوئی ہر کام پہ سو دام بچھا جاتا ہے
راستے میں کوئی دیوار اٹھا جاتا ہے
موت کی وادیٔ ظلمت میں علم کھولے ہوئے
کارواں زیست کا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

17

موت کی آگ میں تپ تپ کے نکھرتی ہے حیات
ڈوب کر جنگ کے دریا میں ابھرتی ہے حیات
زلف کی طرح بگڑتی ہے، سنورتی ہے حیات
وقت کے دوش بلوریں پہ بکھرتی ہے حیات

18

ابھی پوشیدہ ہیں نظروں سے خزانے کتنے
گوش انساں سے ہیں محروم ترانے کتنے
ختم ہو سکتا نہیں سلسلۂ عمر دراز
بطنِ تخلیق میں پنہاں ہیں زمانے کتنے

19

حسن ہی حسن ہے فطرت کے صنم خانے میں
نور ہی نور ہے اس "خاک" کے کاشانے میں
رات آتی ہے ستاروں کی ردا اوڑھے ہوئے
صبح ے بٹتی ہے خورشید کے پیمانے میں

20

کس قدر نور سحر دیکھ کے شرماتے ہیں
شب ہوئی ختم ستاروں کو حجاب آتا ہے
بام گردوں پہ ہے اب نیر اعظم کا جلوس
کوئی معشوق بر افگندہ نقاب آتا ہے

21

کبھی پہلو میں سمندر کے تڑپ اٹھتی ہیں
اور کبھی ریت کے سینے سے لپٹ جاتی ہیں
ان کو آتا نہیں آغوش محبت میں قرار
موجیں منہ چوم کے ساحل کا پلٹ جاتی ہیں

22

یک بیک کیوں چمک اٹھی ہیں نگاہیں تیری
اک کرن پھوٹ رہی ہے تری پیشانی سے
اور بھی تیز ہوئی جاتی ہے رخسار کی آگ
جذبۂ شوق و محبت کی فراوانی سے

23

رنگ پر رنگ نکھرتے ہی چلے آتے ہیں
روح ہوتی ہی نہیں سیر وہ نظارہ ہے
جسم محبوب ہے یا قامت رعنائے بہار
جیسے پھولوں کا ابلتا ہوا فوارہ ہے

24

زلفِ شب رنگ کی گھنگھور گھٹا سے چھن کر
پڑ رہی ہے کسی چہرے پہ تبسم کی پھوار
جیسے برسات کی راتوں میں چمکتے جگنو
یا شبِ ماہ کے ایوان میں بجتا ہے ستار

25

اپنے اڑتے ہوئے آنچل کو نہ رہ رہ کے سنبھال
حسن کے پرچمِ زرتار کو لہرانے دے
گر گیا پھول، مہکتے ہوئے جوڑے سے تو کیا
زلف کو تابہ کمر آ کے مچل جانے دے

26

تو نہیں ہے نہ سہی، تیری محبت کا خیال
ڈھونڈھ لیتا ہے تجھے حسن کی نظاروں میں
مسکراتا ہے دمِ صبح افق سے کوئی
رقص کرتا ہے کوئی رات کو سیاروں میں

27

جس طرح خواب کے ہلکے سے دھندلکے میں کوئی
چاند تاروں کی طرح نور سا برساتا ہے
ہاں یونہی میرے تصور کے گلستانوں میں
پھول کھل جاتے ہیں جب تیرا خیال آتا ہے

28

میں تو بھولا نہیں ، تم بھول گئی ہو مجھ کو
خیر گر تم بھی نہیں ہو میرے غم خواروں میں
تم نہ آؤ گی تو کیا اب نہیں آئے گی بہار؟
پھول کیا اب نہ کھلیں گے مرے گلزاروں میں؟

29

بجھ گیا تیری محبت کا شرارہ تو کیا
ڈوبتے دیکھے ہیں گردوں کے ستارے میں نے
سرد ہوتے ہوئے دل برف کی قاشوں کی طرح
منجمد ہوتے ہوئے دیکھے ہیں دھارے میں نے

30

شمع کی طرح پگھلتے ہوئے دل دیکھے ہیں
اشک بن بن کے نکلتے ہوئے دل دیکھے ہیں
تو نے دیکھی ہی نہیں گرمیٔ رخسارِ حیات
میں نے اس آگ میں جلتے ہوئے دل دیکھے ہیں

31

ان کے کیا رنگ تھے اب یاد نہیں ہے مجھ کو
کتنے آنچل مری تخئیل میں لہرائے ہیں
ہائے بھولے ہوئے چہروں کے دل آویز نقوش
جھلملاتے ہوئے اشکوں میں جھلک آتے ہیں

32

اپنے اعصاب کے مارے ہوئے بیچارے ادیب
یہ ترقی کے منادی ہیں تنزل کے نقیب
یہ ''عمود'' اور ''مثلث'' کے مظالم کے شکار
زندگی سے ہیں بہت دور فرائڈ سے قریب

33

جذبۂ شوق کی تکمیل نہیں ہو سکتی!
زندگی موت ہے احساسِ مسرت کے بغیر
فقط اعصاب کی تسکین ہے توہینِ حیات
صرف حیوان ہے انسان محبت کے بغیر

34

عشق اک جنسِ گراں مایہ ہے اک دولت ہے
یہ مگر عمر کا حاصل تو نہیں ہے اے دوست
منزلیں اور بھی ہیں، اس سے حسیں اس سے جمیل
''وصل'' کچھ آخری منزل تو نہیں ہے اے دوست

35

ماں کی آغوش میں ہنستا ہوا اک طفلِ جمیل
جس طرح ذہنِ ازل میں ہوا بد کی تخئیل
دیکھ لیں وہ جو سمجھتے ہیں کہ فانی ہے حیات
زندگانی کے طربناک تسلسل کی دلیل

36

تو نے خود تلخ بنا رکھی ہے دنیا اپنی
زندگی کتنی حسیں ہے تجھے معلوم نہیں
ہے جو گہری سی شکن، وقت کی پیشانی پر
تیری ہی چیں بہ جبیں ہے تجھے معلوم نہیں

37

سارے عالم میں یہ اڑتا ہوا گل رنگ نشاں
سچ بتا سرخیِ رخسارِ سحر ہے کہ نہیں
یہ تڑپتا ہوا شعلہ، یہ چمکتا تارا
جنتِ جلوۂ فردوس نظر ہے کہ نہیں

38

دیکھو تو تیرہ وتاریک فضا کا عالم
کس قدر درہم و برہم ہے ستاروں کا نظام
تو چمکتا ہے افق پر ابھی مانند ہلال
آسماں وقت کا ہے منتظرِ ماہِ تمام

39

حشر یہ ہٹلر و ٹوجو کا بتاتا ہے ہمیں
کہ زمانے میں پنپتا نہیں نفرت کا جنوں
اک نہ اک روز ابل آتا ہے سیلابِ حیات
خاک میں جذب نہیں ہوتا ہے مزدور کا خوں

40

نکہت و رنگ کا طوفان امنڈ آیا ہے
آگ سی لگ گئی یورپ کے سمن زاروں میں
اس طرف سے بھی گذر قافلۂ صبح بہار
ایک بھی پھول نہیں میرے چمن زاروں میں

41

زندگانی نے دیا ہے یہ مجھے حکم کہ تو
شب تاریک کے دامن میں ستارے بھر دے
پھونک دے جمع ہے جتنا خس و خاشاک نفاق
قلب انساں میں محبت کے شرارے بھر دے

42

میں نے اپنا ہی بھگویا ہے ابھی تو دامن!
تیرا دامن بھی تو اے دوست بھگونا ہے مجھے
داغ غم تو نے جو سینے میں چھپا رکھا ہے
اپنے اشکوں سے اسی داغ کو دھونا ہے مجھے

43

میری دنیا میں محبت نہیں کہتے ہیں اسے
یوں تو ہر سنگ کے سینے میں شرر ملتا ہے
سیکڑوں اشک جب آنکھوں سے برس جاتے ہیں
تب کہیں ایک محبت کا گہر ملتا ہے

44

گردِ نفرت سے بچا لیتا ہوں دامن اپنا
میں محبت کا پجاری ہوں مسرت کا ندیم
لالہ و گل کا کیا کرتی ہے گلشن میں طواف
پھر بھی کانٹوں سے الجھتا نہیں دامانِ نسیم

45

شیشۂ دل کو اگر ٹھیس کوئی لگتی ہے
آنسو بے ساختہ آنکھوں سے چھلک پڑتے ہیں
لیکن ایسے بھی ہیں کچھ اشک جو ہنگامِ نشاط
مسکراتی ہوئی پلکوں سے ٹپک پڑتے ہیں

26

آدمی لاکھ ہو مایوس مگر مثلِ نسیم
رقص کرتا ہے تمناؤں کے گلزاروں میں
راستے وادیٔ و صحرا میں بنا لیتے ہیں
چشمے رک کر نہیں رہ جاتے ہیں کہساروں میں

47

پھانس کی طرح ہر اک سانس کھٹکتی ہے مجھے
نغمے کیوں گھٹ کے رہے جاتے ہیں دل ہی دل میں
رازداں اپنے نظر آتے ہیں ہر سمت مگر
پھر بھی تنہائی کا احساس بھری محفل میں

48

گو مرے سر پہ سیہ رات کی پرچھائیں ہے
میرے ہاتھوں میں ہے سورج کا چھلکتا ہوا جام
میرے افکار میں ہے تلخی امروز مگر
میرے اشعار میں ہے عشرت فردا کا پیام

49

یہ تو ہیں چند ہی جلوے جو جھلک آئے ہیں
رنگ ہیں اور مرے دل کے گلستاں میں ابھی
میرے آغوش تخیل میں ہیں لاکھوں صبحیں
آفتاب اور بھی ہیں میرے گریباں میں ابھی

زندگی ہوتی ہے کیوں کر کامراں یہ بھی تو دیکھ
صرف اک مٹتی ہوئی دنیا کا نظارہ نہ کر
عالمِ تخلیق میں ہے اک جہاں یہ بھی تو دیکھ
موت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ ہی نہ سن
زندگی ہے تیزگام و نوجواں یہ بھی تو دیکھ
خاک پر پھیلے ہوئے دامِ غلامی پر نہ جا
حریت ہے کس قدر اوجِ آشیاں یہ بھی تو دیکھ
نبضِ گلشن بن کے چلتی ہے رگِ برگِ گلاب
خار وخس سے بن رہے ہیں گلستاں یہ بھی تو دیکھ
کشتیِ شب غرقِ دریائے شفق ہونے کو ہے
کھلنے والا ہے سحر کا بادباں یہ بھی تو دیکھ
ریزہ ریزہ ذرّہ ذرّہ خاکدانِ شرق کا
پرتوِ خورشید کا ہے رازداں یہ بھی تو دیکھ
آج ہے آباد کتنی شاہراہِ انقلاب
آرہے ہیں ہر طرف سے کارواں یہ بھی تو دیکھ
میں نے مانا مرحلے ہیں سخت راہیں ہیں دراز
مل گیا ہے اپنی منزل کا نشاں یہ بھی تو دیکھ
راستے کے پیچ وخم سے ہول آتا ہے مگر
آج ہے جمہور میرِ کارواں یہ بھی تو دیکھ

}{}{}{

غزل نما یہ نظم اس دور میں کہی گئی جب ہیئتی تجربے بھی ہورہے تھے۔ اس لیے اس کو یونہی رکھا گیا ہے (مرتب)۔

خواب

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے
اقبالؔ

1

میں کہ صدیوں کی سرگوشیاں سن چکا ہوں
کتنے سربستہ رازوں کو سینے کے اندر چھپائے ہوئے ہوں
کتنے پرہول المناک افسانوں کو اپنے دل میں دبائے ہوئے ہوں
کتنے ہی جشن، کتنی ہی عیدیں
میری یادوں کے دامن میں محفوظ ہیں
ظلم اور جبر کی خوں بھری داستانیں
بادشاہوں کی جنگی حکایات
دیو اور پریوں کے قصے کہانی
انقلاب اور بغاوت کے دلکش ترانے
میرے ہونٹوں پہ سوئے ہوئے ہیں
میں انھیں جب بھی چاہوں جگالوں

مجھ کو معلوم ہے بابل و نینوا کے کھنڈر
وہ فرات اور دجلے کی موجیں جنھیں لوریاں دے رہی ہیں
کس لئے آج ویران ہیں
ان میں اُن مطلق الحکم شاہوں کے ایوان تھے
جن کے ہونٹوں کی جنبش
موت کی ہم زباں تھی

ساحلِ نیل پر وہ ابوالہول سکتے کے عالم میں اب تک کھڑا ہے
مصر کے سر بلند آسماں بوس اہرام مبہوت ہیں
علم و تہذیب کی اس پرانی زمیں پر
سر پھرے اور مغرور فرعون چھائے ہوئے تھے
جو خدا بن کے انسان کو لوٹتے تھے

(ماخوذ از کارل سینڈ برگ)

اور وہ یونان کے قصر میں
روم کے اونچے اونچے ستون میں
وہ بھی اک داستاں کہہ رہے ہیں
ان کے سائے میں بردہ فروشی کے بازار تھے
جن میں انسان انسان کو بیچتا تھا

(ماخوذ از کارل سینڈ برگ)

وہ سمرقند کے سبز گنبد
اور بخارا کے ایوان ہیں
جن پہ خونخوار تاتاریوں کی اڑائی ہوئی گرد بیٹھی ہوئی تھی
اف یہ چنگیز و تیمور کی عیش گاہیں
ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندی ہوئی آدمیت کی مظلوم

چیخوں سے گونجی ہوئی تھیں

اور وہ بسٹیل کے قید خانے کی دیواریں ہیں
جن کی اینٹیں شرابی، زناکار، جاگیرداروں پہ جی کھول کر ہنس رہی ہیں
ان کے لوہے کے در پر کلیساؤں کے پادری پاسباں تھے
وہ امیروں کو جنت کے پروانے اور مفلسوں کو
صبر و شکر و سکون اور روحانیت کا سبق دے رہے تھے

اور وہ ماسکو کا کرملین ہے
جس کے ماتھے کا روشن ستارہ
سرخ کرنوں کی تنویر برسا رہا ہے
اس کے اندر ابھی کل تک
روس کے زار، کھیتوں کے اور کارخانوں کے مالک
روئی، فولاد، تیل اور بارود کے بین الاقوامی بیوپاری بیٹھے ہوئے جنگ کی سازشیں کر رہے تھے

میں کہ صدیوں کی سرگوشیاں سن چکا ہوں
آج دلی کی آواز بھی سن رہا ہوں
جس کے سینے پر ظالم فرنگی کے پٹھو بغل بچوں کی ڈگمگاتی حکومت کا ایک بوجھ رکھا ہوا ہے
آہ یہ میری اپنی ہی آواز ہے
میرے اہلِ وطن کے دلوں کی صدا ہے
جو ہمارے گلوں میں
ایک زخمی پرندے کے مانند
ڈیڑھ سو سال تک پھڑپھڑاتی رہی ہے

اب نہ وہ بابل ونینوا کے شہنشاہ ہیں
اور نہ وہ مصر کے سرپھرے اور مغرور فرعون ہیں
اور وہ روم و یونان کے بردہ فروش
اور نہ خونخوار چنگیز و تیمور
اب نہ بستیل کے پاسباں ہیں
اور نہ وہ روس کے زار ہیں
صرف ان کے مظالم کی اک خوں بھری داستاں رہ گئی ہے

آج خونخوار و خودسر فرنگی کا خونیں سفینہ بھی گرداب میں پھنس چکا ہے
اور ان کے غلام ان کے پٹھو
زخم کھائے درندوں کے مانند چلاّ رہے ہیں
ان کی آواز میں موت کا راگ ہے
ان کے سینے میں بجھتی ہوئی آگ ہے
اور جمہور کے کاروانوں کی گرد سفر ان کی عظمت کی لاشوں کو کفنا رہی ہے
اور وہ حادثہ جو ابھی پردۂ آسماں میں چھپا ہے
میرے ادراک کے آئینے میں نظر آرہا ہے

(2)

آج دلّی کی کھوئی ہوئی رفعتیں اس کو پھر مل گئی ہیں
اس کا مکھڑا خوشی سے دمکنے لگا ہے
جس کی تنویر سے ایشیا جگمگایا ہوا ہے

کتنے ہی تخت دیکھے ہیں اس نے

کتنے ہی تاج پہنے ہیں اس نے
اس کے سینے پہ کتنے ہی شاہوں کے نقش قدم ہیں
کتنی تہذیبیں، کتنے تمدن
اس کی آغوش میں سو رہے ہیں
کتنے ٹوٹے ہوئے آفتاب اور مہتاب
اس کے کھنڈروں میں بکھرے پڑے ہیں
کتنے ہی گیت، کتنے ہی نغمے
اس کی سانسوں میں الجھے ہوئے ہیں
اس کے ماتھے پہ سورج بھی چمکا
چاند بھی جگمگایا
غم کی گھنگھور کالی گھٹائیں بھی چھائیں
دکھ کی راتیں بھی بیتیں
سکھ کی صبحیں بھی آئیں
یہ مگر اک نئے عہد کی، اک نئی نسل کی منتظر تھی

میری دلّی
میری محبوب دلّی
غالبؔ و میرؔ کی سرزمین
اب تو غاصب شہنشاہوں کی داشتہ
اور خودکام جاگیرداروں کی لونڈی نہیں ہے
غیر ملکوں کے سرمایہ داروں کی منڈی نہیں ہے
تو ہماری امیدوں کا مرکز ہے، خوابوں کی تعبیر ہے
آرزوؤں کی تصویر ہے
تیرے چہرے پہ میں آج اک نور سا دیکھتا ہوں
جیسے تیری جبیں پر کروڑوں ستارے سمٹ آئے ہیں

یہ اشوک اور اکبر کے عہد حکومت کی تنویر ہرگز نہیں ہے
بلکہ جمہور کی مشعلوں کی ضیا ہے
دیکھ ہندوستاں کے کروڑوں سپوتوں کی نظریں
آج تیری طرف اٹھ رہی ہیں
یہ ہماری نگاہوں کی کرنیں ہیں جو تیرے رخسار پر نور کا جال سا بن رہی ہیں

روٹیوں کے لئے کتنے سوکھے ہوئے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں
کتنے ننگے بدن ایک کپڑے کی خاطر کھڑے ہیں
ان کو نفرت سے ان کو حقارت سے مت دیکھ
یہ فقیر اور بھکاری نہیں ہیں
تیرے ہندوستاں کے بہادر سپاہی ہیں جو
انقلاب اور بغاوت کی پگھلی ہوئی آگ میں جل چکے ہیں
ننگی تلواروں کی دھار پر چل چکے ہیں
یہ تری مملکت کے طرفدار ہیں
تیری قسمت کے معمار ہیں
تیری آزادی کے پاسباں ہیں
یہ انھیں کی رگوں کا لہو ہے
ان کے سینے کا خوں ہے
تیرے ماتھے پہ جو آج رنگ شفق
اور ہتھیلی پہ رنگ حنا بن گیا ہے

(3)

جاگ ہندوستان اپنے خواب گراں سے
دیکھ آزادی کی صبح کا نور پھیلا ہوا ہے

تیرے برسوں کے بچھڑے ہوئے لال گھر آرہے ہیں
یہ غلامی کی زنجیر کو توڑ آئے
قید خانوں کے در کھول آئے
اپنی آغوش میں ان کو بڑھ کر اٹھا لے
اپنے دل میں بٹھا لے
یہ ہمالہ ہے، یہ وندھیاچل ہے، یہ نیلگیری
یہ ترے کھیت ہیں، تیرے کھلیان ہیں
تیری کانیں ہیں یہ، باغ ہیں، یہ ترے کارخانے
یہ ترے سبز و شاداب میدان یہ ہنستی ہوئی وادیاں ہیں
یہ تری صاف و شفاف بہتی ہوئی ندیاں
تیری گودوں کی پالی ہوئی بیٹیاں ہیں
ان کو اپنے گلے سے لگا لے
اپنے پاکیزہ آنچل کے نیچے چھپا لے

دیکھ یہ اپنے خونیں کفن میں
تیرے لاکھوں شہیدوں کی روحیں کھڑی ہیں
جو تجھے تہنیت دے رہی ہیں
ان کی آنکھیں مسرّت کے اشکوں سے نمناک ہیں
لیکن ان کے گریباں ابھی چاک ہیں
ان کو اپنی محبت سے سی دے
پرچموں سے کہو کھل کے انگڑائیاں لیں
فوجیں اپنی شکستہ صفوں کو جمائیں
فتح اور کامرانی کے ڈنکے بجائیں
توپیں جمہوریت کی سلامی اتاریں
اور طیاروں کو حکم دو

آسمانوں پہ چھوڑیں
اپنے مضبوط فولاد سے تیشوں کو ذرا آزمائیں
چاند تاروں کو آکاش سے توڑ لائیں
کشتیاں اپنے لپٹے ہوئے بادباں کھول دیں
اور جہاز اپنے لنگر اٹھائیں
سینۂ بحر سے شاہی جھنڈے ہٹا کر
اپنے جمہوری اور اشتراکی پھریرے اڑائیں

ننھے گہواروں میں کھلکھلا کر ہنسیں
مائیں اشکوں میں بھیگے ہوئے آنچلوں کو سکھائیں
دیویاں مانگ میں اپنی سیندور بھریں
بیبیاں اپنے ماتھوں پہ افشاں اگائیں
ناچیں ناچیں اجنتا کی شہزادیاں
اور ایلورا کی پریاں
اپنی صدیوں کی خاموشی کو توڑ کر گیت گائیں

کیتکی اور چمپا کی کلیاں
اپنی خوشبو بکھیریں
اور ہمالہ کی جھیلوں میں ہنستے ہوئے سرخ دلکش کنول
اپنی نازک ہتھیلی پر رنگین شمعیں جلائیں
وادیاں مسکرائیں
کھیتیاں لہلہائیں
کوہسار اپنے سینوں کی دولت نکالیں
آبشار اپنی قوت دکھائیں
کانیں اپنے خزانوں کے در کھول دیں

اور ہندوستاں کے قدم پر
اپنے لعل و جواہر نچھاور کریں
آہنی کارخانوں سے کہہ دو
اپنے پہیوں کی رفتار کچھ تیز کر دیں
اور نغموں کے طوفاں اٹھائیں

(4)

آسماں پر چمکتے ہوئے صبح آزادی کے سرخ سورج
تو ہمیں دور سے کس لئے دیکھتا ہے؟
آ ہماری زمیں پر اتر آ

تیرے سینے میں وہ روشنی اور حرارت نہیں ہے
جو ہمارے دلوں میں
تیرے ماتھے پہ رنگ شفق ہے
اور ہماری جبیں پر ہمارے شہیدوں کا خوں ہے
روشنی تیری کرنوں کی سطح زمیں تک
اور ہماری نگاہوں سے دل کے کنول جل رہے ہیں
تو فقط صبح نو کا پیمبر ہے
ہم نئے عہد کے ترجمان ہیں

اپنے آکاش کے اونچے آسن پر بیٹھے ہوئے دیوتا
تو کروڑوں برس سے
اپنی ہی آگ میں جل رہا ہے
ایک ہی راہ پر صبح سے شام تک

شام سے صبح تک چل رہا ہے
آ ہماری زمیں پر اتر آ
ہم ترے دل کو انسان کی روح کا سوز دے دیں

اے ہزاروں برس کے تھکے ماندے بوڑھے مسافر
آ ہماری زمیں پر اتر آ
دو گھڑی ہند کے سبزہ زاروں میں آرام کر لے
اپنی جھولی کو پھولوں سے بھر لے
اور اپنے سفر پر چلا جا

فریب

15 راگست اور اس کے بعد

ناگہاں شور ہوا
لو شبِ تارِ غلامی کی سحر آپہونچی
انگلیاں جاگ اٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے
راہزن ہار گئے
راہرو جیت گئے

قافلے دور تھے منزل سے، بہت دور، مگر
خود فریبی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے
چن لیا راہ کے روڑوں کو حذف ریزوں کو
اور سمجھ بیٹھے کہ بس لعل و جواہر ہیں یہی
راہزن ہنسنے لگے چھپ کے کمیں گاہوں میں

ہمنشیں یہ تھا فرنگی کی فراست کا طلسم
رہبرِ قوم کی نا کردہ قیادت کا فریب
ہم نے آزردگئی شوق کو منزل جانا
اپنی ہی گردِ سرِ راہ کو محمل جانا
گردشِ حلقۂ گرداب کو ساحل جانا

اب جدھر دیکھو ادھر موت ہی منڈلاتی ہے
درو دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے
خواب زخمی ہیں، امنگوں کے کلیجے چھلنی
میرے دامن میں ہیں زخموں کے دہکتے ہوئے پھول
خون میں لتھڑے ہوئے پھول
میں جنہیں کوچہ و بازار سے چن لایا ہوں
قوم کے راہبرو، راہزنو
اپنے ایوانِ حکومت میں سجالو ان کو
اپنے گلدانِ سیاست میں لگالو ان کو

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موجِ پایاب کا ساحل ہے یہی
تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر
کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے
چند سکوں کی عوض چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموسِ شہیدانِ وطن بیچ دیا
باغباں بن کے اٹھے اور چمن بیچ دیا

2

کون آزاد ہوا؟
کس کے ماتھے سے سیاہی چھوٹی؟
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادر ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی

خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لئے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گذرنے کے لئے

چور بازاروں میں بدشکل چڑیلوں کی طرح
قیمتیں کالی دکانوں پہ کھڑی رہتی ہیں
ہر خریدار کی جیبوں کو کترنے کے لئے

کارخانوں پہ لگا رہتا ہے
سانس لیتی ہوئی لاشوں کا ہجوم
بیچ میں ان کے پھرا کرتی ہے بیکاری بھی
اپنا خونخوار دہن کھولے ہوئے

اور سونے کے چمکتے سکے
ڈنک اٹھائے ہوئے پھن پھیلائے
روح اور دل پہ چلا کرتے ہیں
ملک اور قوم کو دن رات ڈسا کرتے ہیں

روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمایہ کے دلّالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

بالیاں دھان کی گیہوں کے سنہرے خوشے
مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح
اجنبی دیس کے بازاروں میں بک جاتے ہیں
اور بد بخت کسانوں کی بلکتی ہوئی روح
اپنے افلاس میں منہہ ڈھانپ کے سو جاتی ہے

ہم کہاں جائیں، کہیں کس سے کہ نادار ہیں ہم
کس کو سمجھائیں، غلامی کے گنہگار ہیں ہم
طوق خود ہم نے پنہا رکھا ہے ارمانوں کو
اپنے سینے میں جکڑ رکھا ہے طوفانوں کو

اب بھی زندان غلامی سے نکل سکتے ہیں
اپنی تقدیر کو ہم آپ بدل سکتے ہیں

3

آج پھر ہوتی ہیں زخموں سے زبانیں پیدا
تیرہ و تار فضاؤں سے برستا ہے لہو
راہ کی گرد کے نیچے سے ابھرتے ہیں قدم

تارے آکاش پہ کمزور حبابوں کی طرح
شب کے سیلاب سیاہی میں بہے جاتے ہیں
پھوٹنے والی ہے مزدور کے ماتھے سے کرن
سرخ پرچم افق صبح پہ لہراتے ہیں

آنسوؤں کے چراغ

ہندستان کے شرنارتھیوں، اور پاکستان کے مہاجرین کے نام

1

میں سُن رہا ہوں
وہ سسکیاں جوزمیں کے سینے میں داغِ غم بن کے رہ گئی ہیں
وہ ہچکیاں جن کے سخت پھندے
رباب و بربط کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں
وہ آہیں جو ظالموں کے ڈر سے
دلوں میں محبوس ہو گئی ہیں
وہ چیخیں جو مادرِ وطن کی
جراحتوں کے ہجوم میں جا کے کھو گئی ہیں
وہ گیت جو نوحۂ وفغاں کے
سیاہ خانوں میں چھپ گئے ہیں
وہ نغمے جو فریب کاری کے سبز باغوں میں سو گئے ہیں
وہ سازشیں جن کا زہر کام و دہن کو بیکار کر چکا ہے
وہ عہد ے جن کا نکیلا نشتر رگوں کے اندر اتر چکا ہے
وہ عہد و پیماں

کہ جن کے حرفوں سے وقت و تاریخ کی جبیں پر
سیاہ دھبے پڑے ہوئے ہیں

(2)

یہ کون ظالم ہے جس نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
وطن کے سینے پہ خونِ ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
یہ کیا ہوا ایک دم سے محفل میں سارے سازوں کے راگ بدلے
قدامتوں کے کھنڈر میں ماضی کے بھوت دیوانہ وار ناچے
بہار کے سرخ آنچلوں سے خزاں کے بیمار رنگ برسے

سحر کی رنگین وادیوں میں سیہ بگولے مچل رہے ہیں
ہزاروں سورج نکل نکل کر گہن کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں
ہرے بھرے کھیت گرم شعلوں کے پیرہن میں دہک رہے ہیں
شگوفے لپٹے ہوئے دھویں کے سیہ کفن میں سلگ رہے ہیں
کٹے ہوئے ہاتھ اپنی بانہوں سے راہ روکے کھڑے ہوئے ہیں
پھٹے ہوئے آنچلوں کے ٹکڑوں میں عصمتوں کی جوان لاشیں
چھدی ہوئی دھرم اور مذہب کے خنجروں میں دلوں کی قاشیں
کٹی ہوئی چھاتیوں کی نس نس سے دودھ خوں بن کے برس رہا ہے

(3)

یہ رات ہے کس قدر بھیانک
یہ خواب ہے کس قدر پریشاں
ہزاروں سہمی ہوئی نگاہیں
بلکتی آنکھیں سسکتی پلکیں
اندھیری شب میں

کروڑوں اشکوں کے جھلملاتے چراغ لے کر
ہجوم میں قاتلوں کے انصاف کے فرشتے کو ڈھونڈتی ہیں

مگر میں یہ پوچھتا ہوں تم سے
شریف بہنو
غیور ماؤ
تمہاری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک کے بدلے
یہ آنسوؤں کا وفور کیوں ہے

میں جانتا ہوں
تمہارے سینے میں، دل میں، زخموں میں، کتنے آنسو بھرے ہوئے ہیں
تم ان کی بوندوں سے آسمان و زمیں کا دامن بھگو چکی ہو
تم اس طلاطم میں وندھیا اور ہمالیہ کو ڈبو چکی ہو
مگر یہ خونابہ بار آنکھوں کی بہتی گنگا
زمیں پہ پھیلے ہوئے لہو کے سیاہ دھبے نہ دھو سکے گی
یہ جھلملاتے ہوئے دیے ہیں
جو ظلم کے جھکڑوں مصیبت کی آندھیوں میں نہ جل سکیں گے
تم ان کی مدھم سی روشنی میں
حسین انصاف کے فرشتے کو کب تلک ڈھونڈھتی رہوگی
کہ وہ بھی اس مستقل وطن میں
تمہاری ہی طرح زخم خوردہ ہے اور آوارہ پھر رہا ہے

(4)

یہ کس سے فریاد کر رہی ہو
یہ کس کو آواز دے رہی ہو
تم اپنے زخموں کی راکھیاں لے کے کس کی محفل میں جا رہی ہو

تمہارے یہ راہبر نہیں ہیں
تمہارے یہ دادگر نہیں ہیں
یہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں جن کو
سیاسی پردوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے مداری
سفید ریشم کی ڈوریوں پر نچا رہے ہیں
یہ سامراجی بساط شطرنج کے پیادے ہیں جن کو شاطر
ہزار چالوں سے شاہ و فرزیں بنا بنا کر چلا رہے ہیں
یہی تو ہیں وہ جنھوں نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
وطن کے سینے پہ خون ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
انھیں نے محفل کے ساز بدلے
انھیں نے سازوں کے راگ بدلے
یہی تو ہیں جو تمہارے اشکوں سے اپنے موتی بنا رہے ہیں
تمہاری عصمت، تمہاری عزت، تمہاری غیرت چرا رہے ہیں

یہ قصر وہ ہے کہ جس کے دیوار و در میں صدیوں کی لانتیں بس کے رہ گئی ہیں
یہ تاج وہ ہے کہ جس کی ضو میں
وطن کے چہرے کا رنگ تحلیل ہو گیا ہے
یہ تخت وہ ہے کہ جس کے پائے
ہمارے دل میں گڑے ہوئے ہیں
یہ فرش وہ ہے جہاں فرنگی کے بھوت دن رات چل رہے ہیں
یہاں شہیدوں کا خوں چھلکتا ہے موج رنگ شراب بن کر
یہاں بلکتا ہے درد دل کا سرود چنگ و رباب بن کر
یہاں امیدوں کے پھول اور آرزو کے غنچے نہ کھل سکیں گے
یہاں تمہیں عدل اور انصاف کے فرشتے نہ مل سکیں گے

یہ ظالموں کا محل ہے، یہ قاتلوں کا مسکن ہے، یہ لٹیروں کی انجمن ہے

(5)

شریف بہنو، غیور ماؤ
تمہارے بھائی
تمہارے بیٹے
تمہاری فریاد سن رہے ہیں
ملوں سے، کھیتوں سے، کانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں
وہ دیکھو ان کے جوان سینوں میں عدل اور انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے
نگہ میں بجلی چمک رہی ہے
اندھیری شب سے پرے شفق کی سنہری مینا چھلک رہی ہے

وہ اپنے سینے کا سوز لائیں
میں اپنے نغموں کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے
کہ جس کے منحوس دامنوں میں
گناہ پروان چڑھ رہے ہیں

کشاکش

انقلابی صفوں میں اصلاح پسندی کے خلاف احتجاج

میں نے سرمایۂ افلاس کے ہنگامے میں!
سینۂ چاک سے اٹھتا ہوا دیکھا ہے دھواں
نعرۂ جنگ ہے، بیداد کی فریاد نہیں
نغمہ سنجانِ گلستاں کے کلیجے کی فغاں

سر پر تلوار ہے، شہ رگ پہ دھرا ہے نشتر
گیت اس ساز پہ وہ کون ہے جو گائے گا
اب تو ممکن نہیں اس تلخ حقیقت سے فرار
قوم کا نام ہے اور راج ہے سرمائے کا

کیسے سمجھاؤں بہاروں کا گلابی جوڑا
آج تک روحِ خزاں زیبِ بدن کر نہ سکی
تشنگی کھیتوں کی، شبنم سے بجھی ہے نہ بجھے
چاندنی زخموں میں کافور کبھی بھر نہ سکے

کیسے ممکن ہے کہ سورج کی شعاعوں کی پھوار
شب کے فوارۂ تاریک میں رقصاں ہو گی
خارزاروں کی رگ و پے سے کھلیں گے غنچے
ریگ زاروں میں جواں روح گلستاں ہو گی

ایٹمی بم سے نہ گیہوں کے پھلیں گے خوشے
ٹینک لائیں گے نہ کھلیان میں کھیتوں سے اناج
پھول برسیں گے تبسم کے نہ بمباروں سے
قتل و غارت سے بڑھے گا نہ محبت کا رواج

ہڈیاں جلتی ہیں اور خوں کے ابلتے ہیں کڑھاؤ
ایک آسیب ہے سرمایہ پرستی کا سماج
سر کٹی ہاتھ کٹی، پاؤں کٹی لاشوں سے
زندگی موت کے دربار کو دیتی ہے خراج

کارخانوں کے خداہوں گے زمیں کے مالک
جرم اور قتل پہ ہے ان کی حکومت کا مدار
یہ مجالس، یہ دفاتر، یہ عدالت گاہیں
ان میں انسان کا قانون سے ہوتا ہے شکار

آستیوں میں پروہت کے چھپے ہیں خنجر
بت تو معصوم ہیں، بیٹھے ہیں صنم خانوں میں
دھوم ساقی کی سخاوت کی بہت ہے لیکن
خون جمہور ہے، بٹتا ہے جو پیمانوں میں

بانجھ ہیں بانجھ غریبوں کی دعائیں جن کی
کوکھ سے امن کی دیوی تو نہ پیدا ہوگی
ہاں بدلتی ہے فقط جوشِ عمل سے تقدیر
حریت جنگ کے میداں میں ہویدا ہوگی

کاٹنا پڑتا ہے تلواروں کو تلواروں سے
اپنی طاقت کو ذرا اور بڑھانا ہوگا
ہے زمانے میں تشدد ہی تشدد کا جواب
جبر سے، ظلم کی ہستی کو مٹانا ہوگا

موجیں جب بڑھتی ہیں دریاؤں میں طوفان بدوش
اپنے ہر لوچ کو شمشیر بنا لیتی ہیں
جب اترتی ہیں فضاؤں سے زمیں پر کرنیں
سرخ نیزوں پہ اندھیرے کو اٹھا لیتی ہیں

غزل

سکوں میسّر جو ہو تو کیونکر، ہجوم رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگر چہ قاتل، نظامِ دار و رسن وہی ہے

فریب یہ دے دیا ہے کس نے کہ حریّت کی برات آئی
ترنگی چلمن اٹھا کے دیکھو تو ساحرِ مکر فن وہی ہے

ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نغمۂ قیصری چھپا ہے
نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے، نوائے سازِ کہن وہی ہے

ابھی تو دیوار و در پہ منڈلا رہے ہیں بیکاریوں کے سائے
ملوں کے اعصاب کا تشنج وہی رگوں کی تھکن وہی ہے

وہی ہے سرمایہ دار و مزدور کی کشاکش جو کل تلک تھی
لہو میں بھیگا ہوا زمانے کے جسم پر پیرہن وہی ہے

سماج کے رخ پہ ہے غریبوں کے خونِ ناحق کا گرم غازہ
ہیں جس میں پیچیدہ مار و کژدم یہ زلفِ عنبر شکن وہی ہے

لبوں پہ مہریں لگی ہوئی ہیں، زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
وہی ہیں آدابِ محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے

بجھا رہا ہے زمانہ پیاس اپنی علم و حکمت کے میکدوں سے
ہماری محفل میں وہمِ شیخ و جہالتِ برہمن وہی ہے

جنھیں ہم اپنا سمجھ رہے تھے وہ آج بیگانے ہو گئے ہیں
جو غیر کے ابروؤں پہ کل تھی جبیں پہ ان کے شکن وہی ہے

ابھی تو خاشاک کے لئے ہے ہزار طوفان کی ضرورت
اٹھی تھی جو پیچ و تاب کھاتی یہ موجِ گنگ و جمن وہی ہے

بلند محلوں کے بام و گنبد پہ جھوٹی کرنوں کو ناچنے دو
جو کالی کٹیاؤں کو اجالا عطا کرے گی کرن وہی ہے

تلنگانہ

تلنگانہ کے چالیس لاکھ کسانوں کے نام جو آج مسلح بغاوت کر رہے ہیں

1

تیز ہے وقت کی نبضوں میں لہو کی گردش
زلزلہ خیز ہے بپھرے ہوئے تاروں کا خرام
دھڑکنیں دل کی بجاتی ہیں دہل سینے میں
ہاتھ لہراتے ہیں سرمست پھریروں کی طرح

سیکڑوں سال کے لب بستہ دہن کھلتے ہیں
جوشِ گفتار میں پگھلے ہوئے لاوے کا ابال
کتنا بیباک ہے صدیوں کی خموشی کا خروش
آج فریاد میں تاثیر ہے للکاروں کی
آج ہر سانس میں جھنکار ہے تلواروں کی

تہلکہ رات کی سرحد پہ مچا رکھا ہے
لشکرِ صبح میں شب خون کی تیاری ہے
یہ ابلتے ہوئے نعرے ہیں کہ سیلاب عظیم

جو در و بام سے ایوانوں کے ٹکراتے ہیں
خس و خاشاک بہا جاتا ہے جاگیروں کا

آہنی قدموں کی آہٹ سے دہلتی ہے زمیں
ان کی رفتار کو دیتے ہیں بگولے بھی خراج
بجلیاں نقشِ قدم چوم کے رہ جاتی ہیں

2

یہ مجاہد، یہ بہادر، یہ جیالے، یہ کسان
برق و باراں کے حریف
جن کے چہروں پہ ہے دھرتی کا سکوں اور وقار
اور ہتھیلی میں لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
کیاریاں بوتے تھے اشکوں کی، لہو کاٹتے تھے
آج ہر کھیت میں ہر دشت میں ہر میداں میں
اپنے سینے سے چھڑکتے ہیں لہو کے قطرے
بجلیاں پھلتی ہیں، گل کھلتے ہیں، بم اگتے ہیں

بوڑھے ہونٹوں سے جوانوں کو دعا ملتی ہے
انگلیاں پیار سے بندوقوں کو سہلاتی ہیں
گھر میں ڈھالے ہوئے بم گولوں کی پیشانی کو
عورتیں پھولوں سے صندل سے سجا دیتی ہیں
مائیں بچوں سے یہ کہتی ہیں کہ اکرام کرو
دیوتا آئے ہیں پرنام کرو
رات دن گاؤں میں، کھیتوں میں، بیابانوں میں

دیوتاؤں کا نکلتا ہے جلوس
نوجواں ہنستے ہوئے گاتے ہوئے
موت سے لڑنے کو میداں میں چلے جاتے ہیں
اور بغاوت سے سلگتی ہوئی دوشیزائیں
صندلی ہاتھوں میں شربت کے کٹورے لے کر
اپنا دل اپنی نگاہوں میں اٹھالاتی ہیں

نیند آنکھوں کی چرا لیتے ہیں ہتھیاروں کے خواب

کھیتیاں خوش ہیں کہ اب ان کی بہاروں کی خزاں
چھد کے رہ جائے گی جمہور کی سنگینوں میں
راہیں رقصاں ہیں کہ ذرّوں کے دھڑکتے ہوئے دل
ظلم کی فوج کے قدموں سے نہ زخمی ہوں گے
پانی ہنستا ہے کہ اب اس کا چھلکتا ہوا خون
کھیت سینچے گا نہ بدکار زمینداروں کے
گنگناتی ہیں ہوائیں کہ کلیجے ان کے
دکھ بھری چیخوں کے نشتر سے نہ چھلنی ہوں گے
قہقہے ٹوٹے ہوئے سازوں کو کرتے ہیں درست
صبحیں خوش رنگ ہیں شاموں کی جبیں ہے روشن
رات کی گود میں جلتے ہیں بغاوت کے الاؤ
ڈالیاں کرتی ہیں تیار شگوفوں کا لباس
فتح کے جشن منانے کے لئے

لب بیٹوٹے ہوئے ٹھٹھرے ہوئے جکڑے ہوئے ہاتھ
بڑھ کے محلوں کو اٹھالیں گے کھلونوں کی طرح

خواب کے سامنے تعبیر کا آئینہ ہے

3

میں بہت دور سہی تجھ سے پرے ارضِ دکن
تیرے جذبات وخیالات سے نزدیک ہوں میں
مرے سینے میں ترے نقش قدم روشن ہیں
تیرے بچوں نے مری گود میں بوئے ہیں جو بیج
وہ مرے نغمہ واشعار میں پھل آئے ہیں

ان دنوں تیرا تصور ہی ہے ہمدم میرا

"خبریں" جب آتی ہیں کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے لاش
گود میں جنگ کے ٹوٹے ہوئے ہتھیار لئے
بھر کے چلّو میں شہیدوں کے لہو کی بوندیں
وہ مری روح کے چہرے پہ چھڑک دیتی ہیں
اور مرے سینے میں اک آگ سی لگ جاتی ہے
میرا ہر قطرۂ خوں مجھ سے یہ کرتا ہے سوال

بولو ہم جنگ کے میدان میں کب اتریں گے؟
اس بغاوت کی حسیں راہ سے کب گذریں گے؟

غزل

تری ادائیں ہیں ساحرانہ، نہ تیرے انداز دل ربانہ
تو ہی بتادے کہاں سے آئیں گے مجھ کو آدابِ عاشقانہ

حقیر ہوکر نہ رہ سکے گی تری بلندی سے میری پستی
میں اپنے سجدوں سے کیوں بساؤں تری رعونت کا آستانہ

مرے لئے ایک سے ہیں دونوں وہ کوئی صیاد ہو، کہ گل چیں
نظامِ گلشن میں شاخِ گل سے الگ نہیں شاخِ آشیانہ

فریب دے کر حیات نو کا حیات ہی چھین لی ہے ہم سے
ہم اس زمانے کا کیا کریں گے اگر یہی ہے نیا زمانہ

خلیق بھی ہے، شفیق بھی ہے، کسی کو کوئی گلا نہ ہوتا
بس اک شکایت یہ ہے کہ پیرِ مغاں کی فطرت ہے تاجرانہ

غزل

امتحاں بزم وطن میں ہے وفاداری کا
اہرمن تخت نشیں ہے اسے یزداں کہئے
کیجئے روح کو تیار غلامی کے لئے
شوق آزادیٔ انساں کو گریزاں کہئے
کسی بھوکے کو بھی بھوکا نہ سمجھئے ہرگز
کوئی عریاں نظر آئے تو نہ عریاں کہئے
یہ نہ کہئے کی حکومت ہے مصائب کا سبب
گردش چرخ کہن، گردش دوراں کہئے
کیجئے شاعری اس طرح کہ سمجھے نہ کوئی
ظلم اور جور کو بھی ناز حسیناں کہئے
کوئی بھی بات سمجھنے کی نہ زحمت کیجئے
قلب اور ذہن کو آئینۂ حیراں کہئے
کھینچ لیجئے رگِ الفاظ سے خونِ معنی
رقصِ بسمل کی جگہ رقصِ غزالاں کہئے
ہر درندے کو پنہا دیجئے انساں کا لباس
اور جی کھول کے انسان کو حیواں کہئے
رات دن کیجئے سرکار کی چوکھٹ کا طواف
اور اسے حاصلِ جاں حاصلِ ایماں کہئے
شب تاریک کو سینے سے لگا کر رکھئے
اور اسے چشمۂ خورشید درخشاں کہئے

دیجئے خاک وطن سے یہ محبت کا ثبوت
کہ خس و خار کو بھی رشکِ گلستاں کہئے
کیجئے کوچہ و بازار میں لاشوں کا شمار
اور پھر ہند کو فردوس بداماں کہئے
سیکھئے ساز پہ آہوں کے غزلخواں ہونا
جھلملاتے ہوئے اشکوں کو چراغاں کہئے
زہر کے جام کو نوشینہ سمجھ کر پیجئے
دل میں اترے ہوئے نشتر کو رگِ جاں کہئے
اپنے ہر زخم کو اک پھول تصور کیجئے
سرخیٔ خونِ عزیزاں کو بہاراں کہئے
چارہ گر جانئے اس دور میں ہر قاتل کو
زندگی موت کو، اور درد کو درماں کہئے
تن سے چھن جائے تو رہزن کو دعائیں دیجئے
چاک ہوجائے تو دامن کو گریباں کہئے
خاک پر سوئیے آکاش کے سائے کے تلے
بسترِ مخمل و کمخواب و شبستاں کہئے
دخترِ دشمنِ ناپاک کو دیجئے بوسہ
اور اسے قیمتِ ناموسِ شہیداں کہئے
مختصر یہ ہے کہ اب سانس بھی لینا ہے حرام
تا کجا قصۂ احوالِ پریشاں کہئے

لطف تو جب ہے کہ دل دار و رسن سے کھیلے
اور اس شغل کو بازیچۂ طفلاں کہئے

25/ستمبر 1948

سیلاب چین

انقلاب اب کہاں ہے
کون سی وادیوں میں
کون سی منزلوں میں
مرے شوق کا کارواں ہے؟
روس بھی سرخ رو اور یورپ کا مشرق بھی گلنار ہے
ہم بھی اس جانِ عصرِ رواں کے لئے
اپنی آنکھیں بچھائے ہوئے ہیں
اپنے زخموں کی پوشاک پہنے کھڑے ہیں
اپنے خوابوں کی شمعیں جلائے ہوئے ہیں
میں نے تاریک راتوں کے روشن ستاروں سے پوچھا
برق رفتار لمحوں کے اڑتے ہوئے شراروں سے پوچھا
انقلاب اب کہاں ہے؟
آفتاب اب کہاں ہے؟
''چین میں''
کوہساروں سے آواز آئی
مرغزاروں

گرجتے ہوئے آبشاروں

دہکتے ہوئے لالہ زاروں سے آواز آئی

"چین میں، چین میں"

وادیاں گونج اٹھیں

کوہ کی چوٹیاں گونج اٹھیں

ندیاں چین کا نام لے کر سمندر میں دوڑیں

چین کا نام لے کر سمندر سے گھٹائیں اٹھیں

شرق اور غرب میں

چین کا نام بارش کے قطروں کی صورت میں ٹپکا

پیاسی دھرتی نے اس نام سے اپنے لب تر کئے

اور کسانوں نے کھیتوں کو سینچا

کونپلیں نرم مٹی سے اس نام کو اپنے دل میں چھپا کر اگ آئیں

اور یہ نام سو پھول بن کر کھلا

شہد اور عطر اور رنگ بن کر زمانے میں پھیلا

ہواؤں میں لہرایا

شعلوں میں لپکا

اور اک آتشیں داستاں بن گیا

پاک اور صاف کاغذ نے اس نام کو اپنے دل پر لکھا

پرچموں نے اسے اپنی پیشانیوں پر سجایا

اور سازوں نے گایا

اب ہوا

چین کے نام کو گنگناتی ہے

اور اب فضا

چین کے نام پر مسکراتی ہے

اور نثر و عروض کے شاعروں کے لئے
چین سب سے بڑا آیت، سب سے حسین نظم ہے
چین ایک حوصلہ، اک امنگ اور اک عزم ہے
چین اک وحی ہے، ایک ایدیش ہے، ایک پیغام
ایشیا کے لئے ایک انعام ہے

چین کیا چیز ہے بیقراروں سے پوچھو
چین کیا چیز ہے غم کے ماروں سے پوچھو
چین بھوکوں کی روٹی ہے
ننگوں کا کپڑا ہے
بے گھر کا گھر ہے
چین مفلس کے زخموں کا مرہم
امیروں کا زخم جگر ہے
چین لاکھوں کروڑوں غلاموں کی آزادی
اور قیدیوں کی رہائی کا اعلان ہے
چین سرمایہ داری کی جلتی دھوپ میں
اک گھنے پیڑ کی چھاؤں ہے
چین چرچل، پٹیل اور نہرو، ٹرومین اور مارشل کے لئے
چیانگ اور چیانگ کی طرح کے ڈاکوؤں کی سیہ کاریوں کے لئے
زہر اور موت کا جام ہے
چین انسانیت کا نیا نام ہے
اس لئے میں
کہ انسانیت کا مغنی ہوں
اس آتشیں راگ سے
اپنے بربط کو شعلہ فشاں کر رہا ہوں

چین اے ہند کے ہم نشیں،
ماؤزے تنگ کی سرزمیں،
لوہوسن کے وطن
اپنے گمبھیر سنگیت کی ایک ہلکی سی لے
ایک مدھم سی تان
اپنے طوفان کی ایک دو بجلیاں
اپنے جوالامکھی کے خزانے کی دو چار چنگاریاں
میرے سینے میں بھر دے
اپنے شاعر کو سیراب کر دے
تاکہ میں تیری ہمت کی یہ داستاں اس طرح کہہ سکوں
جیسے بندوق کی باڑھ چلتی ہے
بارود جلتی ہے
جوالامکھی پھوٹتا ہے

2

چین اک ملک تھا
بادشاہوں، غلاموں، کنیزوں، کسانوں کا اک دیس تھا
جس کے میداں قحط اور وباؤں سے آباد تھے
جس کے دریاؤں میں زرد سیلاب بہتے تھے
اور نیلے آکاش پر
بادلوں کی طرح ٹڈیاں اڑ رہی تھیں

چین اک سن رسیدہ گنہگار تھا
جس کے پیروں میں زنجیر، گردن میں طوق گراں تھا

جس کے سینے میں دل کی جگہ اک بڑا زخم تھا
ایک ناسور تھا
اور رگوں میں لہو کی جگہ صرف آنسو بھرے تھے
چین اک داشتہ، اک کنیز، ایک دوشیزہ کا نام تھا
جو ہزاروں برس سے برہنہ
زمانے کے بازار میں بک رہی تھی
جس کے رخسار خوف اور دہشت کے دو تمتمائے ہوئے پھول تھے
اور آنکھوں کی یخ بستہ جھیلوں میں غم جم گیا تھا
جس کے ٹھٹھرے ہوئے پیر مسلی روایات کی پٹیوں میں بندھے تھے

چین ایک بوڑھی ماں تھی
چیانگ نے جس کو بدکار جاپانیوں کی ہوس اور زنا کے لئے دے دیا تھا

چین ایک لاش تھی
جس پر انگریز، امریکی اور دوسرے سامراجی
گدھوں کی طرح سالہا سال منڈلائے ہیں
بوٹیاں جس کے سرمایہ داروں میں تقسیم ہوتی رہی ہیں
چین ظالم زمیندار اور جنگجو ڈاکوؤں کا وطن تھا
اپنے کاغذ کے پھولوں
چائے کی پیالیوں
اور افیون کی گولیوں کے لئے
ساری دنیا میں مشہور تھا
رحم اور بھیک، صبر اور قناعت کا بے جان پیکر تھا جس سے
حکمراں، مذہبی پیشوا، سامراجی لٹیرے
جونک کی طرح لپٹے ہوئے تھے

کل تلک چین اک شمع بے نور تھا
نغمۂ بے صدا تھا
ایک بے رنگ تصویر، اک بے اثر بددعا تھا
اور اب چین اک کارخانہ ہے جس میں
بجلیاں بن رہی ہیں
اور بم ڈھل رہے ہیں
جس کے کھیتوں میں دل اگ رہے ہیں
جس کی شاخوں میں گیہوں کے خوشے لگے ہیں
دھان کی بالیاں پھل رہی ہیں

3

ماؤزے تنگ کی فوج کتنی حسیں فوج ہے
ارتقا اور انسانیت کے سمندر کی اک موج ہے
جو کومنتانگ کے ریگزاروں کو غرقاب کرنے کو بیتاب ہے

اس میں مزدور ہیں
اس میں دہقان ہیں
اس میں جتنے سپاہی ہیں سب صرف انسان ہیں
اس میں رستے ہوئے زخم ہیں
درد کی ٹیسیں
آہوں کی بپھری ہوئی آندھیاں
آنسوؤں کے امنڈتے ہوئے گرم طوفاں
ماؤں کی گائی ہوئی لوریاں
اور محبت کی سرگوشیاں

ننھے معصوم بچوں کی کلکاریاں
نوجوانی کے خواب
آرزوؤں کی تعبیریں
کھیتوں کی ہریالیاں
ندیوں کی روانی
لہکتے ہوئے سبز میدان کی وسعتیں
ریل کی پٹریاں
کارخانوں کے سرکش ہتھوڑے
مشینوں کے دل
اور کسانوں کے بھاری ہلوں کی چمکتی ہوئی تیز پھالیں
کدالوں کا فولاد
بندوق کی گولیاں
گوپھنیں، پھاوڑے، رسیاں، لاٹھیاں
چاولوں کی مہک، دھان کی بالیاں
اور لکڑی کے ٹوٹے کھلونے
اور اس فوج کے سامنے
چیانگ کے ٹینک بیکار
فاشزم کے سارے بمبار بیکار ہیں
یہ اندھیرے کے ڈیرے پہ دلکش اجالے کی یلغار ہے
نفرتوں سے محبت کی پیکار ہے
موت پر زندگانی کا اک آخری وار ہے
سرخ لشکر کے جرار دستوں کی یورش نہیں
بلکہ جنبش میں اب چین کی اونچی دیوار ہے
کس کی ہمت ہے جو اس کو ڈھائے
کس کی ہمت ہے جو اس کو پیچھے ہٹائے

اب یہ دیوار بڑھتی چلی جائے گی
ایک طوفان کی طرح چڑھتی چلی جائے گی

ماوزے تنگ کی فوج اک خوں کا سیلاب ہے
اس میں ملبار کا اور تلنگانے کا خون ہے
شعر کا اور افسانے کا خون ہے
اس میں کشمیر کا اور اہل نیر کا خون ہے
اس میں اسپین و یونان کا خون ہے
اس میں انسان کا خون ہے
جو بہایا گیا ہے
اور چوسا گیا ہے
جس سے سرمایہ داری کو جاگیرداری کو سینچا گیا ہے
کس کی ہمت ہے جو اس کی یورش کو روکے
کس کی ہمت ہے جو اسکو ٹوکے
اب یہ سیلاب بڑھتا چلا جائے گا
چین کی سرزمیں سے ملایا تلک
اور ملایا سے برما تلک
اور برما سے ہندوستان
اور ہندوستان سے فلسطین و یونان و اسپین تک
اب یہ طوفان چڑھتا چلا جائے گا
چین کے سرکشو، چین کے باغیو، مرحبا
اور آگے بڑھو، اور آگے بڑھو
وار پر وار کرتے چلو
دشت و کہسار کو اپنے دامن میں بھرتے چلو
موت اور خون کو فتح کرتے چلو

چین کی سرزمیں ایک قالین کی طرح قدموں کے نیچے بچھی ہے
شہر اور گاؤں شربت کے لبریز پیالے ہیں
جو وادیوں اور میدانوں کی
کشتیوں میں سجائے گئے ہیں
ایک اک کر کے ان کو اٹھا لو
اپنی صدیوں کی پیاس اب بجھا لو

ساتھیو آج تم جنگ اور امن کے آخری کھیل میں
امن کے پاسباں ہو
ساری دنیا کی نظریں تمھیں پر لگی ہیں

دور تم سے بہت دور بنگال کے ایک گمنام سے گاؤں میں
ایک ماں ہے
اس کے آنچل میں اک لال ہے
جو ہمک کر تمھیں دیکھتا ہے

اور پیرس کے باغات کے ایک حسیں کنج میں
دو دھڑکتے ہوئے دل تمہاری
فتح کے منتظر ہیں

اور افریقہ کے جنگلوں کی گھنی چھاؤں میں
اک حبشی حسینہ
اپنے محبوب کی یاد میں گا رہی ہے

اور اسپین میں

ایک دہقان زیتون کے باغ میں سو رہا ہے

اور جوہو پہ نیلے سمندر کی موجیں
اپنے چاندی کے پانی سے ساحل کا منہ دھو رہی ہیں

ساتھیو آج یہ سب تمہارے طرفدار ہیں
سب تمہارے مددگار ہیں
اب تمہارے لئے لڑ رہے ہیں
اور میں گا رہا ہوں
اور مرے ساتھ پبلو نرودا، چلی کا جواں سال شاعر ہے
پیرس کا آتش نفس آراگوں ہے
سویت یونین کا جواں اکھی مایا کاوسکی ہے
لورکا، والٹ وہٹ مین،
گورکی اور پشکن
دانتے اور ہومر
سب ہم آواز ہیں
رات کی آبنوسی ہتھیلی پہ تاروں کے روشن کنول ہیں
صبح کے ہاتھ میں سرخ سورج کا آئینہ ہے
شوخ پھولوں کے سینے میں شبنم کے موتی بھرے ہیں
اور تمہاری دہکتی ہوئی انگلیاں
رائفل اور بندوق تھامے ہوئے ہیں
جن کی آواز میں امن کا گیت
آدمیت کا سنگیت ہے۔

⁂⁂⁂⁂

جیل

تیرگی رتی ہے
جیسے زخموں سے سیہ خون کی بوندیں ٹپکیں
خامشی چلتی ہے
چیونٹیاں جیسے بدن پر رینگیں
قید میں چلتے ہوئے سایوں کے
اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کی اندھی دیوار
ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھتی ہے
درد کی طرح سے اٹھتی ہیں امنگیں دل میں
ٹیس کی طرح سے بھولی ہوئی یاد آتی ہے
جیل کی خاک سے آہوں کا دھواں اٹھتا ہے
اور لوہے کی سلاخوں میں بدل جاتا ہے
بیڑیاں روتی ہیں، زنجیریں فغاں کرتی ہیں
کوڑے چیخ اٹھتے ہیں جلاّدوں کی خونخواری پر
کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ تشدد کا نظام
آج اہنسا کے پجاری ہیں محافظ جس کے
دھارے اس وادیٔ خاموش میں تھم جاتے ہیں
آنسو آنکھوں سے ٹپکتے نہیں جم جاتے ہیں
نالے بے سود ہیں بیکار ہے فریاد یہاں
ہم ہیں صید اور ہر اک ذرہ ہے صیاد یہاں
اپنے ہاتھوں سے تشدد کو مٹانا ہوگا
آہن و سنگ کی دیوار کو ڈھانا ہوگا

☆☆☆☆

جشن بغاوت

ساتھیو لال سلام

آج ٹکراتے ہیں ایوانِ حکومت سے عوام
آج آقاؤں کی گردن پہ جھپٹتے ہیں غلام
آج ہے خاک بسر ظلم و تشدد کا نظام
آج شاعر کی زباں پر ہے بغاوت کا پیام

ساتھیو لال سلام

آج ہر گام پہ سو سرخ علم لہراؤ
گاؤ استالن و لینن کے ترانے گاؤ
اک ایڑ اور بھی رہوارِ بغاوت کو لگاؤ
لکھ دو پیشانیٔ تاریخ پہ مزدور کا نام

ساتھیو لال سلام

وادیٔ سنگ سے نکلا ہے شراروں کا جلوس
شب کی راہوں سے گزرتا ہے ستاروں کا جلوس
چین کے سرخ افق پر ہے بہاروں کا جلوس
ماؤ کے ہاتھ میں آزادیٔ انسان کا جام

ساتھیو لال سلام

آسمانوں کو ہلاتا ہے زمیں کا بھونچال
ناچتی پھرتی ہے ویران ملوں میں ہڑتال
موجیں دیتی ہیں گرجتے ہوئے طوفان کو تال
ڈھل گیا وقت کی رفتار میں بجلی کا خرام
ساتھیو لال سلام

بجھ گئی سینۂ انجن میں دہکتی ہوئی آگ
سو گئے چین سے شعلوں کے لپکتے ہوئے ناگ
بھاپ گاتی نہیں اب تیز ئی رفتار کے راگ
پٹریاں بیٹھی ہیں لوہے کا بچھائے ہوئے دام
ساتھیو لال سلام

ڈوبتی رات کے تاروں کو کفن پہنا دو
مارشل چیانگ کے پیاروں کو کفن پہنا دو
ہند کے راج دلاروں کو کفن پہنا دو
گھر میں سرمایہ کے مدت سے مچا ہے کہرام
ساتھیو لال سلام

پھونک دو کالے فرنگی کے صنم خانے کو
کھود کر گاڑ دو بزدلی کے افسانے کو
آج جاتی ہے ہراک راہ تلنگانے کو
قافلے رک نہیں سکتے کسی منزل پہ قیام
ساتھیو لال سلام

رومان سے انقلاب تک

(پندرہ برس کی ترقی پسند شاعری پر تنقید)

ساتھیو اب میری انگلیاں تھک چکی ہیں
اور مرے ہونٹ دکھنے لگے ہیں
آج میں اپنے بے جان گیتوں سے شرما رہا ہوں
میرے ہاتھوں سے میرا قلم چھین لو
اور مجھے ایک بندوق دے دو
تا کہ میں اپنے نغموں میں فولاد و بارود کا زور بھر دوں
میں تمھاری صفوں میں تمہاری طرح
اپنے دشمن سے لڑنے چلوں گا
میں تمھارے نفس کی حرارت
تمھارے لہو کی روانی
تمہارے دلوں کی تڑپ چاہتا ہوں

میں ادب کی بلندی سے واقف ہوں مجھ کو
شعر کی قوتوں کا بھی احساس ہے
جن سے ریگ بیاباں میں طوفاں اٹھے ہیں

لیلیٰ اب مجھ کو اس دور کے
سارے اشعار بے کیف سے لگ رہے ہیں
وہ مرے اپنے اشعار ہوں یا کسی اور کے
ان میں تلوار کی دھار بجلی کی تیزی نہیں ہے
صرف اشکوں کے طوفان، خوابوں کے رومان ہیں
خوں کی گرمی نہیں ہے

میں نے ہر طرح کے گیت گائے
میں نے ہر رنگ کے پھول برسائے لیلیٰ
پھول زخموں میں اور گیت فریاد میں کھو گئے

میں نے زخموں پہ اشکوں کا مرہم لگایا
میں نے آہیں بھریں
میں نے اپنی امنگوں کی لاشوں پہ ماتم کیا
اپنی مردہ محبت کی قبریں بنائیں
اور انھیں جا کے بازار میں بیچ آیا

میں نے برفاب جسموں کو پگھلا دیا
تھرتھراتے ہوئے نرم آنچل کو سینوں سے ڈھلکا دیا
اور پہلی محبت کے پھولوں سے شبنم کے موتی چنے
اور انھیں
چند کاغذ کے ٹکڑوں میں
کپڑے کی جلدوں میں محفوظ کر کے
کتب خانوں میں رکھ دیا
ان کے اوراق پر تہہ بہ تہہ

ماہ اور سال کی گرد جمتی رہی
اور میں اپنے جذبات کی دھندلی دھندلی فضاؤں میں کھوتا گیا
زندگانی کی شورش سے کچھ اور بھی دور ہوتا گیا

میں نے دہلی میں پنجاب میں اپنے نغموں کی جھولی پساری
اور ایک ایک سے امن کی بھیک مانگی
ان کو مجھ پر ترس آ گیا
(اس سے کیا بحث وہ کون تھے
راہزن تھے کہ جلاد تھے
پھر بھی انسان تھے
آخرش وہ مرے ہم وطن تھے)
اور انھوں نے میری گود میں
چند جھلسے ہوئے ہاتھ
ٹوٹی ہوئی ہڈیاں
خوں میں لتھڑی ہوئی چھاتیاں پھینک دیں
روٹیوں کو کبھی میں نے چاند اور سورج سے تشبیہ دی اور کبھی رنڈیوں سے
اور وہ چاند سورج کی مانند ہم سے بہت دور نیلی فضاؤں میں اڑتی رہیں
صرف خوابوں میں صورت دکھاتی رہیں
رنڈیوں کی طرح
نفع خوری کے اونچے جھروکوں میں بیٹھی ہوئی مسکراتی رہیں
آنتیں روتی رہیں پیٹ یوں ہی بلکتے رہے
بھوک کی آگ میں روح اور دل سلگتے رہے

میں نے اپنے تخیل میں خوابوں سے کپڑے بنے
اور ستاروں سے آنچل بنائے

میں نے ان کارخانوں کے نغمے سُنے
جو ابھی صرف میرے تصور میں محبوس ہیں
اور میرا وطن چیتھڑوں میں ہی لپٹا رہا

ریت سے میں نے کتنے گھروندے بنائے
اور ہمالہ کی نیلی چٹانوں کے دل کو ٹٹولا
میں نے پتھر کے سینے میں محراب و مینار کا حسن دیکھا
اور مرا ذہن کیا جانے کتنے ستوں، کتنے دیوار و در؛ حال لایا
میں نے اپنے وطن کو سجایا
اس کے ایک ایک ذرّے کے دل میں اجنتا ایلورا بسایا
پھر بھی میرا وطن آج ویران ہے
اس کے محلوں میں چور اور ڈاکو بسے ہیں
اور انسان سڑکوں پر آوارہ ہیں

اور میں سوچتا ہوں کہ میں کون ہوں
کس کا شاعر ہوں
کس کے لئے گا رہا ہوں

اک طرف اونچے اونچے محل ہیں
اک طرف جھونپڑے ہیں
اک طرف گوشت کے اور چربی کے بورے دھرے ہیں
اک طرف سخت فولاد کے سخت اعصاب ہیں
اک طرف ظلم اور جبر کی قوتیں ہیں
اک طرف عدل و انصاف کا زور ہے
اک طرف ماؤ ہے اک طرف چیانگ ہے

اک طرف مارشل ہے اک طرف مالوتاف
اک طرف کالی فسطائیت اک طرف انقلاب
اک طرف ایلیٹ اک طرف گورکی
اک طرف فصل گل اک طرف کارزار خزاں
اک طرف عہد ماضی کی ویرانیاں
اک طرف آنے والے زمانے کی تعمیر
اک طرف شب کی پرہول پرچھائیں ہے
اک طرف سرخ سورج کی تنویر ہے
اک طرف موت ہے اک طرف زندگی ہے
اک طرف تیرگی اک طرف روشنی ہے
اک طرف خامشی اک طرف شاعری ہے

شاعرو، ساتھیو
وقت نے فیصلہ کر دیا ہے
بولو تم آج کس کے طرفدار ہو
کس کے غم خوار ہو
آج بندوق بربط ہے فولاد کی گولیاں راگنی ہیں

شاعرو ساتھیو
اپنے تاریک اندیش رومان کے ساز کو توڑ دو
اپنی مضراب کو پھینک دو
اس کے نغموں سے آنسو ٹپکتے رہیں گے
اپنی شہرت کے اونچے مناروں سے
نیچے اتر آؤ
اپنے کتب خانوں سے

آؤ باہر نکل آؤ
اور زندگانی کی رفتار دیکھو
عہد حاضر کے انسان کا جوش دیکھو

شاعرو ساتھیو
کاکلوں کی گھنی چھاؤں سے
سرخ پرچم کے گھنے سائے میں آؤ
اور نئے گیت گاؤ
گاؤ مزدور کے ساز پر
گاؤ جمہور کے ساز پر
آہنی کاروانوں کے قدموں کی آواز پر
گاؤ جس طرح میداں میں کوئی مجاہد رجز پڑھ رہا ہو
گاؤ جیسے سمندر میں طوفان کا دیوتا چڑھ رہا ہو
گاؤ گاؤ گرجتے ہوئے بادلوں کی طرح
گاؤ گاؤ کڑکتی ہوئی بجلیوں کی طرح
آندھیوں کی طرح
زلزلوں کی طرح
گولیوں کی طرح اپنے الفاظ دشمن پہ برساؤ
سارے عالم پہ چھا جاؤ

مارچ 1949

امن کا ستارہ

1950

امن عالم کے مجاہدوں کے نام!

جنگ باز خونخوارو
ہم تمھیں سزا دیں گے
یہ غرورِ زر داری
خاک میں ملا دیں گے
خون کے پیاسے ہو
ہم مزا چکھا دیں گے
وہ نظام، وہ دنیا
جس میں جنگ پلتی ہے
ایک دن مٹا دیں گے

سردار جعفری

پیش لفظ

یہ تین طویل نظموں کا مجموعہ ہے جسے کسی پیش لفظ یا دیباچے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ میں نے اپنی نظموں میں کہا ہے۔ صرف ایک نظم ''استالن کتھا'' کے بارے میں تھوڑی وضاحت کی ضرورت ہے۔

''یہ نظم اردو ہندی کی سب سے عام اور مقبول بحر میں لکھی گئی ہے۔ میں نے عام طور سے ساڑھے سات ارکان استعمال کیے ہیں لیکن کہیں کہیں جذباتی بہاؤ اور اس کی پیدا ہونے والی شاعرانہ روانی سے مجبور ہو کر آٹھ ارکان بھی استعمال کر لیے ہیں۔ میں بڑی آسانی سے ساڑھے سات ارکان تک محدود رہ سکتا تھا لیکن میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ کیوں کہ اس پر غیر ضروری اصرار کٹر قسم کی فنی اصول پرستی اور اس سے پیدا ہونے والی تنگ نظری اور تعصب کے سوا کچھ نہیں۔

دو چار لفظ زبان کے متعلق زبان میرے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہے وہ ایک سماجی وسیلہ ہے جس کے ذریعہ سے ایک انسان کے خیالات اور جذبات دوسرے انسان تک پہونچتے ہیں اور اس لیے وہ خیالات و جذبات اور سماجی ضروریات کی پابند ہے۔ میری شاعری خواص کے لیے نہیں ہے بلکہ عوام کے لیے ہے اور میری خواہش اور کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کو سمجھ سکیں کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور اور کھیتوں میں ہل جوتنے والے کسان۔ اس لیے میں نے بول چال کی زبان کو بنیاد بنایا ہے اور کہیں کہیں ''بازاری'' محاورے اور الفاظ بھی استعمال کر لیے ہیں جو بہت سے ''سخن شناسوں'' کو ناگوار گزریں گے۔ لیکن ''ناشناسوں'' کو بہت مزہ آئے گا۔ میں عام طور سے اچھی شاعری میں ''بازاری'' محاوروں اور زبان کا استعمال جائز سمجھتا ہوں لیکن ایک ایسے سماج میں جس کی اکثریت کا بہت بڑا حصہ جان بوجھ کر ان پڑھ اور جاہل رکھا گیا ہو اگر عوامی شاعری ''بازاری'' محاوروں اور الفاظ ہی سے نہیں بلکہ گالیوں سے بھی کام لے تو کوئی ہرج نہیں ہے کیوں کہ ہم جس طبقے کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں اس کے کردار و افعال اتنے گھناؤنے ہیں کہ ہماری زبان کے ''مہذب'' الفاظ اس گھناؤنے پن کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے ان کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ''بازاری'' محاوروں اور الفاظ کو یہ سماجی فریضہ انجام دینا پڑے گا۔

میں نے ایک اور جرأت کی ہے یعنی دیہاتی بولی کے ساتھ ہندی اور اردو کی ادبی زبان کی آمیزش کر دی ہے اور کہیں کہیں لفظوں کا وہی تلفظ باقی رکھا ہے جو ان پڑھ زبانوں پر ہے۔ مثلاً کارخانوں کی جگہ ''کرخانوں'' اور بدمعاشوں کی جگہ ''بدماشوں'' لکھا ہے۔

اس نظم میں رومانیت کی آمیزش ضرور ہے لیکن مبالغہ کہیں نہیں ہے۔ لیکن یہ رومانیت تاریک اندیش نہیں بلکہ روشن نظر ہے۔ مبالغے کی ضرورت مجھے اس لیے پیش نہیں آئی کہ اشتراکی حقیقت خود مبالغے اور تخیّل سے بھی زیادہ حسین اور شاعرانہ ہے۔ انسانی تخیّل اور جذبات نے صدیوں جس حسین وجمیل دنیا کی تعمیر کے خواب دیکھے ہیں اور جنھیں گیتوں داستانوں اور کہانیوں میں بند کر دیا ہے، سوویت یونین کی تعمیر اس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہے۔ خوابوں، افسانوں اور گیتوں پر حقیقت کی یہ فتح استالن کے خلاق اور معمار ہاتھوں کی مرہونِ منت ہے۔

سوویت یونین سرمایہ داری، سامراج، ظلم اور استحصال کو مدت ہوئی ختم کر چکا۔ آج وہاں کے سائنس داں مریخ کا نباتاتی مطالعہ کر کے ٹنڈرا کے برفستانوں میں ہرے بھرے پودے اگانے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ ہزاروں میل لمبے دریاؤں کا رخ موڑ کر ریگستانوں کی آب پاشی کر رہے ہیں۔ پہاڑوں کو گرا کر یا نئے جنگل لگا کر موسموں کو تبدیل کر رہے ہیں۔ وہ ٹینکوں سے ہل جوتنے اور بمباروں سے ٹڈیاں مارنے کا کام لیتے ہیں۔ وہ ایسا ''سدابہار'' گیہوں اگا رہے ہیں جسے بار بار بونے کی ضرورت نہیں۔ اور سائنس کی قوتوں کو ایٹم بم بنانے کے بجائے گائے کا دودھ بڑھانے اور باجرے کی بہتر فصل اگانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں انھوں نے ذہنی اور جسمانی محنت کا فرق مٹا دیا ہے اور اس طرح ایک ایسی تخلیق کی ہے جسے صحیح معنوں میں انسان کہتے ہیں۔

اس انسان سے سرمایہ داری دنیا خائف ہے خون اور آنسوؤں کے بیوپاری، بنکوں، رائفلوں اور بمباروں کے مالک اور تاجر بوکھلائے ہوئے ہیں اور اس انسان کو مٹانے کے لیے جنگی تیاریاں کر رہے ہیں کیونکہ یہ انسان اس حیوان کی موت کا اعلان ہے جسے سامراجی اور فاشسٹ کہتے ہیں۔ لیکن یہ انسان جو سب سے پہلے سوویت یونین میں جوان ہوا ہے، جو مشرقی یورپ اور چین میں بھی پیدا ہو چکا ہے اور دنیا کے ہر ملک میں پیدا ہونے کے لیے بیتاب ہے، دنیا کے امن کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

استالن اسی انسان کا معمار ہے، وہ دیوتا، پیغمبر اور اوتار نہیں ہے بلکہ اس انسان کی سب سے مکمل تصویر ہے، اس لیے ہمارے دل استالن کی محبت اور عقیدت سے سرشار ہیں۔

بمبئی، فروری 1949 — سردار جعفری

سویت یونین
اور
جنگ باز

یہ سویت کی سر زمیں جو فخرِ روزگار ہے
محبتوں کی انجمن جو سب کی دوست دار ہے

بدل دیا ہے موسموں کو جس نے وہ ہوا ہے یہ
نئے ستارے ناچتے ہیں جس میں وہ فضا ہے یہ
جو زندگی کو موہ لے وہ دلربا ادا ہے یہ
یہ عشق کی زمین ہے یہ حسن کا دیار ہے

ملوں میں کھیتیوں میں محنتوں کی حکمرانیاں
ٹرکٹروں کے گرد ناچتی ہوئی جوانیاں
سرور، کیف، شعر، نغمہ، داستاں، کہانیاں
خزاں کا نام بھی نہیں بہار ہی بہار ہے

تھرک رہی ہے زندگی فراغتوں کی چھاؤں میں
حسین گیت تیرتے ہیں نیلگوں فضاؤں میں
یہاں غموں کی بیڑیاں نہیں کسی کے پاؤں میں
نہ کوئی اشک بار ہے نہ کوئی سوگوار ہے

درخت، پھول، پھل، بہار، آدمی کے واسطے
زمین، کھیت، کوہسار آدمی کے واسطے
شکوہ و عظمت و وقار آدمی کے واسطے
یہاں ہر ایک شے پہ آدمی کا اختیار ہے

یہ دشمنوں کے ساتھ اپنا زور آزما چکے
یہ زرگری کی سازشوں کو خاک میں ملا چکے
یہ لوٹ اور کھسوٹ کی بساط ہی اٹھا چکے
اب ان کی محنتوں سے ان کی خاک لالہ زار ہے

ستم کو ختم کر دیا ستم کے ہاتھ کاٹ کر
ہزار گل کھلا دیئے ہیں شاخ گل کو چھانٹ کر
یہ کتنے خوش ہیں باہمی مسرتوں کو بانٹ کر
نگاہ باشعور ہے، شعور پختہ کار ہے

یہ سب کے خیر خواہ ہیں انھیں کسی سے کد نہیں
یہ سب کے دوست ان کی دوستی کی کوئی حد نہیں
دلوں میں فتنہ و فساد و کینہ و حسد نہیں
بدی کو خوف، نیکیوں کو ان پہ اعتبار ہے

جو ہاتھ روس کی طرف بڑھے گا ٹوٹ جائے گا
جو جان لینے آئے گا وہ اپنی جاں گنوائے گا

جو جنگ کیلیے اٹھے گا بچ کے جا نہ پائے گا
یہ نازیت کی قبر سامراج کا مزار ہے

ادھر قدم بڑھاؤ گے تو پھر پلٹ نہ پاؤ گے
لہو بہا کے اپنے ہی لہو میں ڈوب جاؤ گے
یہاں تم اپنی قبر اپنے ہاتھ سے بناؤ گے
یہ روح و دل کا مورچہ حیات کا حصار ہے

تم اسکو دیکھتے ہو صرف نقشہ ہائے جنگ میں
اسیر کر دیا ہے سوویت کو ایک رنگ میں
مگر بسا ہوا ہے وہ ہماری ہر امنگ میں
ہمارے دل کا گیت ہی ہمارے دل کا تار ہے

یہ سرحدیں وہ سرحدیں ہیں جن کی انتہا نہیں
یہ نقش نقش دل ہے، کاغذوں پہ جو لکھا نہیں
اسے مٹا سکے کسی میں اتنا حوصلہ نہیں
یہ آدمی کی روح ہے، یہ روح کا وقار ہے

ہے ایک سوویت کا دیس خاک پر بسا ہوا
مگر اک اور ہے ہمارے خون میں رچا ہوا
ہماری آرزو، ہمارے خواب میں سجا ہوا
یہ خواب وہ ہے جس کا کل زمیں کو انتظار ہے

نومبر 1948

استالن کتھا

(ڈھولک پر گانے کے لیے)

آزادی کے لڑنے والو، سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جسکے دم سے اجیاری ہے لینن کی
جس نے نربل نردھن جن کو مکتی مارگ دکھایا ہے
جس نے جنتا کی شکتی سے جنتا راج بنایا ہے
جس نے پونجی واد کے ہتھیارے ہاتھوں کو کاٹ دیا
جس کے لوہ نے انیائے کے بھاڑ سے منہہ کو پاٹ دیا
اجڑے ہوئے دل پھر سے بسائے سینوں کو آباد کیا
مزدوروں کے ادھنایکو سے دنیا کو شاد کیا
چمکا سوریہ کرن بن کر جس کے ماتھے کا اجیالا
دہک اٹھی جسکی درشٹی سے وشو کرانتی کی جوالا
جسکا خزانہ میری تیری خوشیاں ہیں ایسا دھنوان
جس نے سمے کی دھارا کا رخ موڑ دیا ایسا بلوان
لینن اسکا گرو اور ساتھی جنتا اس کی سینا ہے
وہ کہہ دے تو مرنا ہے اور وہ کہہ دے تو جینا ہے

آزادی کے لڑنے والو سنو کتھا استالن کی!
سارے جگ میں جسکے دم سے اجیاری ہے لینن کی
روس کی پرجا بھوکوں مرتی جیسے ہند کی پرجا آج
روس کا راجہ لہو کا پیاسا جیسے ہند کے نیتا آج
فوج پولس اور لاٹھی گولی، جیلیں پھانسی کوڑے تھے
روس کے تن پر سونے چاندی کے پھوڑے ہی پھوڑے تھے
جال بچھا تھا انگریزی اور امریکی دھن والوں کا
دھرتی دولت والوں کی تھی دیس تھا وہ کنگالوں کا
مل کے مالک مزدوروں کا خون چراتے رہتے تھے
انسانوں کو لوہے کے دانتوں سے چباتے رہتے تھے
پیلے پیلے بھوک کے دیدے ہونٹ پیاس کے نیلے تھے
انیائے کے کالے ہاتھ نیائے کے خون سے گیلے تھے
گاؤں گاؤں کے گھائل دل میں جاگیروں کے خنجر تھے
امیدوں کے پہلو میں ناامیدی کے پتھر تھے
کھیت کی ساری فصلیں پکنے سے پہلے چھن جاتی تھیں
دہقانوں کے باغ کی کلیاں کھلتے ہی بن جاتی تھیں
بھوکے رہتے دھوبی، موچی، بنجارے اور لکڑہارے
دھن کی ناگن روٹی پانی پر بیٹھی تھی کنڈلی مارے
رین دنا محنت کرتے تھے، سانجھ سکارے روتے تھے
اندھوں آگے روتے تھے اپنی بھی آنکھیں کھوتے تھے
ان کو مکتی راہ دکھائی لینن اور استالن نے
ان کی دنیا نئی بنائی لینن اور استالن نے
بھوک کے دل سے ہوک اٹھی اور لینن بن کر للکاری

مظلومی کی آہ سے بھڑکی استالن کی چنگاری
دکھ نے اپنی بھٹی میں جب لاکھ دلوں کو پگھلایا
اک نیا دل بن کر دھڑکا اور استالن کہلایا
استالن کا بچپن بیتا کاکیشس کے پہاڑوں میں
اور جوانی جیلوں میں یا سابریا کے جاڑوں میں
اسکا سر اونچا ہی رہے گولا کھ مصیبت پڑتی جائے
جتنی مصیبت بڑھتی جائے، اتنی ہمت بڑھتی جائے
موت کے گھپ اندھیارے میں وہ جیون جیوتی لے کر آئے
مزدوروں کی ہر ٹولی میں لینن کا اپدیش سنائے
کچا چٹھا بتلائے مل والوں کا دھن والوں کا
گر سکھلائے محنت کرنے والوں کو ہڑتالوں کا
بندوقوں اور سنگینوں کی باڑھ پہ بھی آگے ہی بڑھے
مزدوروں کا لشکر لے کر فوج پولس پر ٹوٹ پڑے
مزدوروں کو بتلائے سب دولت ہے مزدوروں کی
کیا ہے منافع آخر؟ فاضل محنت ہے مزدوروں کی
بارہ گھنٹے محنت کر کے چھ گھنٹے کی اُجرت پائیں
مل والوں کی دولت باڑھے محنت والوں کی بپتائیں
کب تک یہ اندھیر نگر، چوپٹ راجہ کا تخت و تاج
اپنی محنت، اپنا منافع، اپنی دولت اپنا راج
محنت کو یہ خواب دکھایا، لینن اور استالن نے
محنت کش دنیا کو جگایا، لینن اور استالن نے
مزدور اور کسان کی ایکتا کر انتی کا ہتھیار بنی
جن بپتا، جن شکتی، اور جن شکتی اک سنسار بنی

لینن نے مزدوروں کے فولاد سے اک تلوار بنائی
ستالن کے فولادی ہاتھوں نے اس کو سان لگائی
اس کی دھار نے جنتا کے پیروں کے بندھن کاٹ دیئے
سرمایہ داری کے سنہرے ہاتھ کے کنگن کاٹ دیئے
کیسی لچکتی، کیسی چمکتی، کیسی پیاری کیا کہنا
کیسی نیاری، کیسی کاری، کیسی دودھاری کیا کہنا
خوش ہوکر محنت کرنے والوں نے یہ تلوار اٹھائی
لینن کی یہ پارٹی سارے جگ میں بالشوک کہلائی
روس کے زار کی گردن باندھی پارٹی کی تدبیروں نے
مزدوراور کسانوں کے ہاتھوں کی کڑی زنجیروں نے
لینن نے جب ہاتھ اٹھایا، اور استالن للکارا
روس کے کونے کونے میں دہکا کرانتی کا انگارا
لال پھریرا لے کر نکلے نردھن مزدور اور کسان
مل پر دھرنا دیکر بیٹھے بانٹ لیے سارے کھلیان
ظلم کا سر اور انیائے کا پاپی سینہ پھاڑ دیا
دل پہ زمینداروں کے اپنے راج کا کھونٹا گاڑ دیا
فوج کسان اور مزدوروں کا پہلا پہلا راج آیا
لینن استالن نے بدل دی روسی جنتا کی کایا
مانوتا کی قسمت بدلی، بدلی ہاتھوں کی ریکھائیں
ان کے رکت میں ڈوب کے نکلیں نویگ کی سندر سیمائیں
شبھ منگل کی گھڑی سہانی، پھل تمہاری سب کی رائے
ٹھیک ہے ایسے میں سردار کوی کی ایک غزل ہو جائے
جھنکے جھانجھن، بجے پکھاوج، یا ڈھولک گمکاؤ تم
جی چاہے تو الغوزے یا تان پورے پر گاؤ تم

غزل

اوروں کا زمانہ ختم ہوا، اب اپنا زمانہ ہے ساتھی
وہ دکھ کا زمانہ ختم ہوا، اب سکھ کا ترانہ ہے ساتھی
پھولوں کی طرح ہم کیوں نہ ہنسیں غم ختم ہوا دکھ بیت گیا
جو پہلے کبھی آیا ہی نہ تھا وہ جشن منانا ہے ساتھی
پلکوں پہ چمکتے آنسو کو کیسے میں ستارہ کہہ دوں گا
آنسو کی امنڈتی ندیوں سے پلکوں کو بچانا ہے ساتھی
اس بحث میں پڑنا لا حاصل یعنی کوئی جنت ہے کہ نہیں !
دھرتی ہی کو اپنے ہاتھوں سے فردوس بنانا ہے ساتھی
جو آگ لگی ہے دل میں ، اسے کچھ اور ابھی بھڑکانا ہے
اس آگ سے ہم کو دنیا کی ہر آگ بجھانا ہے ساتھی
بڑھتی ہوئی فوجوں کا نغمے کیوں ساتھ نہیں دے پاتے ہیں
ہاں ساز کی لے کو اور ابھی کچھ اور بڑھانا ہے ساتھی
دو ہاتھ ملے انسانوں کو ، دو ہاتھوں کو دو کام ملے
اک قبر بنانا ہے ساتھی اک قصر اٹھانا ہے ساتھی
کہنے کے لیے دو کام مگر یہ ایک ہی ہیں دو کام نہیں
اک دیپ بجھانا ہے ساتھی ، اک دیپ جلانا ہے ساتھی
اب جاگ بھی جا، کروٹ بھی بدل او نیند کے ماتے بھور ہوئی
راتوں کی لٹوں کو اوشا کے مکھڑے سے ہٹانا ہے ساتھی
یہ ایک صدی کے بعد بھی اب تک میر کے نمر میں روتا ہے
کس دیس کا رہنے والا ہے یہ کون دوانہ ہے ساتھی
جو سب کی سمجھ میں آ نہ سکیں بیکار ہیں سب وہ شعر و غزل
جنتا کی زباں میں کہنا ہے، جنتا کو سنانا ہے ساتھی

آزادی کے لڑنے والو، سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جس کے دم سے اجیاری ہے لینن کی
ہو گئے دھرتی کے دو ٹکڑے تب سے ہیں دنیائیں دو
راہیں دو ہیں، دو منزل، دو مقصد ہیں آشائیں دو
اک دنیا ہے محنت کی، اور محنت کی آزادی کی
دوسری دنیا دولت کی اور دولت کی بدذاتی کی
اک دنیا ہے امرت برکھا، امن کے نغمے پریم کے گیت
دوسری دنیا بس پھیلائے اور بڑھائے جنگ کی ریت
اک دنیا میں ہنستے چہرے گاتی سانس مہکتے ہونٹ
دوسری دنیا میں آنسو کے پیالے اپنے خون کے گھونٹ
اک دنیا میں تدبیریں انسان کی شان بڑھانے کی
دوسری دنیا میں سب گھاتیں آدمی کو کھا جانے کی
اک دنیا مزدوروں کی اور وہ دنیا انسانوں کی
دوسری دنیا سرمائے کی، وہ دنیا حیوانوں کی
پچھّم دیس کے پونجی وادی اس دکھ میں اپنا جیو کھوئیں
چندرما کو دیکھ کے جیسے گاؤں کے سارے کتے روئیں
کرانتی کے سورج کے آگے کالی کالی بدلی چھائی
پچھّم دیس سے خون کی اور بارود کی اندھی آندھی آئی
چودہ دیس کے پونجی والے روس کے سینے پر چڑھ آئے
چودہ دیس کے لشکر ڈان کے میدانوں تک بڑھ آئے
دنیا بھر کے چور اچکّے ٹھگ اور ڈاکو اور لٹیرے
روس کو نیم جان کے ڈالیں اپنی کاریفوج کے گھیرے
گھر کے بھیدی روس کے موتنے لینڈی کتے غرائیں
پورب کو لپک تھرکیں مٹکیں دکھن ڈنکن اترائیں

اترے پچھم سے ظالم ریگل کے پاپی لشکر آئیں
آؤ بیٹا بات تو جب ہے تگنی کا ہم ناچ نچائیں

لشکر لشکر سانپ سنپولے
سر پر برسیں بم کے گولے
ڈر کے مارے کوئی نہ بولے
دھرتی کانپے آسن ڈولے
تھر تھر تھر تھر کانپے ہر دل
ٹیڑھے رستے مشکل منزل
آگ کے دریا خون کے ساحل
لاکھوں زخمی لاکھوں گھائل

چلنے والے پیروں کو کب باندھ سکیں مکڑی کے جالے
کوے چاہے جتنا کوسیں، ڈھور نہیں ہیں مرنے والے
دشمن سے سب لڑنے جائیں لینن نے اعلان کیا
زارتسین میں جا کر استالن نے اونچا کام کیا
کولک ذرگ میں دشمن سے مل جانے کی تیاری تھی!
موسری کابل کھود رہا تھا ٹرانسکی کی غداری تھی
دشمن اُتر میں آئے تو وہ دکھن کو جاتا تھا
کرانتی کاری سینا کو وہ الٹی راہ بتاتا تھا
کاٹنے دوڑے سچی بات بتانے والے مانس کو
چڑیا گھر میں بند کرو لے جا کے اس بن مانس کو
سمجھاؤ وہ پھر بھی نہ سمجھے بولو سنتو کون اپائے
بھینس کے آگے بین بجاؤ لیکن بھینس کھڑی پگرائے
استالن نے جان لیے اس بوڑھی بھینس کے پیچ اور دانو

اس لوہے کی بھاری مورت کے ہیں ماٹی جیسے پانو
استالن کے گیان نے ایک نیا الاؤ سلگایا
اور اس میں ٹراٹسکی کے جنگی نقشے کا منہہ جھلسایا
چلنے لگا کر اتنی کا پہیا، آگے بڑھے لڑویا ہو
کاریچھیں ہائے ری دیا روئیں اوموری میا ہو
دشمن کے سینے پر جا کر پورا پورا بیٹھا وار
ایسے بہادر لڑنے والے جن سے ہار گئی تلوار
بھاگنے والے بیری اپنی پتلون میں موتت جائیں
بڈیونی کے گھوڑے ان کو ٹاپ کے نیچے روندت جائیں
مزدوروں پر حملہ کرنے کیوں آئے تھے دھت تیری
کس نے کہا تھا، روس میں مرنے کیوں آئے تھے دھت تیری
استالن نے کھال ادھیڑی لینن نے بھُس بھر وائی
کام نہ آئی کچھ پچھم کے دھن وانوں کی چترائی
ستوزارتسین کا نام اس دن سے پڑا استالن گراد
اس کے سارے شہروں میں ہے سب سے بڑا استالن گراد

آزادی کے لڑنے والو سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جسکے دم سے اجیاری ہے لینن کی

کال کی کالی ناگن روسی دھرتی پر لہرائے
کالی رات کی صورت اپنا کالا پھن پھیلائے
کالی رات ہوا میں اپنا کالا دس برسائے
کالی رات ڈرائے
کالا پھن پھیلائے
کالی رات میں اپنے دل کی جوالا بن کر نکلو

کالی رات کے کالے پن پر بجلی بن کر برسو
کالی رات نہ بچنے پائے کالی رات کو کچلو
کالی رات بلائے
کال کا پھن پھیلائے
طرح طرح کے لال بجھکو طرح طرح کی باتیں تھیں
مزدوروں کا پہلا راج مٹا دینے کی گھاتیں تھیں
سرحد پار کے بیری ہارے، گھر کے بیری باقی تھے
سوچتے تھے وہ ڈھنگ نئے ہرروز نئی غدّاری کے
کوئی بولے مزدوروں کا راج نہیں ہے چلنے والا
کوئی کہے دشکال نہیں ہے روس کے سر سے ٹلنے والا
استالن نے جزدوروں کا راج بنا کر دکھلایا
کام کٹھن تھا پھر بھی اس نے قحط مٹا کر دکھلایا
پونجی والوں کے گرگوں نے راہ میں سوروڑے اٹکائے
دانہ ڈالا، لاسا لگایا، پھندے پھینکے، جال بچھائے
ٹراٹسکی نے کچھوے کی طرح سے اپنے ہاتھ اور پاؤں نکالے
اور نجارن نے اپنے ٹوٹے پھوٹے ہتھیار سنبھالے
ٹراٹسکی بائیں بھاگے بھیّا، اور نجارن دائیں جائے
دیکھ کے سیدھی پگڈنڈی ان سب کو جیسے رتوندھی آئے
کوئی کہے کہ پہلے سارے مانو جگ میں کرانتی لاؤ
تب تم روس کے اندر مزدور اور کسان کا راج بناؤ
کوئی پاپی کولک ورگ بچانے کا سامان کرے
لینن کو گرپاوے ساری جنتا کا اپمان کرے
کوئی بچھو بن کر اپنے زہر میں ڈوبا ڈنک اٹھائے
کوئی پھنکارا بن کر اپنی پھنکاروں سے زہر اڑائے
کوئی گھر کا مال چرائے لومڑی کی چالاکی سے

کوئی چیرے پھاڑے کھائے بھیڑیئے کی سفا کی سے
ٹراٹسکی اور نجارن تو تھے پہلے ہی سے پگلائے
ان پگلن کے ساتھ بہت سے اور بھی کو کر بوارے
گئے سمٹنے کے پونجی وادی بھوت پریت چڑیل اور ڈائن
روسی دھنوانوں کے پٹھو پادری ، ملا، نیتا، کاہن
لاکھ جتن سے اچھلیں کودیں، لاکھ جتن سے روئیں گائیں
طرح طرح کے روپ بنائیں، نرت کریں اور بھاؤ بتائیں
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
آخر اس بیماریٔ دل نے ان کا کام تمام کیا
استالن کی جیت پہ بھیّا لال ستارہ مُسکائے
جن شکتی کی بہتی دھارا پل پل چھن چھن بڑھتی جائے
بیس برس میں روس نے دوسو سال کے کام کو نبٹا یا
روس کی خوش حالی سے پونجی ورگ میں اک بھونچال آیا
ایسی اونچی ملیں بنائیں جو پربت کو شرمائیں
ایسی مشینیں جو پونجی والوں کو کچا ہی کھا جائیں
پگھلا لوہا بھل بھل اُبلے پگھلی آگ کے جھرنے گائیں
پلک جھپکتے دیر نہ ہو اور موٹر انجن ہل بن جائیں
لوہے کی چنچل انگلی ریشم کے تانوں بانوں میں
سوت کے تاروں کی کرنوں سے روشنی ہے کرخانوں میں
مزدوروں کے کام کے گھنٹے دن دن کم ہوتے ہی جائیں
انسانوں کے ہاتھ ہوں ہلکے اور مشینیں بھار اٹھائیں
جوتے نکلیں فیکٹری سے ڈھونڈھیں ننگے پاؤں کو
کپڑے ریل میں بیٹھ کے جائیں شہروں کو اور گاؤں کو
تنگ گلیوں کے سینے پر چوڑی سڑکیں لہرائیں
محل کھڑے ہوں اٹھ کر جیسے نیند میں میٹھے سپنے آئیں

سب مزدور اب پستک بانچیں اور کسان اخبار پڑھیں
جنتا راج میں کر یا ابھر بھینس برابر بن نہ سکیں
کال اکال اور سنکٹ ونکٹ دکھ بیماری کچھ بھی نہیں
بیکاری سرمایہ داری، اتیاچاری کچھ بھی نہیں

آزادی کے لڑنے والو سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جسکے دم سے اجیاری ہے لینن کی
لال بسنت کی سیمائیں ریگستانوں میں پھیلا دیں
روس کی نس نس میں بجلی کی ہنستی لہریں دوڑا دیں
ندیوں کی نرمل گردن میں پلوں کی ہنسلی پہنا دی
پیاسی مٹی کے منہ میں شربت کی کٹوری ڈھلکادی
لکڑی کے ہل ہوئے پرانے ان سے کہو آرام کریں
کھیتوں میں مل جل کر سب بجلی کے ہل سے کام کریں
بجلی کے ہل سو سو ایکڑ لمبے کھیتوں میں دوڑیں
چالیس گز بھر نیچے گھس کر مٹی کا سینہ توڑیں
نہر بہے مٹی کے بدن سے سوندھی سوندھی خوشبو آئے
کھیتوں کی بانہوں میں پانی پگھلی ہوئی چاندی بن جائے
ڈالی ڈالی پتی پتی مست پون میں لہرائے
کھیت کی گود میں دھان کی کنواری الڑھ بالی بل کھائے
گیہوں کے لہراتے پودے آنکھ پہ سونا برسائیں
پھول کپاس کے مٹھی مٹھی بھر چاندی لے کر آئیں
ایسی اچھی کھاد بنائیں پودے چھ چھ ہاتھ بڑھیں
انگوروں کی بیلیں لہرالہرا کر آکاش چڑھیں
جنتا کا دکھ کاٹنے کو ہر کٹھنائی برداشت کریں

سال کے سال اپنی محنت سے اپنا ناج بڑھاتے جاؤ
ایک فصل میں گیہوں بودواور کھلیان لگاتے جاؤ
پھل، سبزی، ترکاری، رنگ برنگے ہونٹوں سے مسکائیں
رستہ چلتے آدمیوں کو آنکھیں ماریں پاس بلائیں
بجلی گھر سے سیدھی بجلی مزدوروں کے گھر میں آئے
گاؤں گاؤں میں جاکر وہ دہقانوں کے چولھے سلگائے
سپن سلونے اور سہانے، میٹھی نیند کسانوں کی
کاج کرے رکھوالی اب خود کھیتوں اور کھلیانوں کی
ڈھیر ہیں ایک اک گھر کے اندر کپڑے کے اور کھانے کے
جھگڑے نبٹے کوئی نہیں ہیں اپنے اور پرائے کے
مل جل کر سب کام کریں، مل جل کر سب آرام کریں
رات کو ہنس ہنس صبح کریں، اور صبح کو ہنس ہنس شام کریں
مل کر بوئیں بیج کسان اور مل کر اپنی فصلیں کاٹیں!
سو وتیوں میں بیٹھ کے اپنا سارا ناج اور غلّہ بانٹیں
اپنی اپنی محنت کے پھل اپنے اپنے گھر لے جائیں
کھیلیں کودیں ناچیں گائیں، پڑھیں لکھیں تہوار منائیں
سارا راج اور پاٹ الٹ کر پھینک دیا ہتیاروں کا
کام نہیں اس دیس میں اب کچھ بنیوں ساہوکاروں کا
محنت کے پھل مزدوروں کے، مزدوروں کی محنت ہے
مزدوروں کا دیس ہے سارا، مزدوروں کی دولت ہے
مزدوروں کے جہاز چلیں، مزدوروں کی ریلیں لہرائیں
مزدوروں کے موٹر دوڑیں مزدوروں کے سپنے گائیں
مزدوروں کے سنیما تھیٹر، مزدوروں کے کھیل تماشے
مزدوروں کے ساز اور باجے مزدوروں کے ڈھول اور تاشے

مزدوروں کی اپنی سینا، مزدوراس کے افسر ہیں
مزدور اس دھرتی کے راجہ، اس آکاش کے اندر ہیں
مزدوروں کے سب اسکول اور مزدوروں کے باگ بگیچے
دھنوانوں کی ساری شیخی مزدوروں کے پاؤں کے نیچے
اب اتہاس بھی مزدوروں کا نام جپے اور گن گائے
اب تو سے بھی مزدوروں کے آگے اپنی سیس نوائے
مزدوروں کے نیتا بھی، مزدوروں جیسے کام کریں
مزدوروں کی شان بڑھائیں مزدوروں کا نام کریں
نفرت کے اندھیارے جگ پر پریم کی رنگیں جوت جگائیں
دکھ کی اگنی ٹھنڈی کر کے دل میں سکھ کے دیپ جلائیں
یہ کیا جادو ہے جس نے صبح بنایا راتوں کو
مل جائیں تو چوم لوں استالن کے پیارے ہاتھوں کو

دادا، ای تو سورگ ہے جو سردار کوی بتلاوت ہیں
ہمرا ناہیں ہمرا من سردار کوی جب گاوت ہیں
منگرے موڑ کھجاوت ہے جھمیامنہہ بائے بیٹھی ہے
تم ہی بتاؤ رام دلارے اسکی دنیا دیکھی ہے؟
اب سنتو جس کو یہ دنیا پیاری ہے وہ ہاتھ اٹھائے
استالن کی جے بولے مزدوروں کی سنگت میں آئے
مٹھی باندھے نشچے کر لے، ایسا راج بنائیں گے
لال پھریرے کے نیچے ساری جنتا کو لائیں گے
چھوڑو جھوٹی باتیں بھیّا یہ ہے سچّا کام کرو!
جے پرکاش اور نہرو جی کو دور ہی سے پرنام کرو!
لاکھ مصیبت آئے لیکن ہم نہیں پیچھے ہٹنے والے
بات پہ اپنی اڑنے والے، رن میں آکر ڈٹنے والے

ہم نے جان لیا کیسے جیتے ہیں کیسے مرتے ہیں
اوکھلی میں سر دینے والے موسل سے کب ڈرتے ہیں

آزادی کے لڑنے والو سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جسکے دم سے اجیاری ہے لینن کی
مزدوروں کے راج کے جھنڈے اور بھی اونچے ہوتے جائیں
دنیا بھر کے پونجی وادی دیکھیں اور من میں گھبرائیں
انگلینڈ امریکہ کی ملیں بند ہوویں اور بیکاری پھیلے
مالک موٹے ہوتے جائیں محنت کش جنتا دکھ جھیلے
پونجی واد کا سونا چاندی، تن کی چربی بڑھتی جائے
کال بکٹ کی جوڑی ساری مانوتا پر چڑھتی جائے
امریکہ کے مل مالک اور بیوپاری یوں تو نہ بڑھائیں
بھوکے منہ کو کور نہ دیں اور گیہوں کے کھلیان جلائیں
انگریزوں کی منڈی اور بازاروں میں بس الو بولے
روسی جنتا پینگ بڑھائے خوش حالی کا جھولا جھولے
پونجی وادی کے دل کی آشا موت کے اندھیارے میں بھٹکے
روس کی ہستی ان کے دل میں موت کا کانٹا بن کر کھٹکے
اپنے گھر کے پالتو کتے ہٹلر کو ہشکائیں وہ
ہٹلر پونجی واد کا بیٹا، ڈائن ماں کی کوکھ کا پوت
جس کی سانسیں جنگ کی آنی پر چھائیں فاشزم کا بھوت
مزدوروں کا پاپی دشمن یونینوں کا توڑنے والا
سادھارن دنیا کے دل میں خون اور پیپ کا گند اچھالا
ظلم و ستم کا ساتھی تھا انیائے کا رکھوالا تھا
نازی راج کا بانی تھا وہ آفت کا پرکالا تھا

انگریز اور امریکی اس سے آس لگائے بیٹھے تھے
اس راون کو وہ اپنے دامن میں چھپائے بیٹھے تھے

نازی فوجیں روس پہ جھپٹیں جیسے کالی آندھی آئے
ہرے بھرے کھیتوں پر جیسے ٹڈی دل آ کر چھا جائے
ٹینک چلیں گھڑ گھڑ گھڑ کرتے لوہے کے ہاتھی جھومیں
روسی کھیتوں اور شہروں میں توپیں منہہ کھولے گھومیں
اڑتی ہے بارود لہو کے دھرتی پر فوارے ہیں
لوہے اور فولاد کے گدھ آکاش پہ پنکھ پسارے ہیں
نبھ کو آگ کے شعلے چاٹیں لمبی لمبی جیبھ نکالے
رن میں دھوئیں کے اجگر ناچیں موٹے موٹے کالے کالے
بم کے گولے برسیں جیسے میگھ کے ساتھ میں اولے آئیں
ایسا بھیانک یدھ کہ جس میں لاکھ مہابھارت کھو جائیں
جنگل کے سب پنکھ پکھیرو اپنے گھونسلے چھوڑ کے بھاگیں
پھل کے بدلے پیڑ میں لٹکیں مزدور اور کسان کی لاشیں
کہتے کے پلّے نازی جن راج مٹانے آئے ہیں
دھنوانوں کا راج سنگھاسن پھر سے سجانے آئے ہیں
کھیتوں اور کھلیانوں میں وہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
نر ناری کو بندوق اور سنگین دکھاتے پھرتے ہیں
وہ زندہ بچوں کو جلا کر ہنستے ہیں اور گاتے ہیں
استریوں کے بالوں سے سونے قالین بناتے ہیں
لاشوں سے وہ کھاد بنائیں کھوپڑیوں میں دیپ جلائیں
ایسے کپوتوں کو جن کر جرمن کی مائیں بھی پچھتائیں
ظالم سمجھے اب کیا ہے اب اپنی رات اپنا دن ہے
لیکن وہ یہ بھول گئے تھے روس میں اک استالن ہے

آزادی کے لڑنے والو سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جسکے دم سے اجیاری ہے لینن کی
استالن نے حکم دیا اور سینا نکلی ویروں کی
میدانوں میں گونج اٹھی ہو نکار گرجتے شیروں کی
بادل گرجے، بجلی چمکے، نبھ میں پتاکا لہرائے
بھری ہوئی ندیوں کا پانی تٹ کو توڑ کے بڑھتا جائے
گولی بن کے کھیت سے نکلیں گیہوں، جندھری اور چنے
فیکٹری کی کوکھ ہلوں کے بدلے توپ اور ٹینک جنے
کانیں اپنا کوئلہ، لوہا، سیسا، تانبا لے کر دوڑیں
نازی جانور اس دیوار سے آکر اپنا ماتھا پھوڑیں
کوسک نکلیں، تاجک نکلیں، ازبک اور تاتاری بھی
لڑنے نکلیں جنگل پربت کھیتی اور پھلواری بھی
دولہنیں سیج کو چھوڑ کے سیدھی رن بھومی میں دوڑی آئیں
پوت کے انگ پہ مائیں اپنے ہاتھوں سے ہتھیار سجائیں
کھٹن کھٹن کھن کھانڈا باجے جھنن جھنن تلوار چلے
روکنے والا کوئی نہیں ہے کوسک کا جب وار چلے
توپ کے گولے پیچھے دوڑیں بھاگتی جرمن لاشوں کے
بندوقوں کی آنکھیں رن میں دل ڈھونڈھیں بدماشوں کے
آگے روسی پیچھے روسی، چار طرف روسی سینائیں
بھاگنا چاہیں بھی تو جرمن، روس کے باہر بھاگ نہ پائیں
منہ کے آگے لال سپاہی، پیٹھ کے پیچھے چھاپے مار
پاؤں تلے روسی دھرتی سر پہ استالن کی تلوار
اکھڑ گئے دشمن کے قدم، اور ہمت نے منہ پھیر لیا
ہٹلر کی سیناؤں کو والگا کے بھنور نے گھیر لیا

جیسے گھائل شیر دہاڑے پلٹ پڑا استالن گراد
جیسے بجلی ٹوٹ کے آئے جھپٹ پڑا۔استالن گراد
جیسے لال اگنی کا ساگر کھولے اور موجیں مارے
جیسے برسیں لوہے کے بادل سے دہکتے انگارے
ہوش اڑے ہاتھوں کے پیروں کے، آنکھوں کے کانوں کے
لال سپاہی جھپٹے اور پر ٹوٹ گئے طوفانوں کے
پاؤں کے نیچے فرش بچھا ہے دشمن نازی سینوں کا
اونچے سروں کے اوپر سایہ فولادی شاہینوں کا
رائفلیں ہیں ہاتھوں میں ہونٹوں پر نام ہے لینن کا
لال سپوتوں کے پہلو میں دل دھڑکے استالن کا
رنگ برنگے گولوں کی لہرائے دھنک اونچائی میں
یوون سے بھرپور امنگیں جھنڈوں کی انگڑائی میں
جلے ہوئے کھیتوں کی مٹی اڑ کر آئے پیار کرے
ندی کا پانی گود میں لے کر ان کو دریا پار کرے
چاروں اور گرج گرج توپیں للکاریں بڑھتے جاؤ
روسی جنتا کی لاشیں پیڑوں سے پکاریں بڑھتے جاؤ
خاک پہ پھیلے خوں کی لکیریں راہ دکھائیں بڑھتے جاؤ
اجڑے ہوئے گاؤں کی باہیں پاس بلائیں بڑھتے جاؤ
لندن اور پیرس کے دلوں سے آئیں صدائیں بڑھتے جاؤ
کان میں چیخیں بھری ہوئی دیوانی ہوائیں بڑھتے جاؤ
سینے میں کونپل بن کر پھوٹیں آشائیں بڑھتے جاؤ
نیلی نسوں میں خون کی بوندیں گیت سے گائیں بڑھتے جاؤ
بزدل نازی، بھاگتی فوجیں پیٹھ دکھائیں بڑھتے جاؤ
ہنستے ہنستے لوٹی جائیں گیتو شائیں بڑھتے جاؤ

کچھ بھی نہیں ہیں پربت ٹیلے، ندی نالے بڑھتے جاؤ
تم ہو سپاہی، تم ہو بہادر، تم ہو جیالے، بڑھتے جاؤ
کیا ہے مسولینی کی شکتی، کیا ہے ہٹلر بڑھتے جاؤ
ساری مانوتا کی نظریں آج ہیں تم پر بڑھتے جاؤ
ساتھ تمہارے دکھیاری ماؤں کی آہیں بڑھتے جاؤ
تم کو دعائیں دیتی ہیں زویا کی نگاہیں بڑھتے جاؤ
دیکھ رہا ہے تم کو اپنی قبر سے لینن بڑھتے جاؤ
تم پر نازاں روس، کرملن اور استالن بڑھتے جاؤ
رات کی سرحد ختم ہوئی، لو آ ہی گیا دن بڑھتے جاؤ
دیکھو دھوئیں اور دھند کے پیچھے وہ ہے برلن بڑھتے جاؤ

آزادی کے لڑنے والو سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جسکے دم سے اجیاری ہے لینن کی
یہ جنت کتنی محنت کتنی مشکل سے بنائی ہے
کتنا بڑا بلدان دیا ہے، کیا کٹھنائی اٹھائی ہے
کتنا دکھ اور درد سہا ہے روسی ماؤں سے پوچھو
راکھ ہوئے جل کر دل کتنے دل کی چتاؤں سے پوچھو
کتنا لہو دھرتی پہ بہا ہے یہ دھرتی بتلائے گی
دیکھنے والا ہو کوئی تو اپنے گھاؤ دکھائے گی
ان زخموں نے راکھشسوں سے مانوتا کو بچایا ہے
استالن کے سپوتوں نے انسان کا مان بڑھایا ہے
لال جوانوں ہی کے لہو سے آج یہ دنیا زندہ ہے
آج ہمارا اور تمہارا مستقبل تابندہ ہے
یورپ کی راتوں کے ماتھے پر بھی نور کا ہالا ہے
استالن کے اجیالے سے چین میں بھی اجیالا ہے

ان شاہینی آنکھوں سے ہم نے بھی نگاہیں پائی ہیں
کتنی راہیں استالن کی نظروں نے چمکائی ہیں
مکتی اپنے ہاتھ میں ہے انسان کبھی مجبور نہیں
ہم کو استالن نے بتلایا ہے، منزل دور نہیں
پونجی وادی دنیا لیکن آزادی سے ڈرتی ہے
استالن اور روس کے نام پہ ٹھنڈی آہیں بھرتی ہے
وہ انسان کی نیکی سے انساں کی خوشی سے ڈرتے ہیں
میٹھے دودھ سے بچوں کی معصوم ہنسی سے ڈرتے ہیں
انگریزی امریکی لڑائی کرنے والے اتیاچاری
ماؤں کے آنسو، انسانوں کے گرم لہو کے بیوپاری
پھر سے اب سنسار کے سر پر جنگ کی آفت لاتے ہیں
سونے اور چاندی کے گدھ لاشوں کے لیے منڈلاتے ہیں
استالن اور روس کی جانب دیکھتے ہیں غرّاتے ہیں
ایٹم بم کا نام بتا کر دنیا بھر کو ڈراتے ہیں
پہلے جرمن پگلائے، اب امریکی پگلائے ہیں
ہٹلر کے دن بیت گئے اب ان کے بھی دن آئے ہیں
برمی، ہندستانی، پاکستانی نیتا بھی اترائیں
یہ برساتی مینڈک بھی ڈالر کی برکھا میں ٹرّائیں
یہ بھاڑے کے ٹٹو ان پر جنگ کا بوجھا لادا جائے
یہ بندر اور بھالو ناچیں اور مداری ناچ نچائے
ایسے نیتا، حاکم، اٹیلی اور ٹرومن روز بنائیں
جیسے کھمبیلے کوڑے موتیں اور کُکرمتے اُگ آئیں
مجھکو بھلا کیا کام اٹھائی گیروں سے اور چوروں سے
بات میں کرنے آیا ہوں دہقانوں اور مزدوروں سے

مزدوروں میں کون ہے جو جنگی سامان بنائے گا
کون کسان استالن کے بیٹوں سے لڑنے جائے گا
کون سا ایسا باپ ہے جو اپنی آنکھیں ویران کرے
یدھ کی اگنی میں جلنے کو اپنے پوت کا دان کرے
کون سی ماں ڈائن بن کر بیٹے کے ہاڑ چبائے گی
اپنے دل کا ٹکڑا دے کر فوج کی پنشن کھائے گی
سامراج کا کتا بن کر جنگ میں جانے والا کون
مزدوروں کے خون سے چپڑی روٹی کھانیوالا کون
کوئی نہیں ہے ایسا پاپی، مزدور اور کسانوں میں
ایسے ہتیارے نہ ملیں گے سادھارن انسانوں میں
استالین محافظ ہے محکوموں کا مجبوروں کا
روس کا جنتا راج ہے سارے عالم کے مزدوروں کا
مزدور اور مزدور کے راج پہ وار کرے ناممکن ہے
اپنے دل پر آپ ہی اتیاچار کرے ناممکن ہے
دھن والے اپنی میّا پونجی کی ارتھی آپ اٹھائیں
ٹاٹا برلا اور پدم پت فوج میں بھرتی ہو جائیں
چاند کے منہ پر جو تھوکے گا، اس کے منہ پر آئے گا
جوالا مکھی پر چڑھنے والا جوالا میں بہہ جائے گا
روس پہ حملہ کر کے بچ جانے کی کوئی تدبیر نہیں
کوئی ان کو بتلا دو یہ روس ہے کچھ کشمیر نہیں

آزادی کے لڑنے والو سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جسکے دم سے اجیاری ہے لینن کی
پونجی کی پاپی دنیا میں جنگوں کی تیاری ہے
استالن کے باغ میں لیکن امن کا چشمہ جاری ہے

امن کی روٹی، امن کا پانی، امن کے نغمے امن کے ہار
امن کی کلیاں، امن کی خوشبو، امن کے بلبل اور گلزار
امن کی فصلیں اور بہاریں امن کا گیہوں، امن کا دھان
امن کا قانون ، امن کی شکتی، امن کا دستور اور ودھان
امن کا جادو پریم کے دل میں ، امن کا شہد نگاہوں میں
امن کی رچنا ہاتھوں میں اور امن کی قوت بانہوں میں
شہر اور قصبے امن و امان کی ہنستی ہوئی تصویریں ہیں
آنکھوں میں اب خواب نہیں ہیں خوابوں کی تعبیریں ہیں
انسانوں کی تقدیریں ہیں ہاتھوں میں تدبیروں کے
گونج رہے ہیں جنگل پربت گیتوں سے تعمیروں کے
تعمیروں کے راگ مشینیں اور ہتھوڑے گاتے ہیں
تعمیروں کے خواب مجسم ہو کر سامنے آتے ہیں
کھوج کسانوں کے گھر کی ہے ٹیلیفون کے تاروں کو
ایٹم شکتی موڑ رہی ہے دریاؤں کے دھاروں کو
ٹنڈرا میں اور ٹیگا میں تہذیب و تمدن بستے ہیں
اپنی بہاریں دیکھ کے ان کی آنکھ سے پھول برستے ہیں
علم کا دریا بہتا ہے، بڑھتا ہے ذوق کتابوں کا
پرتو جہل کی راتوں پر ہے حکمت کے مہتابوں کا
تند ہواؤں کی زد پر ہمت کی شمع فروزاں ہے
اپنے کام کی عظمت پر انسان کی محنت نازاں ہے
کہنے کو تو روس کے واشی مزدور اور کسان ہیں سب
علم و ہنر کے جاننے والے سائنس کے ودوان ہیں سب
شاعر، گیانی، وید، کلاونت اور گوالے ایک ہوئے
ذہنی اور جسمانی محنت کرنے والے ایک ہوئے

اُن کے اشاروں پہ سورج کی سرکش کرنیں کام کریں
بادل، بجلی، آندھی، طوفاں، سب جھک کر پہ نام کریں
منظر بدلے، موسم بدلے، بدلی چال ہواؤں کی!
ٹرکٹر اور مشینیں کیا ہیں؟ سکھیاں ہیں کنیاؤں کی!
شبنم کی شہزادی حکم چلاتی ہے انگاروں پہ
خاک کے ذرّے پھینک رہے ہیں اپنا جال ستاروں پہ
جنگ کی ڈائن، امن کو ہنستا دیکھ کے تھرّا جاتی ہے
کچی روئی کی خوشبو سے بارود کی بو گھبراتی ہے

آزادی کے لڑنے والو سنو کتھا استالن کی
سارے جگ میں جسکے دم سے اجیاری ہے لینن کی
مزدوروں کا لال استالن مزدوروں کا بیرن ہے
مزدوروں کا جیون ہی بس استالن کا جیون ہے
اسکا جیون گیہوں کے خوشوں میں روئی کے بالوں میں
ماں کے دل کی ممتا میں، بچوں کے مہکتے گالوں میں
اس کا جیون گہواروں میں، پریوں کے افسانوں میں
اس کا جیون خاک کے نیچے، کونپل بنتے دانوں میں
اسکا جیون پہیوں کی گردش میں دلوں کی دھڑکن میں
ازبک کھیت میں، تاجک گھر میں، قفقازی پیراہن میں
اسکا جیون باکو اور باطوم کے تیل کے چشموں میں
اسکا جیون لہراتی شاخوں میں ہوا کے نغموں میں
اسکا جیون انسانوں کی آشاؤں میں خوابوں میں
اسکا جیون ہنستی پلکوں گاتی ہوئی مضرابوں میں
اسکا جیون چک چی اور کریا کی ماہی گیروں میں
اسکا جیون انگوروں میں سیبوں میں انجیروں میں

اسکا جیون ہند میں ہے ایران میں ہے اور شام میں ہے
اسکا جیون جنتا کی آزادی کے سنگرام میں ہے
وہ صرف اک انسان نہیں ہے اک بڑا سنسار ہے وہ
ایٹم بم کی اس دنیا میں شانتی کا آدھار ہے وہ
استالن اک پیڑ ہے جس کی چھایا بڑھتی جاتی ہے
اس چھایا میں دکھ کی ماری مانوتا ستاتی ہے
استالن اک ندی جو پیاسی مٹی کو سیراب کرے
اک ایسی برکھا جو ساری دھرتی کو شاداب کرے
ہم نے استالن کے دل سے جینے کا ارمان لیا
استالن سے شکتی لی ہے، استالن سے گیان لیا

روس کی آنکھوں کا تارا ہے دنیا بھر کا سہارا ہے
ہم سب ہیں استالن کے اور استالین ہمارا ہے
استالن کی طرح لڑیں استالن جیسے کام کریں
اپنے نیتا استالن کو اٹھ کر لال سلام کریں!

دسمبر 1948

امن کا ستارہ

ایک شاعرانہ تقریر!

میرا آدرش انسان ہیں
وہ مرا دین وایمان ہیں
ان کے ناموں سے اخبار و تاریخ واقف نہیں
ان کے ماتھوں پہ عظمت کی کلغی نہیں
سر پہ ادبار ہے
پیٹھ پر بوجھ ہے
ان کو شہرت کی کوئی ہوس ہے
نہ عزت کی خواہش
نہ انعام واکرام کی جستجو
وہ ہوا کی طرح صاف دل
پانی کی طرح پاکیزہ
سورج کی پہلی کرن کی طرح گرم دل
پھول کی طرح خاموش
دریاؤں کی طرح فیاض
اور پیڑ کی پتیوں کی طرح ان گنت

سادگی اور ایمانداری سے دن رات محنت میں مصروف ہیں
زندگی ان کی دن رات کی گردشوں کے سوا کچھ نہیں
ان کے کاندھوں پہ بھاری ملیں اور مشینیں پہاڑوں کی مانند رکھی ہوئی
ریل کی پٹریاں ان کے سینوں پر لیٹی ہوئی
گرم بجلی کے تار ان کی نیلی رگوں سے گزرتے ہوئے
اور ان کے لہو کی دہکتی ہوئی سرخ بانات پر
جنگ، غارتگری، لوٹ اور حکمرانی، جلوسوں کی صورت میں چلتی ہوئی

میں اسی سیدھے سادھے غریب اور مجبور انسان کا دردمند
اس کی آشاؤں، اس کی تمناؤں کا ترجمان
اس کے خوابوں کی تعبیر کا رازداں
اپنے جوش عقیدت، خراج محبت کو لیکر چلا ہوں *

(2)

یہ زمیں رہنماؤں سے اور سورماؤں سے خالی نہیں
زندگی اور سماج انقلاب اور تغیر کے گہواروں میں جھولتے آئے ہیں
وقت و تاریخ کے دل پہ طبقات کی کشمکش زلزلے بن کے چلتی رہی
انقلابات جوالامکھی بن کے پھٹتے رہے
آدمیت سنبھلتی رہی اور گرتی رہی
اور گر کر سنبھلتی رہی
ورگ سنگھرش لڑتی رہی
زندگی اپنے اوراق الٹتی رہی
رہبری اور پیغمبری، زرگری، اور جادوگری

---

*اس نظم کے کچھ بند سردار جعفری نے اپنے ہاتھوں سے کاٹ دیے تھے۔ اس لیے اسے شامل کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

شعبدے اور تماشے دکھاتی رہی
آدمیت کے پیروں کی زنجیریں گلتی رہیں اور ڈھلتی رہیں
قید خانوں کے نام اور غلامی کی شکلیں بدلتی رہیں
سورما اور ساونت آتے رہے
اپنے طبقات کے خادم اپنے مفادات کے پاسباں
رہنما اپنے جلوے دکھاتے رہے
ان میں سے کوئی بھی کُل کی کُل نوعِ انساں کا خادم نہ تھا
کوئی انساں کا رہبر نہ تھا
کیوں کہ انسان ابھی زیرِ تخلیق تھا
اور بس نیم خلاق آتے رہے
اور پھر ایک دن
ساری دنیا نے دیکھا کہ انساں کی تخلیق تکمیل کی منزلوں کے قریب آ گئی
اس نے طبقات کی بندشیں توڑ دیں
وہم کی انگلیاں موڑ دیں
اک نئی راہ پر گامزن ہو گیا
اب غلام اور آقا کی تقسیم باقی نہ تھی
کاشتکار اور زمیندار
سرمایہ دار اور مزدور کا
فرق باقی نہ تھا
اور انسان انسان تھا
صرف انسان تھا
اپنی تخلیق پر مطمئن
اپنی محنت پہ نازاں
مشترک درد و غم، مشترک ہر خوشی
مشترک نعمتیں، مشترک زندگی

3

تخت اور تاج کانپے، محل ہل گئے
ذرے اپنی جگہ سے اٹھے اور خورشید بن کر چمکنے لگے
اور چٹانیں پہاڑوں کے سینے سے نیچے اترنے لگیں
لال گارد میں تبدیل ہونے لگیں
کھیت مزدوروں نے بیلچے لے لیے
کارخانوں سے ہڑتالیں باہر نکل گئیں
اور آندھیوں کی طرح
رہگزاروں پہ چلنے لگیں
جنتا فوجوں میں اور فوجیں جنتا میں ملنے لگیں

مارکس نے قبر سے اٹھ کے دنیا کو پیغمبرانہ نگاہوں سے دیکھا
سارے یورپ پہ اک خوف طاری تھا
پیرس پہ ہیبت تھی
لندن پہ لرزہ
روس میں جشن، دنیا کے محنت کشوں میں خوشی
اور وہ خواب جو اب تلک خواب تھا
اک چھٹے کرۂ ارض پر چھا گیا
زندگی پر نیا بانکپن آ گیا

4

اے زمیں فخر کر
اے عروس جہاں مسکرا
روح تاریخ اپنی جبیں سے اندھیرے کی زلفیں ہٹا
خاک پر بسنے والو

آنچ سے سر اٹھا کر چلو
بے بسو بے کسو وقت کی باگ کو تھام لو
بھیک کے ٹھیکرے پھینک دو
جسم کے چیتھڑے پھونک دو
اب تم آزاد ہو
تاجک اور ازبک اپنی زبانوں میں باتیں کریں
ترکمان اپنے حرفوں میں اپنی کتابیں پڑھیں
ارمنی اپنی رنگین پوشاک پہنیں
کوسک اپنے حسین گیت اپنے سروں اپنی آواز میں ڈھال لیں
کال مک اپنے پیڑوں کے سائے میں ناچیں
زار شاہی

وہ مظلوم و محکوم قوموں کی قاتل
فنا ہو گئی

روس آزاد ہے روس کی قومیں آزاد ہیں
سوویت یونین مختلف رنگ پھولوں کا اک ہار ہے
پھول انسانیت اور محبت کے پھول
وہ سمرقند کے باغ میں یا بخارا کے گلشن میں مہکیں
ماسکو، یوکرین، اور یورال میں اپنی خوشبو بکھیریں
سائبریا کے دل میں کھلیں
یا بدخشاں کے رخسار پر مسکرائیں
پھول پھر پھول ہیں
خوبصورت، مہکتے ہوئے
ان کے ہر رنگ میں اک نیا حسن، ہر پنکھڑی میں نئی تازگی

سوویت یونین کے جواں بخت محنت کشو

آج سے تم ہی اس ملک کے حکمراں
تم ہی اس خاک کے پاسباں
محنت آزاد، تخلیق آزاد ہے
اب تمھارا لہو بھی تمہارا
رگیں بھی تمھاری
ملیں بھی تمھاری
اور یہ پھیلی ہوئی زمیں بھی تمھاری ہے جو
اپنے مضبوط شانوں کے اوپر افق کو اٹھائے ہوئے ہے
تم وہ سورج ہو جس سے نئے عہد کی ابتدا ہو رہی ہے
ساری دنیا کے محنت کشوں کی نگاہیں تمھیں دیکھتی ہیں
اور زمیں
اپنے محور سے ہٹ کر
تمھارے ہی سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے
وقت اب سے تمھاری ہی رفتار کا نام ہے
اب نئے ہفتے ہوں گے
نئے دن بنیں گے
نئے ماہ و سال آئیں گے
پھل تمھاری ہی کرنوں سے
رنگ اور رس لیں گے
فصلیں تمھاری ہی گرمی سے
پھولیں پھلیں گی۔

کھیت مزدورو، بھوکے کسانو،
وہ زمیندار اور ان کی سرکار باقی نہیں
اپنی دھرتی پہ اپنا نیا راج قائم کرو!

رائفل لے کے اپنے گھروں کی حفاظت کرو
اپنے کھیتوں کی سرحد افق تک بڑھا دو
اپنے کھلیانوں کی چوٹیاں آسماں سے ملا دو
اب تمھارے اگائے ہوئے ناج کا
دانہ دانہ لہو اور آنسو سے بھی قیمتی
سوویت یونین کو
یہ کھیتوں میں ڈھالی ہوئی
گولیاں چاہئیں

شاعرو، عالمو اور دانشورو
آج سے روح و دل، ذہن و افکار آزاد ہیں
ساز آزاد ہیں، گیت آزاد ہیں
اور تم اپنی دانش فروشی کی لعنت سے آزاد ہو
گاؤ اپنے دلوں کے ترانے
اپنے آزاد ملک اپنی آزاد محنت کے افسانے لکھو
''تم تو انسان کی روح اور دل کے معمار ہو''
''تم نہ گاؤ گے تو فوجیں آگے نہ بڑھ پائیں گی''
انقلابی صفیں مورچے سر نہ کر پائیں گی

عورتو اپنے چہروں سے اپنی نقابیں الٹ کر چلو
تنگ و تاریک باورچی خانوں سے نکلو
آج سے حسن آزاد ہے
سوویت راج میں چوڑیاں ہتھکڑی بن نہیں پائیں گی
اب تمھیں بھیڑ اور بکریوں کی طرح بیچنا جرم ہے
تم کنیز اور لونڈی نہیں
ماں ہو، بیٹی ہو، بیوی ہو، محبوب ہو،

دردِ اور دکھ کی ساتھی
اب سے تم گھر کی شہزادیاں
شہر اور گاؤں کی رانیاں
علم و حکمت کے در اپنی مشتاق آنکھوں کو کھولے ہوئے
اور دانش کدے اپنی بانہوں کو پھیلائے ہیں
اور سماج اور جیون
تمھاری لطافت
تمھاری محبت کے پیاسے
تمھارے لیے منتظر ہیں

بچو، یہ پارک، اسکول، باغات، یہ پالنے اور جھولے تمھارے لیے ہیں
چڑیاں اب سے تمھارے لیے گائیں گی
تتلیاں دور سے اڑ کر آ جائیں گی
چاند تارے تمھارے لیے ناچیں گے
اور ہوائیں کہانی کہیں گی
چاہے کل سوویت میں اندھیرا رہے پر تمھارے لیے روشنی آئے گی
چاہے کل روس بھوکا رہے پر تمھارے لیے دودھ کی نہر لہرائے گی
کھیلو اپنے کھلونوں سے کھیلو
ماں کی بانہوں میں جھولو
باپ کی گود میں کھلکھلاؤ
اب تمھیں گرنیاں اور کانیں نگلنے نہیں پائیں گی
اب تمھارے جھکتے ہوئے سر پہ لینن کا شفقت بھرا مہرباں ہاتھ ہے
اب تمھارے کھلونے چرائے نہیں جائیں گے

ساری دنیا کی قومو سنو،
اپنے دل کے لہو میں بھگوئی ہوئی روٹیاں کب تلک کھاؤ گے

سامراجی لڑائی کا جوا لاٹھی پاٹ دو
جنگ کی سازشوں کی رگیں کاٹ دو
سوویت یونین دوستی کے لیے ہاتھ پھیلا رہا ہے
امن ہر قوم کے واسطے
امن ہر ملک کے واسطے
امن ہر آدمی کے لیے
شانتی زندگی کے لیے

5

آج پیرس کے باغات سرسبز
انگور کی بیلیں شاداب
برطانوی میوزیم پھر سے آباد ہے
ڈارون اور ملٹن کے چہروں پہ عظمت
کتابوں کے ماتھوں پہ سنجیدگی
بائرن، کیٹس، شیلی کے نغمات آزاد ہیں
روس نے چیخف اور طالسطائی کی توہین برداشت کی
اپنی تہذیب کو جلتے دیکھا
ان کے دل رو دئے اور آنکھیں لہو ہو گئیں
سینے جلنے لگے
اور وہ ہاتھ
جن میں اب تک فقط ساز تھے
رائفل پر لپکنے لگے

ہٹلری فوجیں طوفان کی طرح اٹھی تھیں اور آندھیوں کی طرح آئی تھیں
آخرش روس کی خاک پر سرنگوں ہو گئیں

برف میں کھو گئیں
آنکھیں آکاش کو تک رہی ہیں
ٹھیکروں کی طرح ان کے تمغے زمین پر پڑے ہیں
ان کے چہرے غضبناک تھے۔
ہاتھ سفاک تھے
انگلیاں عورتوں اور بچوں کی گردن دبانے میں مشاق، لاشوں سے
کپڑے چرانے میں استاد تھیں
اور وہ روسی خزاں کی ہواؤں میں سوکھی ہوئی ٹہنیوں کی طرح جھڑ گئیں
آج حافظ کے محبوب شیراز کی خاک تابندہ ہے
اور خیام و سعدی کی قبروں پہ پاکیزگی کے گھنے سائے ہیں
اور فردوسی کے شاہنامے کے اوراق انسان کے خون سے پاک ہیں
ہند میں تاج کا عکس جمنا کی لہروں سے اٹھکھیلیاں کر رہا ہے، مدورا کے
مندر سرفراز ہیں
اور اجنتا کی شہزادیاں اپنی ٹھنڈی گپھاؤں میں سوئی ہوئی
اپنے صدیوں کے خوابوں میں کھوئی ہوئی ہیں
سوویت یونین کے جوانوں نے اپنا لہو دے کے ان کو بچایا
اس تباہی کی بڑھتی ہوئی آگ کو
سوویت ماؤں کے آنسوؤں نے بجھایا
ہم اس احسان کو بھول سکتے نہیں

وہ جو نازی درندوں اور ایران کے بیچ میں آ کے حائل ہوا
لینن ہاتھ تھا
وہ جو ہٹلر کی فوجوں کے رستے میں دیوار بن کر کھڑا ہو گیا
لینن کا جسم تھا
جس نے اس آگ، بارود کے تند سیلاب کو غرق خود اسکے ہی خون میں کر

دیا
لینن کا شہر تھا
جس نے سنسار کو امن اور شانتی بخش دی
لینن کا وار تھا

ساتھیو
اب بھی یہ آہنی ہاتھ دھرتی کے سینے پہ اک ڈھال کی طرح رکھا ہوا ہے
ہر نئے ملک میں اس کی رنگت بدل جاتی ہے
نام تبدیل ہو جاتا ہے
سوویت یونین اسے کاتیا اور بیشا بھی کہتے ہیں، ہندوستان میں محمد،
ہری، اور کراچی میں محبوب، مقبول، لاہور میں فاطمہ، چین میں لی،
ہزارے میں گلباز، یونان میں مارکو
یہ جہاں بھی ہو لینن ہاتھ ہے
رنگ اور نام بدلے ہوئے ہیں لہو ایک ہے
اور وہ سورج ہے
اور اس آہنی ہاتھ کو کوئی ایٹم کا بم توڑ سکتا نہیں

6

روس کی سرحدوں کی کوئی حد نہیں
ملک اور سلطنت کی حدیں وادیوں، ندیوں اور پہاڑوں تلک
قوم کی سرحدیں صرف تاریخ و نفس و معاش و زبان و تمدن تلک
لیکن انسان کی کوئی سرحد نہیں
سوویت یونین کی حدیں
وادی و دشت و کہسار کو توڑ کر خود دلوں سے گزر جاتی ہیں
اور نیو یارک کے کارخانوں میں، لندن کے بجلی گھروں میں، کناڈا کے

کھیتوں میں
بنگال کے جھونپڑوں اور نئی دہلی کے دفتروں میں بکھر جاتی ہیں
ساری انسانیت ایک ہے
چین کے آتش افروز رخسار سے
خون آلودہ یونان کے چاک قلب وجگر تک
میکسکو اور اسپین کی رات سے
ہنگری اور رومانیہ کی سحر تک
سوویت یونین کے طرب زار سے
ہندوایران کے آنسوؤں تک
حبشیوں کی سلگتی ہوئی روح سے
ویتنام اور برما کی بپھری ہوئی بجلیوں تک
ساری انسانیت ایک ہے
کرۂ ارض بھی ایک ہے
کائنات ایک ہے
اور وہ جہد و پیکار بھی ایک ہے
جس کا ہر مورچہ روح اور دل کی دیوار ہے
اپنا درد ایک ہے، اپنا غم ایک ہے
ایک اپنی مسرّت، مسرّت کے خواب
اور خوابوں کی تعبیر بھی ایک ہے
امن، انسانیت، زندگی، قہقہے
علم، حکمت، ہنر، شاعری،
راگنی، پھول، بچے، محبت، بہاریں

کچھ بہاریں جواں ہو چکی ہیں
کچھ ابھی نوشگفتہ شگوفوں کے آغوش میں پرورش پا رہی ہیں

پچھ ابھی زیر تخلیق ہیں
ہم ان اپنی بہاروں کو انسان کے خون میں غرق ہونے نہ دیں گے
جنگ کی سازشیں کرنے والوں کو ہم
اپنی لاشوں کے اوپر گزرنے نہ دیں گے
ہم شعاعوں کی مانند دنیا میں بکھرے ہوئے
آسماں کی طرح ساری دھرتی پہ چھائے ہوئے
فصلِ گل کی طرح شاخ در شاخ پھیلے ہوئے
اپنی دھرتی سے صدیوں کا بارِ گراں پھینک دینے کو تیار ہیں
بولو تم اپنے ایٹم کے بم کس پہ برساؤ گے
بولو امریکی برطانوی بدمعاشو لٹیرو
ماسکو ماسکو میں نہیں
خود تمھارے ہی شہروں میں ہے
خود تمھارے گھروں اور باورچی خانوں میں ہے
تیسری جنگ کی کوکھ میں ایک جنگ اور ہے

7

خوش ہوا اے سرزمینِ وطن، میرے ہندوستاں
تیری سرحد پہ اک دیس ہے
ارضِ کشمیر کی مسکراتی بہاروں کے اس پار ہنستی بہاروں کی دنیا
تاجکستان اور ازبکستان کی سرزمیں
اور اس سے پرے کوہ قفقاز رومان انگیز ہے
وادیاں زندگی بخش ہیں
برف کی چوٹیاں حوصلہ آزما
خواب آور صنوبر کے سائے
جن کی ٹھنڈی ہوا میں تمارا کی دلکش جوانی نے انگڑائی لی

رُشت دہلی نے حسن اور شجاعت کے افسانے گائے
نظامی نے نغمات کے پھول برسائے
خاقانی نے اپنے اشکوں کے موتی بکھیرے
میرے بچپن نے قفقاز کی سرخ اور سبز پریوں کے قصے سنے
جن سے میرا تخیل ابھی تک پری خانہ ہے
ان کی پیشانیاں برف کی
آنکھیں نیلم کی
اور ہونٹ یاقوت کے
شاہزادوں کی عاشق۔
لیکن اب کوہ قفقاز کی گود میں ایک پری اور ہے
اس کے شانوں پر فولاد کے پر ہیں، بالوں میں بجلی کی لہریں
یہ نئی زندگی، اشترا کی حقیقت ہے جو شاہزادوں کی عاشق نہیں

اگلی صدیوں میں اس دیس سے
تاجکستان اور ازبکستان کی سرزمیں سے
صرف فاتح یہاں آتے تھے
لیکن اب مغربی کوہساروں کے اس پار سے
سوویت دیس سے
جس کو کوہ ہمالہ کے شاہین اپنی بلندی پہ بیٹھے ہوئے رشک سے دیکھتے ہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلی آ رہی ہیں
اور خبریں بہاروں کی پوشاک پہنے ہوئے
نرم گیہوں کے خوشوں، روئی کے شگوفوں سے پیشانیوں کو سجائے ہوئے
اپنے ہاتھوں پہ علم اور حکمت کی شمعیں جلائے ہوئے
اور محبت کے پیغام ترسون زادے کی آواز میں
اور لینن کا جوشِ عمل

ایلیا اور فدائیف کی روح کی گرمیاں
مایا کاؤسکی اور تخوناف کے زمزمے
گورکی کے محبت بھرے دل کی بیتابیاں
جو مہکتے ہوئے نرم اور صاف کاغذ کے سینے پہ الفاظ بن کر اُبھر آئی ہیں

آسماں نیلگوں ہے
زمیں سبز ہے
اور افق سرخ ہے
قید خانوں کے دیوار و در صرف مٹی کا اک ڈھیر ہیں۔
پھانسیاں سرنگوں
نوجوانوں کے ہاتھوں میں بندوق پستول اور تازیانے نہیں
پھول ہیں، ساز ہیں، جام ہیں
کس قدر خوبصورت ہیں وہ ہاتھ وہ انگلیاں
جن کی پوروں سے مال اور دولت کی گنگا رواں ہے
کتنے شاداب چہرے ہیں
کتنے حسین ہونٹ ہیں
کتنی تابندہ پیشانیاں
کتنی بھرپور ہیں کھیتیاں
جن کے سینے پہ ہل بیل بوٹے بناتے ہوئے چل رہے ہیں
بجلیاں خرمنوں کی حفاظت پہ مامور ہیں
روٹیاں سرخ ہونٹوں کے بوسوں سے سرشار ہیں
لڑکیاں گا رہی ہیں
بچے ماؤں کی گردن میں باہوں کو ڈالے ہوئے ہنس رہے ہیں
اور اپنے وطن کے شہیدوں کے خوابوں کی تعبیر سے کھیلتے پھر رہے ہیں۔

8

وہ جو اس سرخ دستے کا سالار ہے
زار شاہی کے اک کھیت مزدور کا لال ہے
اس کی ماں نے اسے اصطبل میں جنا تھا
اور یہ نوعمر لڑکی جو اب انقلابی عدالت کی کرسی پہ ہے
یا وہ دوشیزہ جو اک ٹریکٹر پہ بیٹھی ہوئی ہے
اس کی ماں چند روبل میں بیچی گئی تھی
اور وہ سائنس داں جس کے سینے میں ایٹم کی قوت کا ہر راز محفوظ ہے
ایک فولاد کے کارخانے میں مزدور تھا
اور یہ شاعر کبھی زار کی جیل میں قید تھا
جسم پر اب بھی کوڑوں کے نیلے نشاں ہیں
یہ نئی زندگانی کے معمار ہیں
ان کے سینوں میں شیروں کے دل
ان کے ہاتھوں میں مزدور کی انگلیاں
ان کے ماتھوں پہ لینن کے ماتھے کا نور
ان کو انسانیت کے گلے کاٹنے، خوں بہانے کی فرصت نہیں
یہ پہاڑوں کے سینوں کو برما رہے ہیں
زمیں کی تہوں کو الٹنے میں مصروف
دریاؤں پر پل بنانے میں مشغول ہیں
ان کو بمبار اور ٹینکوں سے زیادہ عزیز اپنے ہل ہیں
ان کو جنگی محاذوں سے نفرت ہے اور تھیٹروں سے محبت
یہ لہو دیکھنا بھی نہیں چاہتے
ان کو زخموں سے رغبت نہیں
یہ بنفشہ کے پھولوں صنوبر کے سایوں کے عاشق

تلسی داس اور فردوسی کی شاعری کے پرستار، رے فیل، لیونارڈو
مائیکل انجلو کے پریمی
یہ تھوون کے گیتوں میں کھو جانے والے
تاتیانا کی الھڑ محبت پہ رو دینے والے
شیریں فرہاد کی داستان محبت کو اپنی محبت بنا لینے والے
سوویت یونین کے سپوت
ان کو لینن نے پیدا کیا اور امنگوں نے پالا
اور اس رہ پہ چلنا سکھایا جسے آج دنیا کی ہر قوم اپنا رہی ہے

9

سوویت یونین کی بہاروں کی جے
آبشاروں کی جے، برق پاروں کی جے
دل بروں، گل رخوں، مہ جبینوں کی جے
آنچلوں، دامنوں، آستینوں کی جے
سوویت ماؤں کے گرم سینوں کی جے
ماؤں کے دودھ کی پاک دھاروں کی جے
پارکوں، پالنوں، گاہواروں کی جے
دودھ پیتے ہوئے نونہالوں کی جے
بلبلوں، تتلیوں اور غزالوں کی جے
نیلی جھیلوں، بنفشہ کے پھولوں کی جے
دل کی پینگوں، محبت کے جھولوں کی جے
دودھ، شہد اور پانی کے پیالوں کی جے
چاولوں، روٹیوں اور نوالوں کی جے
حسن کی نرم خاموش نظروں کی جے
دوب پر نرم شبنم کے قطروں کی جے

کاشتکاروں کی جے، کامگاروں کی جے
ابرِ دولت کی ٹھنڈی پھواروں کی جے
انجنوں پٹریوں اور ریلوں کی جے
سیب کے پیڑوں انگور کی سبز بیلوں کی جے
میوزیم کی، کتب خانوں کی، اسپتالوں کی جے
علم و حکمت کی جے، باکمالوں کی جے
کوئلے اور لوہے کی کانوں کی جے
سرخ قوموں کی میٹھی زبانوں کی جے
والگا اور قفقاز کے پاسبانوں کی جے
برف کے نیچے سوتے جوانوں کی جے
شاعروں کے ترانوں کی جے
لیکھکوں کے فسانوں کی جے
امن اور شانتی کے لیے لڑنے والوں کی جے
مسکراتے ہوئے ہونٹ ہنستے ہوئے سرخ گالوں کی جے
حریت کے چمکتے شرارے کی جے
امن کے جگمگاتے ستارے کی جے

دسمبر 1948

بیرونی ناموں کی تشریح

ایلیا پورا نام ایلیا اہرن برگ ہے۔ سوویت یونین کا عظیم ناول نگار اور ادیب جو سب سے بڑی ادبی عزت استالن انعام حاصل کر چکا ہے

ازبک سوویت یونین کی ایک قوم جو کشمیر کے پچھم اور ایران کے اتر میں آباد ہے۔

باطوم بحر اسود کے مشرقی ساحل پر ایک شہر جو تیل کے چشموں کے لیے مشہور ہے

باکو بحر کیسپین کے مغربی ساحل پر ایک شہر جو تیل کے چشموں کے لیے مشہور ہے

بخارا ازبکستان کا ایک مشہور شہر جسے تاریخی عظمت حاصل ہے

بدخشاں تاجکستان کے مشرق میں ایک شہر، اسے بھی تاریخی شہرت حاصل ہے

بائرن انیسویں صدی کا رومانوی انگریزی شاعر

بتھوون انیسویں صدی کا عظیم جرمن موسیقار

بُخارِن روسی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا جس نے لینن کے اصولوں اور سوویت یونین سے غداری کی، سازش میں پکڑا گیا، اور موت کی سزا ملی۔

بیری کیڈی سڑک پر راستہ بند کر کے مورچہ بنانا تاکہ دشمن کے سپاہی آگے نہ بڑھ سکیں۔ یہ مورچے ہر انقلاب کے وقت بنتے ہیں۔

تاتیانا روس کے کلاسیکی شاعر پشکن کی سب سے مشہور نظم 'یوجین آنے گن' کی ہیروئن۔ تاتیانا کا کردار، روسی عورت کی سادگی، خلوص اور محبت کی سچی تصویر سمجھا جاتا ہے۔

تاجک سوویت یونین کی ایک قوم جو کشمیر کے پچھم اور ایران کے اتر میں آباد ہے۔

تخوناف سوویت یونین کا مشہور شاعر

ترسون زادہ تاجکستان کا مشہور شاعر جو ہندوستان بھی آیا تھا، اس نے ہندوستان پر ایک طویل نظم فارسی میں لکھی ہے جس پر اس کو استالن انعام ملا ہے۔

ٹرانسکی روسی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا جس نے لینن کے اصولوں اور سوویت حکومت سے غداری کی، اس کی غداری کا سلسلہ انقلاب سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔

تمارا جیارجیا کی ملکہ کا نام جس نے بارہویں اور تیرہویں صدی میں حکومت کی۔ اس کا دور

	جیارجیا کی تہذیبی ترقی کے لیے مشہور ہے۔
ٹنڈرا	روس کے شمالی علاقے کے وسیع برفستان۔
ٹیگا	روس کے شمال اور ٹنڈرا کے جنوب میں پھیلے ہوئے ہزاروں میل لمبے جنگل جن کے بعض حصوں میں انقلاب سے پہلے کسی انسان نے قدم نہیں رکھا تھا، وہاں کے باشندوں کی ترقی کئی ہزار برس پہلے رک گئی تھی اور انقلاب روس کے وقت پتھر اور لوہے کے دور میں تھے۔ انقلاب نے انہیں براہ راست اشتراکیت کے دور میں داخل کر دیا۔ وہاں کی ننائی قوم سب سے زیادہ مشہور ہے۔
چک چی	سوویت یونین کے شمال مشرقی برفستانی علاقے کی ایک چھوٹی سی قوم اس کا حال بھی ٹیگا کے باشندوں کا سا تھا۔
چیخف	روس کی آخری انیسویں صدی کا عظیم افسانہ نگار جس کی یادگاروں کو جرمن نازیوں نے تباہ کرنے کی کوشش کی۔
حافظ	ایران کا عظیم کلاسیکی شاعر (چودھویں صدی)
خاقانی	سوویت آذربائیجان کا کلاسیکی شاعر جس نے فارسی زبان میں شاعری کی ہے (بارہویں صدی) اس کا باپ بڑھئی تھا اور ماں کنیز، شیرواں شاہ نے اس کو قید کر دیا تھا، جہاں اس نے اپنی سب سے شاندار نظم کہی۔
خیام	ایران کا کلاسیکی شاعر (تیرہویں صدی)
ڈارون	انیسویں صدی کا انگریز سائنس داں جس نے انسان کے ارتقاء پر عظیم الشان کام کیا ہے۔
ڈان	ایک مشہور روسی دریا کا نام اور اس کے آس پاس کے علاقے کا نام جس میں کوسک قوم آباد ہے۔
ڈینکن	ایک سفید روسی فوجی افسر، جس نے روسی انقلاب کے خلاف دنیا کو سامراجیوں کے ساتھ مل کر فوجی مداخلت میں حصہ لیا۔
رستاویلی	اپنے وطن جیارجیا کا قومی شاعر (بارہویں صدی) جو ملکہ تمارا کے عہد میں تھا۔ اس نے جیارجیا کی آزادی اور شجاعت کے گیت گائے ہیں۔
رفیئل	اطالیہ کا کلاسیکی مصور۔

رینگل ایک سفید روسی افسر جس نے ڈینکن کی طرح روسی انقلاب کے خلاف دنیا کے سامراجیوں کے ساتھ مل کر فوجی مداخلت میں حصہ لیا۔

زویا روسی چھاپہ مار لڑکی جسے جرمنوں نے پھانسی دے دی، وہ ساری آزاد دنیا کی ہیروئن ہے۔

سعدی ایران کا کلاسیکی شاعر۔

سیزر اطالیہ کے دورِ غلامی کے حکمرانوں کا خطاب۔

سمرقند ازبکستان کا مشہور شہر جسے تاریخی عظمت حاصل ہے۔

شیلی انیسویں صدی کا رومانی انگریزی شاعر، بائرن کا ہم عصر۔

طالسطائی انیسویں صدی کے روس کا عظیم ناول نگار جس کی یادگاروں کو جرمن نازیوں نے تباہ کرنے کی کوشش کی۔

فدائیف سوویت یونین کا عظیم ناول نگار جسے استالن انعام مل چکا ہے۔

فردوسی ایران کا شاعرِ اعظم۔ شاہنامہ کا مصنف (دسویں صدی)

قفقار سوویت یونین کے جنوبی علاقے میں بحر اسود اور بحر کیسپین کے درمیان پہاڑی سلسلہ جو کہانیوں میں کوہ قاف کے نام سے مشہور ہے۔ استالن کا وطن جیارجیا اسی پہاڑی کے دامن میں ہے جس سے ملی ہوئی آرمینیا اور آذربائیجان کی سوویت کی ریپبلکیں ہیں۔

کاکیشس قفقار کا انگریزی نام۔ کالمک سوویت یونین کی ایک قومیت۔

کیتوشا یہ لفظ استالن کتھا کے اس مصرعے میں استعمال ہوا ہے ''ہنستے ہنستے لوٹی جائیں کیتوشائیں بڑھتے جاؤ'' یہ روس میں لڑکیوں کا بڑا مقبول اور عام نام ہے اور سوویت کے ہر دل عزیز شاعر ازاکافسکی کی ایک نظم کا کردار بھی ہے۔ زمانۂ جنگ میں اس نظم کی مقبولیت کی وجہ سے سوویت یونین نے اپنی ایک نئی قسم کی توپ کا نام کیتوشائیں رکھ دیا تھا، یہ کیتوشائیں سرخ فوج کو بہت پیاری تھیں لیکن جرمن نازیوں کا دم نکلتا تھا۔

کریاک چک چی علاقے میں آباد دوسی ہی ایک چھوٹی سی قوم۔

کوسک ڈان کے علاقے میں آباد قوم کا نام، اس قوم کے لوگ بڑے رومانی اور جنگ جو ہوتے ہیں۔

کولچک ایک سفید روسی افسر جس نے ڈینکن اور رینگل کی طرح روسی انقلاب کے خلاف سامراجیوں کے ساتھ مل کر فوجی مداخلت میں حصہ لیا۔

کولک امیر کسان جو دیہات کا بورژوا ہوتا ہے۔ یہ روسی زبان کا لفظ ہے۔

کیٹس انیسویں صدی کا رومانی انگریزی شاعر، بائرن اور شیلی کا ہم عصر۔

گلوٹین ایک طرح کا مشین سے چلنے والا گنڈاسا جو انقلاب فرانس (1789-93) کے وقت غداروں کا سر کاٹنے کے لیے استعمال کیا گیا۔

گورکی میکسم گورکی سوویت کا سب سے بڑا انقلابی افسانہ نگار اور ادیب جس نے اشتراکی حقیقت نگاری کی بنیاد ڈالی۔ 1936ء میں انتقال ہوا۔

لائی سنکو سوویت یونین کا مشہور سائنس دان جس نے اپنے مادی نظریات کی مدد سے حیاتیاتی علوم میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ حاصل کی ہوئی خصوصیات نسلوں میں منتقل کی جا سکتی ہیں۔ اس سے پودوں اور جانوروں کی بہتر قسمیں پیدا ہو رہی ہیں۔

لوئی فرانس کا بادشاہ جسے انقلاب فرانس کے وقت گلوٹین پر چڑھا دیا گیا۔

لیونارڈو لیونارڈو ڈی ونچی۔ اطالیہ کا کلاسیکی مصور۔

مایاکاوسکی سوویت یونین کا سب سے بڑا انقلابی شاعر۔ 1930 میں خودکشی کر لی۔

مائیکل انجلو اطالیہ کا کلاسیکی بت تراش۔

ملٹن شیکسپیئر کے بعد انگلستان کا عظیم ترین شاعر (سترہویں صدی) جس نے جاگیرداروں کے خلاف ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کے انقلابی جذبات کی ترجمانی کی۔ اس کی سب سے مشہور نظم ''فردوس گم شدہ'' ہے۔

نظامی آذربائیجان کا قومی شاعر جس نے فارسی میں شاعری کی (بارہویں صدی) نظامی کی پانچ مثنویوں کا مجموعہ خمسہ عالمگیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس کی مثنوی شیریں فرہاد کا درجہ شیکسپیئر کے 'رومیو جولیٹ' اور گوئٹے کے 'ورتھر' سے بڑا سمجھا جاتا ہے۔

نکولس روس کا زار (بادشاہ) جسے 1917 کے انقلاب کے وقت قتل کر دیا گیا۔

والگا سوویت یونین کا سب سے مشہور دریا جس کے کنارے استالن گراد آباد ہے۔

یورال سوویت یونین کے وسط میں پہاڑی سلسلہ جو یورپ اور ایشیا کو الگ کرتا ہے۔

یوکرین سوویت یونین کے مغربی علاقے کی ایک ریپبلک۔